قومیت کی تشکیل
اور
اردو زبان

جیلانی کامران

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

قومیت کی تشکیل

اور

اردو زبان

جیلانی کامران

مقتدرہ قومی زبان ۰ اسلام آباد

سلسلہ مطبوعات ۲۷۲۰

عالمی معیاری کتاب نمبر ۳-۱۱۱-۳۷۳-۹۶۹ .ISBN

○

طبع اوّل	:	۱۹۹۲ء
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	۵۵ روپے
فنی تدوین	:	ڈاکٹر انعام الحق جاوید
طابع	:	مینجر، پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان پریس، اسلام آباد
ناشر	:	ڈاکٹر جمیل جالبی (صدرنشین) مقتدرہ قومی زبان، ۱۶۰۔ ڈی (غربی) بلیوایریا، ایف ۱/۶، اسلام آباد

○

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

پروفیسر جیلانی کامران انگریزی اور اردو کے ایک نامور دانشور ہیں اور لسانی و قومی امور کے سلسلے میں اب تک گرانقدر علمی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں انہوں نے ملک، قوم اور قومیت کے حوالے سے قومی زبان اردو کے کردار کی اہمیت کو موضوع بنایا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ سوال اور اس کا جواب بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں قومیت کے علمی تصور، زبانوں کی تہذیبی اہمیت، برصغیر میں قومیت کے مسائل اور مقامی زبانوں کی صورت حال پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں اردو زبان اور ملی کردار کی ذمہ داریاں، اردو ہندی مسئلے کے سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی رویے اور ہندوستانی زبان کے تصور کو موضوع بنایا گیا ہے۔

تیسرا حصہ قومیت کی تشکیل اور مسلم قومیت کے حوالے سے لکھا گیا ہے جب کہ چوتھے حصے میں قیام پاکستان کی لسانی صورت حال اور اس کا تجزیہ، اردو کیوں اور انگریزی کیوں نہیں، ذریعۂ تعلیم انگریزی یا اردو، دفاتر کی زبان، نفاذ اردو کی تحریک اور نشاۃ ثانیہ اور قومیت کی تشکیل کے عنوانات کے تحت مقالات پیش کیے گئے ہیں۔

اس وقت ملک میں جو دوہرا نظام تعلیم رائج ہے اور انگریزی اور اردو ذریعۂ تعلیم کے حوالے سے جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے اس تناظر میں یہ کتاب ایک خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے سارے مباحث کو استدلال کے ساتھ فاضلانہ طریقے سے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ فاضل مصنف نے جہاں انگریزی زبان کی لازمی تدریس کی حمایت کرتے ہوئے اسے غیر ملکی زبان کے طور پر پڑھانے کی ضرورت پر زور دیا ہے، وہیں قومی و ملی ترقی میں قومی زبان کے کردار کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے سرکاری و نیم سرکاری دفاتر اور تعلیمی اداروں میں ذریعۂ تعلیم کے طور پر اردو کے نفاذ کو، لازمی قرار دینے پر جامع دلائل کے ساتھ زور دیا ہے۔

امید ہے کہ طلبہ و اساتذہ کے علاوہ عام لوگ بھی اس کتاب کو پڑھ کر نہ صرف اپنے لسانی ورثے اور اس کے پس منظر سے روشناس ہوں گے بلکہ موجودہ دور میں اردو کی اہمیت اور اس کے حقیقی کردار کے بارے میں بھی نئی آگہی حاصل کر سکیں گے۔

_____ ڈاکٹر جمیل جالبی

فہرست

دیباچہ

قومیت کی تشکیل میں کسی ملک یا قوم کی زبان کا کیا حصہ ہے اور اس ضمن میں زبان کیا کردار ادا کرتی ہے ایسے سوال ہیں جو قوموں کی تاریخ میں بہت کم پوچھے گئے ہیں اور ان کو ایک سوال کے طور پر غالباً شاذ و نادر ہی اٹھایا گیا ہے۔ تاہم برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں اس سوال کی اہمیت بنیادی تھی۔ وہ اس لیے کہ یہ سوال عموماً وہاں ظاہر ہوتاہے جہاں قومیت کا مسئلہ واضح نہ ہو اور جہاں سیاسی حالات اس نوعیت کے ہوں کہ قومیت کو ایک واضح صورت میں تشکیل کرنے کے لیے قوموں کو جدوجہد سے گزرنا پڑا ہو۔ برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں ان کی زبان کو کیا کردار ادا کرنا پڑا اور زبان کے حوالے سے ان کی قومی شخصیت کو کن مرحلوں سے گزرنا پڑا ان امور کا تذکرہ اس کتاب کا بنیادی موضوع ہے۔

تاہم ایسے ملکوں میں جہاں آزادی ایک طویل جدوجہد کے نتیجے میں ظاہر ہوتی ہے۔ زبان کے حوالے سے ایک مسئلہ یہ بھی رونما ہوا ہے کہ انگریزی زبان کا قومی زبان کے مقابلے میں کیا مقام ہے۔ یہ کیفیت برصغیر کے قومی مسائل میں نمایاں رہی ہے۔ انگریزی زبان ایک طویل مدت سے برصغیر کے تعلیمی نظام کا لازمی حصہ رہی ہے اور ایک لازمی مضمون کے طور پر اس کا تعلق تدریسی روایت کے ساتھ بے حد گہرا رہا ہے۔ اسی طرح یہ زبان دفاتر کی زبان بھی رہی ہے اور اعلیٰ سطح پر اس کی اہمیت اور وقار کا سبب اس کا سرکاری زبان ہونا بھی بے حد نمایاں رہا ہے۔ اس لیے قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں انگریزی کا مقام اور کردار بھی ایک ایسا سوال بن کر ظاہر ہوا ہے جو قومی زبان کے ساتھ اگرچہ متصادم نہ بھی سہی۔ قومی زبان کے بارے میں عملی نوعیت کی دشواریاں ضرور پیدا کرتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت علاقائی زبانوں کے مقام اور رشتوں کی بھی ہے جن کے ساتھ رابطہ قائم کیے بغیر کسی ملک کی لسانی وحدت مستحکم نہیں ہوسکتی۔ زیر نظر جائزے میں ان مسائل پر بھی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

عہد حاضر میں جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہےاسے ثانوی زبان اور غیر ملکی زبان کے طور پر پڑھانے کے نئے طریقے اور نئے اسالیب بروئے کار آئے ہیں جن کی مدد سے اس زبان کی تدریس موثر طور پر فہم و ادراک کا حصہ بن سکتی ہے۔

ہمارے تمدن میں لازمی انگریزی زبان کی طویل تدریسی روایت ہے لیکن اسے پڑھانے کے طریقے روایتی بنتے ہوئے اپنی کارگزاری زائل کر چکے ہیں۔ اس لیے قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں یہ سوال بھی زیرِ بحث آتے رہے ہیں کہ کیا انگریزی زبان بالکل ختم کر دی جائے ؟ یا اسے ثانوی زبان کے طور پر پڑھا جائے؟ یا اسے غیر ملکی زبان قرار دیا جائے؟ اس کتاب میں انگریزی زبان کے لازمی تدریسی مقام کی حمایت کی گئی ہے لیکن اسے غیر ملکی زبان کے طور پر پڑھانے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ کیوں کہ ایسا طریق کار اختیار کرنے سے ہی قومی زبان کے کردار کو قومی زندگی میں غیر مشروط طور پر شامل کیا جا سکتا ہے۔

جیلانی کامران

پہلا حصہ

۱- قومیت کا علمی تصور - بنیادی اجزائے ترکیبی

انسانی تاریخ نے جدید زمانے میں انسانوں کے جس تشخص کو نمایاں کیا ہے اور جس کی نسبت سے لوگوں کی عالمی پہچان ظاہر ہوتی ہے اسے قومیت کا نام دیا گیا ہے۔ قومیت عصر حاضر کے انسانوں کی شناخت بھی ہے اور ان کے کردار و اظہار کی علامت بھی۔ یورپی تاریخ میں قومیت کے رونما ہونے کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ بعض اہل فکر قرون وسطی کے اختتام کو قومیت کے ظاہر ہونے کی تاریخ قرار دیتے ہیں اور بعض کی رائے ہے کہ جدید معانی میں قومیت اٹھارہویں صدی کے آخری دنوں میں ظاہر ہوئی، جب فرانس میں انقلاب (۱۷۸۹ء) آیا تھا اور پرانی طرز کی بوربن حکومت کا خاتمہ ہوا تھا۔ ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں قومیت نو آبادیاتی تسلط کے دوران میں اور آزادی کی تحریکوں کے نتیجے میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس لیے قومیت کی اصطلاح کسی حد تک غیر یورپی دنیا کے لیے ایک نئی اصطلاح ہے اور اس کے محرکات بھی اس اعتبار سے یورپی اصطلاح سے مختلف ہیں۔ جنوبی ایشیاء کے ملکوں میں قومیت کا تصور کچھ اس لیے بھی وضاحت طلب ہے کہ اس برصغیر کے کچھ علاقوں میں قوم کا لفظ ایسے معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے جن کا قومیت کی علمی اصطلاح سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جس کے مضمرات بھی قومیت کے مفہوم سے خارج ہیں۔ ان علاقوں میں قوم کو بسااوقات پیشہ وارانہ مفہوم دیا گیا ہے اور کبھی اسے ہندوانہ ذات پات کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے قوم کا لفظ پیشے اور ذات کی طرف اشارا کرتا ہے۔ قوم کے لفظ کو علمی گروہ کے معانی میں بھی استعمال کیا گیا ہے اور صوفیاء کے تذکروں میں قوم کا لفظ اہل باطن کے گروہ کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ تاہم اگر ان معانی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لفظ "گروہ" ہی کی جانب اشارا کرتا ہے لیکن اس گروہ کا دائرہ بہت محدود ہے۔ یہ دائرہ پھیلنے سے معذور ہے اور نسب اور پیشے کی حدیں اس لفظ کے انسانی مفہوم کو وسعت پانے سے روکتی ہیں۔ قومیت کا علمی تصور ایسے مضمرات کی نفی کرتا ہے۔ غالباً دنیا کی کسی دوسری زبان میں قوم کا لفظ ذات پات اور پیشے کی پہچان نہیں ہے اور کہیں بھی اس لفظ کے انسانی مفہوم کو تلف نہیں کیا گیا جیسے جنوبی ایشیاء کے کچھ علاقوں میں ہوتا رہا ہے۔

انسان کی ابتدائی شناخت عموماً اس کا گھر اور گھرانہ رہا ہے اور یہ دونوں --- گھر اور گھرانہ --- کسی نہ کسی مقام پر آباد ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے مقام کو انسان کے جذباتی رشتوں میں مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یادداشتوں اور اوائل عمر کے باہمی رابطے ہیں۔ جو اس مقام کے جغرافیے، رسم و رواج اور انسانی تعلقات کو عزیز گردانتے ہیں۔ جذبات کا ایسا رشتہ گھر اور گھرانے کے اندرونی ذاتی دائرے کی شکل اختیار کرتا ہے اور گھر کی چار دیواری سے باہر پھیلتے دکھائی دیتا ہے۔ اس دائرے میں بچپن کا محدود علاقہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ عموماً لوگ بچپن کے اس عرصے اور اس مقام کو جذباتی وابستگی کا محور گردانتے ہیں۔ تاہم اگر اس رشتے کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ انسانی فطرت میں ایسی کوئی خوبی ضرور ہے جو کسی ایک مکان کے کمرے ہی تک محدود رہنے کی قید کو تسلیم نہیں کرتی اور نقطے سے دائرے کے محیط کی جانب پھیلنے کی زبردست خواہش کرتی ہے۔ یہ دائرہ برابر پھیلتا ہے اور گھر سے گھرانے کی طرف، گھرانے سے خاندان کی طرف اور خاندان سے قبیلے کی جانب برابر پھیلتا چلا جاتا ہے۔ دائرے کے اس پھیلتے ہوئے عمل کے ذریعے انسان ایک سے زیادہ انسانوں سے آشنا ہوتا ہے اور زندہ جذباتی رشتوں کے سلسلے سے نہ صرف واقف ہوتا ہے بلکہ ان میں شامل بھی ہوتا ہے اور یہ رشتے اس کے تعلق دوسرے انسانوں کے ساتھ قائم بھی کرتے ہیں۔ انسانی عمر کے جس زمانے کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کے دوران دائرے کی صرف یہی صورت نہیں ہوتی۔ انسان اپنے گھر کے بعد اپنے علاقے اور محلے، اپنے محل وقوع اور اپنے شہر سے بھی آشنا ہوتا ہے اور اسے اس کا آبائی مقام اور شہر بھی اسی طرح عزیز ہوتے ہیں جس طرح گھرانہ، خاندان اور قبیلہ عزیز ہوتے ہیں۔ انسانی یادداشتوں اور جذباتی وابستگی کے یہ دونوں دائرے۔ جذباتی کیفیت اور طبعی جغرافیہ۔ زمین کے ساتھ انسان کے ابتدائی رشتے کو قائم کرتے ہیں۔ یہ رشتے عموماً محبتوں کے رشتے ہوتے ہیں اور لوگ اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں کو ایسے ہی رشتوں کی بناء پر یاد کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ رشتے سیدھے سادے، فطری اور بے ساختہ ہوتے ہیں۔ انسان کی ابتدائی زندگی میں یہ رشتے خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔

تاہم اگر انسانی زندگی کے دوران رونما ہونے والے عمل کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پھیلتے ہوئے دائروں کا وسیع تر ہوتا ہوا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ جو عمل پیدائش کے لمحے سے ابتدا کرتا ہے وہ زندگی بھر برابر کار فرما رہتا ہے اور شہر سے صوبے اور ملک تک اور ملک سے باہر کی وسیع و عریض دنیا تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔ یہ عمل محض میلوں اور رقبوں ہی کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ اس پھیلتے

ہوئے منظر کے ذریعے انسان کو بے شمار انسانوں کی موجودگی کا علم بھی فراہم کرتا ہے اور اس طرح سب سے مؤثر علم یہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسرے بے شمار انسانوں کا جزو سمجھتا ہے اور صوبے اور ملک کے ادراک کی مدد سے اپنا تشخص اس ملک سے حاصل کرتا ہے جس کے کسی گوشے میں وہ مقام تھا اور ہے جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور جہاں اس نے اپنے ماں باپ کی شفقت پائی تھی اور اپنی زندگی کا بچپن گزارا تھا۔ علم اور ادراک کا یہ دائرہ جو بے شمار دوسرے انسانوں اور ایک وسیع و عریض ملک کو اپنے محیط میں شامل کرتا ہے اس اعتبار سے غورطلب ہے کہ کوئی بھی انسان نہ تو اتنے بے شمار انسانوں سے ذاتی طور پر واقف ہوتا ہے اور نہ اپنے وسیع و عریض ملک کے چپے چپے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ ابتدائی عمر کا دائرہ حواس کے علم کی بناء پر فوری آشنائی کا سبب بنتا ہے لیکن بے شمار لوگوں اور وسیع وعریض ملک کا ادراک حواس کی مدد سے ممکن نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ایک وسیع و عریض ملک میں رہتے ہوئے بے شمار لوگوں کے ساتھ رشتہ قائم کرنا حواس کے بجائے شعور کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔ گھر اور گھرانے کے ساتھ انسان کا رشتہ عام فہم اور آسان دکھائی دیتا ہے۔ لیکن قوم اور ملک کے ساتھ رشتہ عقل اور شعور کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ قوم سے وہ بے شمار لوگ مراد ہیں جو خاندان اور قبیلے کے دائرے کے پرے رہتے ہیں اور قصبے اور شہر کی سرحدوں کے پرے وسیع و عریض ملک میں آباد ہوتے ہیں۔ ان بے شمار لوگوں کے ساتھ اور وسیع و عریض ملک کے ساتھ انسان جس شعوری رشتے کو قائم کرتا ہے اسے جدید زمانے میں قومیت کہا گیا ہے۔ اس اعتبار سے قومیت کا تصور شعوری ہے جسے انسان عقل و فہم اور احساس و ادراک کے ذریعے اخذ کرتا ہے۔ اس تصور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حواس، عقل اور تخیل بیک وقت شریک ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے قومیت انسان کی زندگی کا بنیادی تصور ہے اور اس بنیادی تصور کے بغیر نہ تو بنی نوع انسان کا علم ممکن ہے اور نہ انسانیت ہی کا ادراک حاصل ہو سکتا ہے۔ قومیت کے تصور کو انسان اپنے جامع شعور کے ذریعے تخلیق کرتا ہے۔

قومیت کو بعض اہل فکر نے انسان کی شعوری ذہنی کیفیت بھی کہا ہے جو انسان کی انفرادی نفسیات اور عمرانی رشتوں سے قوت اخذ کرتی ہے۔ نطشے کا کہنا ہے کہ محبتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک محبت وہ ہے جو انسان اپنے قریب رہنے والے دوسرے انسانوں کے لیے محسوس کرتا ہے۔ یہ محبت، گھرانے اور ذاتی تعلقات کے رابطے پیدا کرتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو ان بے شمار انسانوں کے لیے محسوس کی جاتی ہے جو پاس نہیں ہوتے اور جن کے ساتھ کبھی ذاتی رابطہ پیدا

نہیں ہوتا۔ محبت کی اس دوسری قسم سے قومیت پیدا ہوتی ہے۔ قومیت کا شعور بھی گروہی شعور ہے۔ جس طرح گھرانے کے ساتھ تعلق بھی گروہی ہوتا ہے لیکن قومیت کا شعوری تعلق جامد اور ساکن نہیں ہے۔ جس طرح گھرانے، برادری اور خاندان کا باہمی تعلق ساکن، جامد اور محدود ہوتا ہے۔ قومیت کے ساتھ انسان (فرد) کے رشتے کی صورت متحرک ہے جو برابر پھیلتی ، نشوونما پاتی اور بارور ہوتی ہے۔

قومیت کے جن دو اجزا کا ذکر کیا گیا ہے ان کو "بے شمار دوسرے انسانوں"، اور "وسیع و عریض ملک" کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ جن کے ساتھ کوئی ایک شخص اپنا جامع شعوری رشتہ قائم کرتا ہے۔ تاہم یہ دونوں اجزا عمومی نوعیت کے ہیں اور "بے شمار دوسرے انسان" ان گنت آبادیوں میں مدغم ہو سکتے ہیں اور "وسیع و عریض ملک" اتنا پھیل سکتا ہے کہ براعظم بن جائے، اور پھر کرۂ ارض کی وسعت اختیار کرلے۔ علمی طور پر ایسا ہونا غیر ممکن نہیں ہے - کیوں کہ ایسے انداز فکر ہی کی مدد سے یہ بات واضح ہوسکتی ہے کہ زمین ایک ہے اور انسان بھی ایک ہے۔ ایسا علمی اور فکری انداز نظر کثرتوں سے وحدت کو اخذ کرتا ہے۔ تاہم ایسے نظریے سے وہ مقامات آشکار ہوتے ہیں جو قومیت کے شعور ہی سے رونما ہوتے ہیں۔

انسان کے ان ذہنی، نفسیاتی، عمرانی اور شعوری رشتوں کا (جن سے قومیت کا تصور پیدا ہوتا ہے) براہ راست تعلق اس خطۂ زمین کے ساتھ بھی ہے جس پر انسان بستا ہے اور جس طرح گھرانے کی چاردیواری گھر کو مکان کی شکل دیتی ہے اس خطۂ زمین کی سرحدیں جس پر کوئی شخص اور کئی دوسرے شخص بستے ہیں اس خطۂ زمین کو ملک بناتے ہیں جیسے "فادر لینڈ" ، "مادر وطن"، "قومی ملک" اور "نیشنل ہوم لینڈ" کے کئی ناموں سے پکارا گیا ہے۔ قومیت کا قومی ملک کے ساتھ ناقابل تقسیم اور ناقابل تردید رشتہ ہوتا ہے۔ ملک کے بغیر قومیت قائم نہیں رہ سکتی اور قومیت کے بغیر ملک قائم نہیں رہ سکتا لیکن تاریخ کے مطالعے سے یہ بات بھی واضح ہوتی رہی ہے کہ بسا اوقات قومیت بھی موجود ہوتی ہے اور ملک بھی موجود ہوتا ہے لیکن اقتدار اور حق حکمرانی مفقود ہوتے ہیں۔ ایسا سانحہ ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں نوآبادیاتی تسلط کے زمانے میں ہوا تھا۔ جسے آزادی سے محرومی کے ایام کہا جاتا ہے۔ ایسے زمانے میں قومیت اور ملک موجود ہوتے ہیں لیکن مملکت اور ریاست ناپید ہوتی ہے۔ مملکت کی بجائے حکمرانوں کی حکومت موجود ہوتی ہے اور محض حکومت کو مملکت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس اعتبار سے قومیت تب تک معرض وجود میں نہیں آسکتی جب

تک کہ اس کے اپنے حق حکمرانی سے ریاست آشکار نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قومیت اور خطۂ زمین (ملک) کے باہمی رشتے سے ریاست پیدا ہوتی ہے۔ ریاست اور حکومت کے مجموعے کو مملکت کا نام دیا جاتا ہے۔ مملکت کی سرحدوں کے اندر بسنے والے لوگوں کے باہمی شعور کو قومیت، ان کے باہمی انسانی وجود کو قوم، ان کے حق حکمرانی کے معروضی اظہار کو ریاست اور ان کے قائم کیے ہوئے اداروں کی کارکردگی کو حکومت کہا جاتا ہے۔

قومیت کے تصور کے ضمن میں ریاست کا عموماً بہت کم ذکر کیا گیا ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ریاست کے بغیر قومیت کا وجود ممکن نہیں ہے کیوں کہ ریاست کے بغیر قومیت اپنا شعور اور اپنے مقاصد کا اظہار نہیں کرسکتی۔ بعض اہل نظر دانشوروں نے ریاست کو سیاسی تصور بھی کہا ہے لیکن اسے محض سیاسی تصور ہی قرار دینا ریاست کے مقام اور مرتبے کی پوری وضاحت نہیں کرتا۔ فکری اعتبار سے انسان رہتا تو خطۂ زمین پر ہے لیکن اصل میں زمانے میں قیام کرتا ہے اور زمانے ہی میں مقیم ہوتا ہے جسے ماضی، حال اور مستقبل کی صورت میں پہچانا جاتا ہے۔ زندگی زمانے کے اسی سلسلے اور تسلسل کا نام ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ تسلسل انسانی اعتبار سے بری طرح متاثر ہوتا رہا ہے اور قومیں اور ان کی زندگی اس تسلسل کے ساتھ ہم آہنگ ہونے سے محروم ہوتی رہی ہیں۔ نو آبادیاتی تسلط کے دنوں میں غیر ملکی حکمران مفتوح قوموں کو تاریخ کے اس تسلسل سے بے دخل کرنے کے جرم کے مرتکب ہوتے رہے ہیں۔ مفتوح قوموں کا زمانۂ حال اور مستقبل دونوں مفتوح قوموں کے احاطۂ اختیار میں شامل نہیں تھے اور یوں وہ زندگی سے محروم تھیں۔ تاریخ سے محروم تھیں اور اختیار و اقتدار سے محروم تھیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کی قومیت کا تصور ریاست کے معروضی اظہار سے محروم تھا۔ آزادی کی تحریکوں کی کامیابی اس بات میں مضمر ہے کہ ان تحریکوں نے ریاست کو واگزار کیا اور یوں زمانے کے تسلسل اور تاریخ میں اپنا مقام پایا۔ ہیگل کا کہنا ہے[۱] کہ تاریخ میں صرف وہی لوگ اور قومیں زندہ دکھائی دیتی ہیں جنھوں نے اپنی ریاست قائم کی تھی اور جو مملکت کی بناء پر آشکار ہوئی تھیں۔ ریاست کے بغیر آزادی کا اصول ظاہر نہیں ہوسکتا تھا۔ کیوں کہ آزادی انسانی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ آزادی ریاست کے بغیر نہ تو حاصل ہوتی ہے اور نہ اپنا اظہار کر سکتی ہے۔ انسان میں جتنی بھی قابل ذکر خوبیاں ہیں وہ آزادی ہی کے ذریعے آشکار ہوتی ہیں اور ریاست کے ذریعے معروضی شکل اختیار

۱۔ ہیگل (۱۷۷۰۔ ۱۸۳۱) کا لیکچر ۔ تاریخ کا فلسفہ، برلن ۱۸۲۲۔ ۱۸۲۳

کرتی ہیں۔ ریاست کا ہونا قوم کا آزاد ہونا ہے اور جو لوگ ریاست سے محروم ہوتے ہیں وہ آزادی سے محروم ہوتے ہیں اور انسانی تاریخ میں ان کا ذکر نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے ریاست یعنی قومی ریاست، خدا کی رضا اور مشیئت کا ارضی مظہر ہے۔ ریاست کے ذریعے قوم اپنے اجتماعی شعور کا اظہار کرتی ہے اور اس اظہار کے ذریعے اپنی روح اور اپنے روحانی کردار کی شناخت کرتی ہے۔ ------ ریاست قومیت کا جوہر ہے، قومیت کی روح ہے۔ -----

قومیت کے اجزائے ترکیبی ---- قوم مملکت (لوگ/ملک حکومتی ادارے) اور ریاست میں ریاست اہم ترین اور اعلیٰ ترین جزو ہے۔ کیوں کہ اس کی مدد سے قوم اپنی روح کو آشکار کرتی ہے۔ اس حقیقت کو قومیت کی نظریاتی اساس بھی کہا جاتا ہے۔ جس کی تخلیق اور ترویج کے پیچھے کسی قوم کی تہذیبی سرگزشت، اس کی سیاسی جدوجہد، اس کا ذہنی ارتقا، اس کا دین اور مذہب اور اس کا اپنا شعور کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ ہیگل کا کہنا ہے کہ ریاست کا جواز صرف اس اصول میں ہے کہ کوئی ریاست کہاں تک انسانی تاریخ میں اپنے تاریخی کردار کی ذمہ داری نبھاتی ہے۔ تاریخی کردار ہی مملکت کو چھوٹا یا بڑا بناتا ہے اور اس کردار کا علم صرف تاریخی شعور ہی کے ذریعے ممکن ہو سکتا ہے۔ ---- اس ضمن میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تاریخی شعور ایک ذہنی ادراک ہے اور از خود انسان کو حاصل نہیں ہوتا جیسے کہ سورج کی روشنی ملتی ہے۔ اسے تعلیم و تربیت اور ذہنی ارتقا کی مسلسل کوششوں سے حاصل کیا جاتا ہے! اسی لیے جدید ریاست میں تعلیم عامہ اور نظریاتی اصولوں پر بے حد اصرار رہا ہے۔

قومیت کے تصور کے ضمن میں یہ امر قابل توجہ ہے کہ قومیت اور ریاست کا باہمی رشتہ جہاں کئی دوسری خصوصیات کو نمایاں کرتا ہے وہیں اس بات کو ظاہر بھی کرتا ہے کہ "ریاست" کا وجود اقتدار اور اقتدار کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے اور انسانی نفسیات اقتدار کے بارے میں ترغیب اور مفاد ذات کی پریشانیوں سے بہت کم محفوظ رہی ہے۔ اس لیے قوموں کی تاریخ میں تاج و تخت پر قبضے کے لیے جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ بغاوت کے علم بلند ہوتے رہے ہیں۔ سلطنت کے صوبے مرکز سے الگ ہوتے رہے ہیں اور خانہ جنگی کی صورت پیدا ہوتی رہی ہے۔ زمانہ حال میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں فوجی انقلاب اقتدار کی ترغیبات اور انسانی نفسیات ہی کے باہمی سمجھوتے کی بناء پر ظاہر ہوئے ہیں۔ ان حالات نے تیسری دنیا کا انسانی آشوب نمایاں کیا ہے۔ ---- حقیقت یہ ہے کہ قومیت کے جس تصور کا تذکرہ کیا جا رہا ہے اس کی روشنی میں "ریاست" کوئی خارجی یا

بیرونی شے نہیں ہے جسے لوگوں پر حاوی اور مسلط کیا گیا ہے۔ ریاست قومیت کے بطن سے رونما ہوتی ہے اور قومیت کا تصور لوگوں کے آزادانہ شعور سے اپنی قوت اخذ کرتا ہے۔ اس اعتبار سے "ریاست" مملکت کے لوگوں کی اجتماعی رضا کا نتیجہ ہے اور لوگوں کا مشترکہ تہذیبی شعور ان کا تاریخی اور نظریاتی ارتقا ریاست کے تصور میں اپنا وجود پاتا ہے۔ ان حالات میں اقتدار اضافی ثابت ہوتا ہے اور قوم اور ریاست کا تاریخی رول اور کردار ہی قومیت کے ان اجزائے ترکیبی کا جواز بنتا ہے۔ جس مملکت میں لوگ اقتدار کی عارضی ترغیبوں میں الجھ جاتے ہیں اور علاقائی معاملوں کو سنجیدہ مسائل سمجھتے ہیں، وہ ریاست کے تاریخی رول اور کردار کے نمایاں ہونے کے راستے بند کر دیتے ہیں اور اس طرح تاریخ کے انسانی تسلسل سے اپنی مملکت کو محروم کرنے کا سبب بنتے ہیں اور نہ وہ خود اور نہ ان کی علاقائی عداوتیں ہی زمانے کی رو داد کا حصہ بنتے ہیں۔ ایسا سانحہ قومیت کے تصور کی نفی کرتا ہے اور مملکت کے جغرافیائی اور انسانی حجم کو بسااوقات بے حد معمولی بنا دیتا ہے۔ یوں دنیا کی عالمی پہچان میں چھوٹے درجے کی قوم اور چھوٹے درجے کا ملک ظاہر ہوتے ہیں اور ایسی قوم اور ایسے ملک، اپنے اقتدار اور اپنی ریاست کے باوجود انسانی تاریخ میں کسی تاریخی رول کو ادا نہیں کرسکتے۔ ملکوں کا سائز قوموں کو مقام و منصب بہت کم عطا کرتا ہے۔ تاریخ نے قوموں کو ان کے تاریخی رول اور کردار کے سبب یاد رکھا ہے۔ قومیت کا تصور قوموں کے مقام اور منصب کا باعث ہے اور اس تصور کا جواز تاریخ کے ساتھ قوم کے شعوری رشتے سے پیدا ہوتا ہے۔

قومیت کے ضمن میں عموماً آبائی مقام (گاؤں/شہر/صوبہ) اور علاقے کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ جذباتی رشتوں اور یادداشتوں سے قطع نظر آبائی مقام کی اہمیت روایتی ہے اور ایسے دور سے تعلق رکھتی ہے جب سفر اور مسافرت آسان نہ تھے آمدورفت اور نقل و حمل کے ذرائع سست رفتار تھے اور انسان کی قوت خرید کمزور تھی۔ تعلیم کے نہ ہونے کی وجہ سے علاقوں کا جغرافیائی علم مفقود تھا۔ اس کے علاوہ ہر علاقے کا انسان روایات اور برادری اور قبیلے کا پابند تھا اور اسے اپنے ہونے کا انفرادی احساس حاصل نہ تھا۔ اس کا اپنے علاقے کے طبعی جغرافیے اور انسانی جغرافیے کے ساتھ مربوط نوعیت کا ایک ایسا تعلق تھا جو نباتات کا زمین کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہر انسان نباتات کی طرح اپنے علاقے میں پیدا ہوتا تھا، وہیں جوان ہوتا تھا اور وہیں دفن ہوتا تھا۔ اس کی نشوونما ہر اعتبار سے نباتاتی تھی۔ قبیلے کا جامد نظام اور سردار قبیلہ کے مادی مفادات اپنے علاقے کے انسان کو علاقے کا پابند کرتے ہوئے اس کی وفاداریوں کو عصبیت میں بدلتے

تھے اور اپنی جنگ و جدل کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ انسان نے اپنے آبائی مقام کے ساتھ کسی قسم کے انس کو صرف اس وقت پہلی بار محسوس کیا جب اس نے آبائی مقام کو چھوڑنے کے لیے سفر اختیار کیا اور ایسی صورت صرف اس وقت ظاہر ہوئی جب وہ قبیلے اور اس کے جامد نظام سے دور ہوا اور اسے اپنے ہونے کا احساس ہوا۔ ماحول سے دوری نے اسے آزادی فراہم کی اور آزادی نے اسے انس سے آگاہ کیا۔ آبائی مقام کو پہچاننے کے لیے بھی مسافت اور فاصلہ ضروری ہے۔ .... اس اعتبار سے آبائی مقام کے ساتھ انس بھی فطری رشتہ نہیں ہے! علاقے کے ساتھ محبت کا رشتہ محض ایک روایتی شے ہے اور ایک ایسے رویے سے تعلق رکھتا ہے جب لوگ قدامت پسند تھے اور سفر کو کسی طرح مفید نہیں سمجھتے تھے۔

عہد حاضر میں جہاں اہل مغرب نے نئے ملک اور نئی بستیاں آباد کی ہیں اور نئے براعظم (امریکہ / آسٹریلیا) دریافت کیے ہیں، وہیں زمین کے ساتھ انسان کا جامد رشتہ بھی زوال پذیر ہوا ہے۔ نباتاتی نشو و نما کا قدیم رویہ متروک گردانا گیا ہے اور سفر اور مہم جوئی کو انسان کی کردار سازی میں اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ اس لیے جو شخص اپنے گاؤں کی مٹی کا والہانہ ذکر کرتا ہے اسے رومان پسند اور پرانے خیال کا آدمی سمجھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے علاقائی رویے قومیت کے تصور کی موجودگی میں متروک اور غیر سائنسی قرار دیےگئے ہیں اور قومیت کی بار آوری کے لیے علاقائی رویوں کو ثانوی مقام دیا گیا ہے۔ ..... یہ امر اس لیے بھی قابل غور ہے کہ قومیت امکانات کو نمایاں کرتی ہے اور آبائی مقام، علاقے کے رشتے کو اس سلسلے میں بسااوقات رکاوٹ بنا دیتا ہے۔

گزشتہ چالیس برسوں کے دوران انسانی تاریخ میں ایک اور عنصر بھی داخل ہوا ہے۔ جس کا تعلق بڑے پیمانے پر انسانوں کی نقل مکانی سے ہے۔ اس عرصے میں لاکھوں انسانوں نے ہجرت کی ہے اور اپنے آبائی مقام کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا ہے۔ ہجرت کا یہ انسانی منظر برصغیر میں آزادی کی تحریکوں کی کامیابی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے اور لوگ آبائی مقام کے انس کو چھوڑتے ہوئے قومیت کے تصور کی جانب سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسا منظر تاریخ کی ضرورتوں سے بھی پیدا ہوا ہے۔ یہ کیفیت صرف برصغیر کے انسانی منظر تک ہی محدود نہیں ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی میں بھی ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ امریکہ کی آبادکاری بھی یورپی انسانوں کے اپنے آبائی مقام سے ہجرت کے سبب ممکن ہوئی تھی۔ انگریزی ادب کے ناول نگار اور شاعر بھی ایسے تجربے سے گزرتے رہے ہیں۔ جوزف کونرڈ نے پولینڈ کو چھوڑا اور انگلستان کو اپنا قومی وطن بنایا۔ ٹی ایس ایلیٹ نے امریکہ سے ہجرت کی اور لندن شہر کو اپنی قومیت کے لیے منتخب کیا۔

ایسی ہی صورت ہمارے عہد کے لکھنے والوں کی بھی ہے۔ اس صورتحال کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب ہے کہ ہجرت کے تجربے نے قومیت کے تصور کو نمایاں کیا ہے اور اس طرح علاقے کی محبت کو قومیت کے امکانات اور قومیت کی بارآوری کی خاطر ترک کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کیفیت کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ عہد حاضر کا انسان قومیت کے تصور کی دنیا کا باشندہ ہے اور اس دنیا کے جذباتی رشتوں سے بہت دور نکل آیا ہے جو اسے نباتاتی وجود دیتے تھے اور علاقے کے جامد ماحول میں مقیم رکھتے تھے۔

قومیت کے اجزائے ترکیبی میں "ریاست" کی حیثیت اور اہمیت مرکزی ہے۔ ماضی میں "ریاست" کا تصور کچھ اس لیے مفقود تھا کہ مختلف حکمراں مختلف ملکوں پر حکومت کرتے تھے اور ان کا اپنے لوگوں کے ساتھ رشتہ عموماً بادشاہ اور رعایا کا ہوا کرتا تھا۔ حکومت حکمرانوں کی جانب سے رعایا پر مسلط ہوتی تھی۔ ایسی ہی کیفیت ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں اور بعد ازاں برٹش انڈین ایمپائر کے دور میں دکھائی دیتی ہے۔ ایسے حکومتی انتظامات میں "ریاست" ناپید ہوتی ہے۔ تاہم آزادی کی تحریکوں کے کامیاب ہونے کے بعد اور ایسے ملکوں میں جہاں بادشاہ عوام کے اعتماد کے حامل ہیں۔ ریاست کا تصور ظاہرہوا ہے۔ اس اعتبار سے ریاست کا تصور قومیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے اور قومیت کا تصور لوگوں کے باہمی شعوری رشتے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ ریاست لوگوں کے جمہوری استحقاق سے رونما ہوتی ہے اور جب تک اس کا (ریاست کا) رشتہ لوگوں کے ساتھ قائم اور برقرار رہتا ہے قومیت کے نشوونما کی توقع رہتی ہے لیکن جب کسی سانحے کے نتیجے میں ریاست کا تعلق لوگوں سے منقطع ہوتا ہے اور حکومت اوپر سے نیچے کی طرف اپنا نفوذ کرتی ہے اس وقت قومیت کی نشوونما مسدود ہو جاتی ہے اور قوموں کا تاریخی رول اور کردار مجروح ہوتا ہے۔ قوموں کی ترقی رک جاتی ہے اور انسانوں کے تخلیقی سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں! اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ قومیت کے اجزائے ترکیبی میں جمہوریت ایک نہایت ضروری عنصر ہے جس کی موجودگی قومیت کے تصور کی افزائش کے لیے بے حد لازمی ہے۔

قومیت کے جن بنیادی اجزائے ترکیبی کا ذکر کیا گیا ہے ان سے یہ امر واضح ہے کہ عہد حاضر میں ملکوں کے جغرافیے کو ایک طے شدہ صداقت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے اور علاقے کے ساتھ نباتاتی رشتے کو قومیت کے تخلیقی رشتے میں بدلا گیا ہے۔ اس اعتبار سے عہد حاضر کی دنیا زمانے اور تاریخ کی دنیا میں داخل ہوئی ہے اور زمانے کے نقشے میں اپنے وجود کو پانے کی سعی کر رہی ہے۔ ایسی

کیفیت قوموں کے تاریخی رول اور کردار کی نشاندہی کرتی ہے۔ کیوں کہ ایسے تاریخی کردار ہی کی بدولت قومیں اپنا وقار حاصل کر سکتی ہیں، اپنے ملکوں اور اپنے لوگوں کے لیے فلاح کا سبب بن سکتی ہیں، اور بنی نوع انسان کی روداد میں بہتر زمانے اور بہتر دنیا کے قیام کی توقع کو پورا کر سکتی ہیں۔ اہل فکر کی نگاہ میں یہی انسان کی ذمہ داری ہے اور یہی روئے زمین پر انسان کا اصل مقدر ہے۔

۲- زبانوں کی تہذیبی اہمیت

تاریخ کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ جہاں قومیت کی تشکیل قومیت کی نشوونما، اور قومی شعور کا ادراک مرحلہ وار ہوتا رہا ہے وہیں اس عمل کے ساتھ ساتھ قوموں کی زبانیں بھی بتدریج نشوونما اور ارتقا کے مراحل سے گزرتی رہی ہیں۔ زبانوں کے بغیر قوموں کی پہچان ممکن نہیں ہوتی اور قوموں کے بغیر زبانیں ناپید ہو جاتی ہیں۔ انسانی تاریخ کی یہ ایک بنیادی حقیقت ہے۔ عہد حاضر کی انسانی تاریخ کے دوران، جو کم وبیش دو ہزار برسوں کا احاطہ کرتی ہے، کچھ قدیم زبانیں اپنے بولنے والوں کے ساتھ ناپید ہوئی ہیں اور اسی عرصےکے دوران یورپ کی جدید زبانیں ظاہر ہوئی ہیں۔ ایشیاء اور افریقہ میں نئی قومیں ظاہر ہوئی ہیں اور ان کے ساتھ نئی زبانیں بھی رونما ہوئی ہیں۔ ان دوہزار برسوں کا لسانی نقشہ قدیم دنیا کے لسانی نقشے سے مختلف ہے اور اس اعتبار سے یہ نقشہ اپنی اپنی قوموں کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور اپنے لسانی عمل کے ذریعے قوموں کی تہذیبی سرگزشت کو بیان بھی کرتا ہے۔ زبانوں کے حوالے سے قوموں اور ان زبانوں کے بولنے والوں کے تہذیبی مقام کا علم بھی دستیاب ہوتا ہے۔

اگر زبانوں کے قدیم لسانی نقشے کا سرسری سا جائزہ لیا جائے تو قدیم مصر کی قبطی زبان، قدیم یونان کی یونانی، قدیم روما کی لاطینی زبان اور برصغیر کے آریاؤں کی سنسکرت کا علم ہوتا ہے۔ ان زبانوں کے بطن سے کسی حد تک جدید دنیا کی زبانیں پیدا ہوئی ہیں لیکن یہ زبانیں ناپید ہو چکی ہیں اور سوائے آثار قدیمہ کے ماہرین کے ان زبانوں میں زندہ لوگوں کے لیے بہت کم دلچسپی باقی رہی ہے تاہم اگر ان زبانوں کے مافیہ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان زبانوں میں انسانی علم و حکمت کا ایک مخصوص ارتقائی مقام محفوظ ہے۔ جہاں تک اس زمانے کے انسان کا ذہن پہنچ پایا تھا اور جہاں تک پہنچنے کے لیے اس زمانے کے انسانی ذہن کو فہم و خرد کے کئی مرحلوں سے گزرنا پڑا تھا، اس اعتبار سے یہ زبانیں اس زمانے کی تہذیبی روداد کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ان زبانوں کی مدد سے اس عہد کے تہذیبی شعور کا علم ہوتا ہے۔ یہاں تک تو یہ سارا منظر ماضی سے تعلق رکھتا ہے۔ تاہم اس منظر کو دیکھتے ہوئے یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ زبانیں کس لیے ناپید ہو جاتی ہیں ؟ اس سوال کو کئی طرح سے زیر بحث لایا جا سکتا ہے لیکن اس کا ایک جواب قابل غور ہے کہ جب زبانوں کی ذہنی طور پر آبیاری رک جاتی ہے تو زبانیں زندگی کے تسلسل سے کٹ جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ ناپید ہو

جاتی ہیں اور ان کا شمار زندہ زبانوں میں نہیں ہوتا۔ جب تک زبان بولنے والے لوگوں کا ذہنی فکری اور محسوساتی عمل قائم رہتا ہے زبانیں قائم رہتی ہیں۔ جب تک قوموں کی تہذیبی نشوونما کا سلسلہ جاری رہتا ہے ان کی زبانوں کی افادیت بھی برابر قائم رہتی ہے۔ تہذیب اور تہذیبی عمل کے کسی خاص مقام پر رک جانے سے زبانوں کی زندگی پر بھی اثر پڑتا ہے اور زبانیں متروک اور مردہ زبانوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ زبانوں کا براہ راست رشتہ قوموں کے تہذیبی مقام کے ساتھ ہے اور زبانوں کا مقام ان کی اپنی تہذیبی اہمیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

زبان نہ صرف بول چال کے لفظوں کا مجموعہ ہے اور بول چال کے کام آتی ہے، زبان کی اپنی اہمیت اس امر میں بھی ہے کہ اسے تحریر کی ذمہ داریوں کو نبھانے میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے؟ کسی زبان کے تہذیبی مقام کو پرکھنے کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس زبان نے اپنے الفاظ سے کیا کام لیا ہے؟ یہ جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ الفاظ کے دائرۂ استعمال سے اس زبان کی وسعت کا علم ہوتا ہے اور اس طرح ان لوگوں کے علمی، فکری اور محسوساتی مقامات کا اندازہ بھی ممکن ہوسکتا ہے جو اس زبان کو بولتے ہیں۔ ایسا رشتہ نہ صرف زبانوں کی عظمت کی خبر دیتا ہے بلکہ لوگوں کے حوالے سے ان قوموں کی عظمت کی نشاندہی بھی کرتا ہے جن کا تعلق ان زبانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

تاہم اگر مختلف زبانوں کا ایک ساتھ جائزہ لیا جائے تو احساس ہوگا کہ یہ سب زبانیں ایک ہی مقام کی حامل نہیں ہیں۔ اپنی ترقی اور نشوونما کے مطابق ان کے درجے بھی مختلف ہیں۔ اگر اسی طرح زمانۂ حال کی بین الاقوامی زبانوں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ زبانیں گزشتہ چار پانچ سو برسوں کے دوران مختلف ارتقائی مقامات پر تھیں۔ پندرہویں صدی میں انگریزی زبان کا وہ مقام نہ تھا جو سترہویں صدی میں اسے حاصل ہوا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں جرمن زبان کا وہ مقام نہ تھا جو اسی صدی میں انگریزی زبان کو میسر تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں آئرلینڈ کی زبان صرف لوک ورثے کی زبان تھی اور اسے لوک ورثے کے سوا کسی دوسرے میدان میں آزمایا نہیں گیا تھا۔ یہی کیفیت تیرہویں صدی میں اطالوی زبان کی تھی اور اسی صدی کے دوران فرانسیسی کا مقام بھی اطالوی سے مختلف نہ تھا۔ ان تاریخی حوالوں سے یہ نمایاں ہے کہ یہ سب زبانیں مختلف زمانوں میں اپنی اپنی قوموں کے فکری ارتقا کے ساتھ ظاہر ہوئی ہیں۔ ادبیات کی تاریخ میں یہ سب زبانیں کسی نہ کسی زمانے میں اس مقام پر تھیں جسے "ورنیکلر" کہا جاتا ہے۔ ان کی حیثیت مقامی بولیوں کی تھی اور ان کی دنیا عام فہم

جذبات کی دنیا تھی لیکن گزشتہ سات آٹھ سو برس کے دوران یہ مقامی بولیاں، قومی زبانوں کا مقام حاصل کر گئیں اور قومی زبان بننے کے بعد ان کے ذریعے علم اور سائنس کی نشرو اشاعت ہوئی اور عہد حاضر میں ان کا منصب بین الاقوامی زبانوں کا ہے جن کے ذریعے مغربی تہذیب کے علمی و فکری سرچشموں کا ادراک ہوتا ہے۔ ...... تاہم یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ آئرلینڈ کی زبان کا فی زمانہ درجہ کیا ہے؟ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں فرانسیسی کے مقابلے میں روسی زبان کا مقام ورنیکلر کا تھا اور ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ کے اعلیٰ طبقے اور حلقے فرانسیسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔

قوموں کی عمرانی تاریخ میں زبان اور اشیاء اور زبان اور قلبی جذبات کے باہمی رشتوں سےمقامی بولی پیدا ہوتی ہے۔ جسے معاشرے کے مختلف ارتقائی مدارج کے حوالے سے مختلف نام دیے گئے ہیں۔ اسی مقامی بولی کے بطن سے گھرانے کی زبان (مادری زبان) ظہور پذیر ہوتی ہے اور اسی زبان کو بسااوقات لوک زبان اور علاقائی زبان اور ورنیکلر کہا گیا ہے۔ یہ نام عمرانی اعتبار سے مختلف گروہوں کی مقامی بولیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مختلف زبانوں کی لسانی تاریخ کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقامی زبان کی صورت کئی ایک زبانوں میں مختلف رہی ہے۔ اینگلو سیکسن قوم (جو انگریزوں کی نسلی قومیت بھی ہے) کی قدیم زبان، اینگلو سیکسن جسے اولڈ انگلش بھی کہا جاتا ہے ایک بالکل مختلف قسم کے لوک کلچر کو نمایاں کرتی ہے۔ تاہم اس زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لوک گیت دکھائی نہیں دیتے اور اس زبان کی لفظیات میں "محبوب"[1] کا لفظ مفقود ہے۔ بلبل بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یہ زبان سیدھے سادے رشتوں کو بیان کرتی ہے اور قبائلی لڑائیوں کو بیان کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔ اینگلو سیکسن کے مقابلے میں برطانیہ کی دوسری علاقائی زبانوں مثلاً سکاٹش اور ویلش میں ایک الگ لوک کلچر نظر آتا ہے۔ قرون وسطیٰ کے دوران یعنی گیارہویں اور پندرہویں صدی کے درمیانی عرصے میں اینگلو سیکسن زبان کی شعری استعداد اور صلاحیت میں اضافے ہوئے، اس کی تعداد الفاظ بڑھی اور اعلیٰ نوع کی شاعری اور سیدھی سادی نثر ظاہر ہوئی۔ اس زمانے میں نثر یا تو داستانوں اور قصوں کے لیے استعمال ہوئی، یا مذہبی تعلیمات اور خطبات کی نشر و اشاعت کرتی رہی۔ پندرہویں صدی کی زبان ایک طرف شاعری اور داستانوں کی زبان تھی اور دوسری طرف ہر علاقے کی اپنی زبان تھی جو صرف اپنے ہی انسانی اور طبعی خطے میں سمجھی جاتی

1. BELOVED/LOVER

تھی۔ یہ مقامی بولیاں جو انگریزی زبان ہی کی مختلف شکلیں تھیں اپنے لہجے الفاظ اور تلفظ کی بناء پر ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی تھیں۔ یہ صورت صرف انگلستان ہی میں نہیں تھی، یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی مقامی بولیوں کا یہی حال تھا۔ اس زمانے کے مسیحی عالم ایسی تفاوتوں اور بولیوں کی ان کثرتوں کو انسان کے آبائی گناہ کا نتیجہ تصور کرتے تھے۔ ان کی نظر میں یہ سارا تفاوت شیطانی تھا تاکہ لوگ فساد کرتے رہیں اور ان میں کسی طرح بھی اتحاد پیدا نہ ہو۔

تاہم مقامی بولیوں کا افتراق اور ان کی کثرت جہاں علاقوں کے درمیان فاصلے، اجنبی پن اور نفسیاتی بُعد کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہیں یہ بولیاں، انسان اور زبان کے ایک بنیادی رشتے کو ظاہر کرتی ہیں جس کا انسان کے تہذیبی اور عمرانی ارتقا سے گہرا تعلق ہے۔ اس رشتے سے بالعموم لوک شاعری پیدا ہوئی ہے۔ لوک گیت اور لوک دانائی کے بیشتر اظہار اسی بنیادی رشتے کا نتیجہ ہیں۔ تاہم اگر اس زبان کا لسانی اور موضوع کے اعتبار سے تجزیہ کیا جائے تو ایک یہ بات ظاہر ہوگی کہ زبان سیدھے سادے موضوع کو سیدھے سادے اسلوب کے ذریعے بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شادی بیاہ کے گیت، وچھوڑے اور فراق کے گیت، موسموں کے لحاظ سے دیہاتی زندگی کے گیت، مذہبی موضوعات پر سیدھے سادے انداز میں لکھی ہوئی نظمیں، معرکہ آرائیوں کی یاد تازہ کرنے والے گیت اور نظمیں، خوشیوں، غموں اور محبتوں کے صاف ستھرے گیت اور زندگی کے بارے میں عام فہم کہاوتیں، کہانیاں اور مناظر فطرت کی ناقابل فہم وسعتوں میں چھپے ہوئے خوف، جو ظالم انسانوں، جنوں اور چڑیلوں کے روپ میں اکثر نمودار ہوتے ہیں اور اسی سطح کے مطابق متعدد دوسری چیزیں جو عام آدمی کا تعلق اس کے ماحول کے ساتھ قائم کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ انسان کے اس بنیادی رشتے سے رونما ہوتا ہے جو انسان، اشیا، کے ساتھ، اپنے ماحول اور اپنی قلبی کیفیات کے ساتھ قائم کرتا ہے۔ مقامی بولیوں کا بیشتر ادب لوک ورثے ہی کو ظاہر کرتا ہے اور لوک ورثے ہی کے تہذیبی اور عمرانی مقام کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس ورثے میں زبان کی ہیئت عموماً صاف اور عام فہم ہوتی ہے جسے ماحول سے حاصل کی ہوئی تشبیہات اور استعارے بسا اوقات فنی حسن فراہم کرتے ہیں۔ لوک شاعری کے اعلی نمونے اپنے ماحول کے کلچر سے علامات بھی اخذ کرتے ہیں اور طبعی جغرافیہ بھی بسااوقات قلبی کیفیت کا مظہر بنتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے مقامی بولیوں کا تعلق ایک ایسے زمانے سے ساتھ رہا ہے جب یا تو انسانی ذہن نے ابھی علوم کے ساتھ آشنائی حاصل نہیں کی تھی یا ابھی

علوم کے مضامین انسانی زندگی کے دائرہ کار سے پوری طرح متعارف نہیں ہوئے تھے۔ تاہم اگر ان دونوں باتوں کو عمرانی اور تہذیبی ارتقا کا معیار تصور کیا جائے تو مقامی بولیاں ان دونوں مقامات کے درمیان نشوونما پاتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ قوموں کے عمرانی سفر کے دوران تحصیل علم اور علوم کی ترویج کے لیے مدرسے بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے مقامی بولیوں کے حوالے سے مدرسوں کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے مدرسے یورپ میں بھی قائم تھے۔ ایشیا، اور افریقہ میں بھی ایسے مدرسوں کی موجودگی برابر دکھائی دیتی ہے۔ ...... برصغیر کے اسلامی دور میں بھی ان مدرسوں کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ مضامین اور موضوعات کے اعتبار سے یہ مدرسے مذہب، الہیات، تصوف، قانون، طب، علم نجوم، منطق شاعری اور اخلاقیات کی تدریس کے مراکز تھے۔ مقامی بولیوں کے ذہنی رشتوں اور ان کے لسانی مزاج کا اس علمی اور تعلیمی پس منظر سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے مقامی بولیوں کا لوک ورثہ اور لوک ادب انسان کے عروجی سفر کو بیان کرتا ہے۔ اس کی روحانی زندگی کو اہم گردانتا ہے اور مذہبی صداقتوں کے سیاق و سباق میں انسان کی تربیت کرتا ہے۔ انسان کے عمرانی ارتقا کا یہ زمانہ تخیلات کا زمانہ بھی ہے لیکن انسان کا شعور اپنے ابتدائی مراحل ہی سے گزرتا دکھائی دیتا ہے۔ عمرانیات کے اساتذہ ایسے انسانی شعور کو قوموں کے آغاز بلوغت کا مقام قرار دیتے ہیں۔ اس مقام کے بعد قومی زبانوں کا دور اپنی ابتدا کرتا ہے۔

اگر زبانوں کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبانوں ہی کی تربیت بھی زبانوں ہی کی مرہون منت رہی ہے اور زبانوں کا عمرانی تسلسل بنی نوع انسان کے تسلسل کے ساتھ ساتھ عمل پذیر رہا ہے۔ یورپ کی جدید زبانوں کی تربیت لاطینی نے کی تھی اور عالم اسلام میں ایسا کردار عربی اور فارسی نے انجام دیا تھا۔ تاہم ایسی تربیت کا عمل دخل دو سطحوں پر دکھائی دیتا ہے۔ ایک سطح زبان کی ساخت اور مزاج کی ہے اور دوسری مضامین کے بارے میں صلاحیت اظہار کی۔ اس دوہرے عمل سے ذہنوں کی نشوونما ممکن ہوتی ہے۔ زبانوں کے اس منظر میں ایک قابل ذکر خصوصیت زبانوں کے باہمی رابطے اور قوموں کے عمل اور رد عمل سے آشکار ہوتی ہے۔ آمد اسلام کے ابتدائی زمانے میں یونانی اور سریانی زبانوں کا تعلق عربی سے ہوا اور ترجمے کے ذریعے عربی زبان کی وسعت عمل میں آئی۔ کچھ عرصہ بعد ایسا ہی عمل فارسی زبان میں ممکن ہوا۔ قرون وسطی کے دوران عربی علوم کو لاطینی میں منتقل کیا گیا اور مغربی یورپ کی پہلی نشاۃ ثانیہ ظاہر ہوئی جسے تاریخ نگار گیارہویں صدی اور بارہویں صدی سے منسوب کرتے

ہیں۔ تاہم ترکوں کی فتح قسطنطنیہ(۱۴۵۲ء) کے بعد مغربی یورپ میں یونانی اور رومی علوم کے احیاء نے مغربی یورپ کے علمی حلقوں میں ایک منفرد اور تاریخ ساز انقلاب پیدا کیا۔ اس انقلاب اور نشاۃ ثانیہ کا مقامی زبانوں کے ارتقا کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

یورپی نشاۃ ثانیہ بازاروں میں وارد نہیں ہوئی تھی اور نہ عام آدمی ہی اس ذہنی انقلاب سے فوری طور پر متاثر ہوا تھا۔ یہ تحریک احیائے علوم کی تحریک تھی اور علوم سے قدیم یونانی اور رومی علمی ورثہ مراد تھا۔ اس لیے نشاۃ ثانیہ کے مراکز اسکول اور یونیورسٹیوں میں قائم ہوئے۔ بولونا، پیرس، آکسفورڈ اور کیمبرج، ہائیڈل برگ، سینٹ اینڈریوز اور ایڈنبرا کی یونیورسٹیاں نئے علوم کی تدریس اور ترویج کا سبب بنیں۔ رفتہ رفتہ نئے علوم کی تدریس عمومی تعلیم و تدریس بن گئی اور قدیم مدرسوں کی تعلیم جو قرون وسطیٰ کے دوران مقبول تھی بے دخل ہوتی گئی۔ بادی النظر میں روایتی اور قدیم علوم کی تدریس اور تعلیم، نظام تعلیم کا مرکزی رجحان نہ رہے لیکن جو بات نمایاں ہوئی یہ تھی کہ قدیم علوم کے دیئے ہوئے رویے، مضامین اور زبان کے آداب لوک روایت میں شامل ہوگئے اور یوں بڑے بڑے شہروں سے دور قصبوں اور دیہاتوں میں مقامی زبان پر قدیم علوم اور رویوں کے نقش برابر ثبت رہے۔ اس بڑے پس منظر میں انگریزی زبان کا منصب بدلا اور وہ مقامی زبان کی بجائے قومی زبان بن گئی اور قومی زبان بنتے ہی اس پر علمی زبان بننے کی ذمہ داریاں بھی عائد ہوئیں۔ اس اعتبار سے سترہویں صدی کے بعد انگریزی زبان کی ذمہ داریوں کو تحصیل علم اور نشرو اشاعت علوم کی ذمہ داریوں سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یورپ کی دوسری زبانیں بھی کم و بیش ایسے ہی زمانے میں ظاہر ہوئیں اور یورپ کی جدید زبانوں کے علمی دور کا آغاز ہوا کچھ ایسے ہی منظر کو برصغیر کی مقامی زبانوں کے سلسلے میں بھی پہچانا جا سکتا ہے۔

برصغیر کا یورپ اور خصوصاً اہل برطانیہ کے ساتھ تعلق کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے اور تاریخ کا طالب علم ان شواہد سے بخوبی واقف بھی ہے جو برصغیر کی عمرانی اور سیاسی روداد مرتب کرتے ہیں۔ تاہم زبانوں کی تاریخ کے ضمن میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ انگریزی زبان کی تدریس کے مراکز ابتدا میں برصغیر کے مشرقی علاقوں میں قائم ہوئے اور دوسری یہ کہ جس مقامی زبان کا سب سے پہلے انگریزی زبان کے ساتھ رشتہ پیدا ہوا وہ اردو زبان تھی۔ ۱۷۴۵ء میں عیسائی مشنریوں نے بائبل کا جس رسم الخط اور زبان میں ترجمہ کیا وہ اردو زبان تھی اور اردو زبان ہی کا فارسی رسم الخط تھا۔ کلکتے کے فورٹ ولیم

کالج کی خدمات کو بھی اس سلسلے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اسی زمانے میں جب انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا، سائنٹفک سوسائٹیاں بھی قائم ہوئیں اور تاریخ، جغرافیے، ریاضی، اقلیدس اور الجبرے کی کتابیں بھی اردو میں شائع ہوئیں۔ اردو صحافت کا آغاز بھی اسی زمانے ہی میں ہوا اور کمپنی کی مقبوضات اور بعد ازاں برٹش قلمرو میں اردو زبان کے جرائد اور اخبارات شائع ہوئے۔ چھاپے خانے بھی اسی دور میں لگائے گئے اور اردو زبان کی کتابیں بڑی تعداد میں چھپنے لگیں۔ یہ دور اس لحاظ سے بھی قابل غور ہے کہ اسی میں مذہبی مناظرے شدت پکڑ گئے۔ ابتدا میں عیسائی مشنریوں نے اردو زبان میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور مناظرے کے رنگ میں مذہبی حقانیت کا پرچار کیا۔ اس کے کچھ ہی سال بعد آریہ سماج نے مناظرے کو اپنایا اور مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو چیلنج کرنے کی ناخوشگوار رسم اختیار کی۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ اس کے اجلاس کی کارروائی اور فی خطابت، قرار دادیں اور بعد ازاں دستوری اور سیاسی عمل کے دوران، رائے عامہ کی تشکیل اور ضرورت ایسے بڑے بڑے اور لازمی محرکات تھے جن کے لیے اردو زبان کو استعمال کیا گیا۔ ۱۸۴۶ء کے بعد جب سکھوں کی شکست کے نتیجے میں پنجاب میں انگریزی راج قائم ہوا تو پنجاب کے مسلمانوں نے بھی اردو زبان ہی کو اپنی زبان کے طور پر اپنایا تاکہ برصغیر کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ان کا رشتہ اور تعلق برابر برقرار رہے۔ اردو زبان کے مقام کی اہمیت اس امر میں بھی دکھائی دیتی ہے کہ ایسی ریاستوں میں جن کے حکمران غیر مسلم تھے سرکار کے گزٹ بھی اردو ہی میں شائع ہوتے تھے۔ ریاست سرمور، کشمیر اور پونچھ کے سرکاری گزٹ اردو میں چھپتے تھے اور ذریعۂ تعلیم بھی اردو تھا۔ ریاست حیدرآباد کی خدمات کو اس ضمن میں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس منظر کی موجودگی میں اور جہاں تک برصغیر کے مسلمانوں کی عمرانی اور تہذیبی تاریخ کا تعلق ہے یہ امر نمایاں ہے کہ جس زبان نے دوسری مقامی زبانوں کے مقابلے میں نئے حالات کا چیلنج قبول کیا اور جو اسلامیان برصغیر کے باہمی رابطوں کی زبان بنی وہ اردو زبان ہی تھی۔ حالات کے اس متحرک اور صبر آزما سلسلے نے اردو زبان کی صلاحیت اور استعداد میں بے حد اضافہ کیا۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ کا حجم بڑھ گیا اور نئے نئے تصورات کو قبول کرنے اور بیان کرنے کی صلاحیت برابر ترقی کرتی گئی۔ اس زبان کو مناظروں، سائنسی معلومات، درسی اور علمی ذمہ داریوں، صحافتی ضرورتوں اور تشکیل قومیت کے لیے استعمال کیا گیا۔ ...... یوں اس طرح اردو زبان مقامی بولیوں کے محیط سے باہر آ گئی اور

جدید دنیا کے لسانی ماحول کا حصہ بن گئی۔ اس سلسلے میں دربار مغلیہ کے ساتھ اس زبان کے رشتے کو نظر میں رکھنا ضروری ہے تاہم جس ماحول کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے دوران اردو زبان قلعۂ معلّی کی زبان بھی تھی۔ مقامی زبانوں کے مقابلے میں یہ منصب صرف اردو زبان ہی کو حاصل ہے کہ قرآن کریم کاپہلا ترجمہ اسی زبان میں ہوا تھا۔

برطانوی زمانے کی عمرانی اور تہذیبی صورت حال نے جہاں صوبجات کے بڑے بڑے شہروں میں نئے علوم کو رائج کیا وہیں اس عمل کے نتیجے میں اور اسلامیان برصغیر کی اپنی مرضی سے اردو زبان کا عروج ہوا۔ یہ بات اس لیے بھی قابل توجہ ہے کہ مغربی تہذیب کا اثر بڑے شہروں کے ذریعے اور مغربی تعلیم کی مدد سے برصغیر کے شعور میں شامل ہوا تھا۔ اس اثر کے تحت تعلیم یافتہ طبقے نے اردو کو اس نئے شعور اور نئے طرز احساس کے اظہار کے لیے استعمال کیا اور اردو ادبی اور علمی زبان بنتی گئی اور اس کا مزاج علم و فکر کی نئی فضا کو قبول کرنے کے قابل ہوا۔ اس خصوصیت نے اردو زبان کو وہ مرتبہ دیا ہے جس کے سبب عہد حاضر میں اردو ایک نو عمر زبان کی حیثیت میں بین الاقوامی زبانوں کے حلقے میں شامل ہوتی ہے۔ .... تاہم بڑے بڑے شہروں سے دور اور چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں کی عمرانی اور تہذیبی صورت حال بدستور روایتی رہی اور مقامی بولیوں اور زبانوں کا سلسلہ برابر موجود رہا۔ اس طرح ایک ہی وقت میں زبان کے بارے میں دو معیار رونما ہوئے۔ مقامی بولیوں اور زبانوں کی پہچان کے لیے ایک معیار کار آمد ہوا اور اردو زبان کے مقام و منصب کے لیے دوسرے معیار کو قبول کیا گیا۔ لیکن یہ دونوں معیار ایک ہی سوال کو نمایاں کرتے تھے۔ کہ موجودہ زمانے میں کون سی زبان ایسی ہے جو نئے زمانے کے تقاضے پورا کرنے کے قابل ہے؟ اس سوال کے جواب میں اسلامیان برصغیر کا لسانی انتخاب مضمر تھا۔ اس لیے جب ۱۹۳۱ء کی مردم شماری ہوئی اور مسلمانوں کے لیے آزاد وطن کے مطالبے کے سلسلے میں فیصلہ کن مقام آ گیا اس وقت قائد اعظم نے ہدایت کی کہ تمام مسلمان اپنی مادری زبان کے ضمن میں اردو زبان لکھیں، کیوں کہ قوم اسے کہتے ہیں جس کی ایک زبان ہوتی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں برصغیر کے طول و عرض میں مسلمانوں نے اردو کے حق میں اپنا فیصلہ دیا اور اسے اپنے قومی تشخص کا مظہر قرار دیا۔ اس امر کی روشنی میں ۱۹۳۱ء کی مردم شماری اور زبان کے خانے میں اردو کا اندراج قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں تاریخی اقدامات ہیں۔

قوموں کی تاریخ ہمیشہ مقامی بولیوں اور مقامی زبانوں کی تاریخ رہی ہے لیکن مقامی بولیوں اور زبانوں کے حلقے میں سے عموماً ایک زبان سامنے آتی رہی

ہے اور اس زبان کے ذریعے قوموں کی پہچان ہوئی ہے تاہم کینیڈا ایک ایسی مثال ہے جہاں دو زبانوں کی موجودگی دکھائی دیتی ہے لیکن کینیڈا ایک ایسا ملک ہے جسے دو مختلف یورپی قوموں (انگریزوں اور فرانسیسیوں) نے آباد کیا تھا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ قدرتی ملک (جیسے یورپ کے بے شمار ممالک ہیں) اور ایک ایسے ملک میں جسے آباد کاروں نے مسخر کیا ہو، بڑا فرق ہے۔ ...... بہرکیف، اگر یورپی قوموں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو احساس ہوگا کہ جن ملکوں نے قومیت حاصل کی ہے انہوں نے مقامی بولیوں اور زبانوں میں سے کسی ایک زبان کو عموماً منتخب کیا ہے۔ زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے فرانس کے مشہور مفکر موسیو رینان کا .... قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں کہنا ہے:[1]

"زبان ہمیں متحد ہونے کے لیے ترغیب دے سکتی ہے لیکن ہمیں مجبور نہیں کر سکتی۔ زبانیں تاریخ اور تاریخی محرکات کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں اور یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگ کون تھے جو اس زبان کو یا اس زبان کو بولتے تھے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ زبانوں کا سوال ہماری آزادی کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہ بنے۔ کیوں کہ جہاں زندگی اور موت کے مابین چناؤ کرنا ضروری ہوتا ہے وہاں زبانوں کی تفاوتوں کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔"[1]

دانتے کے زمانے میں اٹلی ایک متحدہ ملک نہیں تھا بلکہ مختلف شہری ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ دانتے کا تعلق فلورنس کے شہر سے تھا۔ تاہم جب اس نے لاطینی کے مقابلے میں کسی زبان کو منتخب کیا وہ اطالوی زبان تھی اور زبان کے ایسے تصور ہی کے نتیجے میں مازینی اور گیری بالڈی کے زمانے اور انیسویں صدی میں اٹلی کا اتحاد عمل میں آیا تھا۔ زبان کے بارے میں ایسی ہی کیفیت جرمنوں کی تھی جب جرمنی مختلف ریاستوں میں منقسم تھا۔ سترہویں صدی میں جرمنی میں زبان کا شعور ظاہر ہوا اور سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال راسخ ہوا کہ فرانسیسیوں کی طرح جرمنی کی بھی ایک ہی زبان ہونی چاہیے۔ ۱۶۶۳ء میں لائبنز[2] کا کہنا تھا کہ میری نجات اسی میں ہے کہ میں خالص جرمن دکھائی دوں اور کوئی شخص بھی مجھے فرانسیسیوں کی نقل نہ سمجھے۔ ..... اس مقصد کے لیے ۱۶۹۴ء میں ہالے کے قصبے میں یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس کی انفرادیت یہ تھی کہ اس درس گاہ میں جرمن زبان کو اہم حیثیت دی گئی تھی۔ ۱۷۲۳ء میں

۱۔ رینان۔ "قومیت کے معانی" لیکچر پیرس ۱۸۸۲ء

2. LEIBNIZ

جرمن زبان کو باقاعدہ ادبی زبان کے طور پر قبول کیا گیا۔ اٹھارہویں صدی کے دوران ہرڈر[1] (۱۷۴۴ء تا ۱۸۰۳ء) نے جرمن زبان کو قومی حوالے کے طور پر اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ اس کا کہنا تھا کہ تہذیب کی تفرید ہی تہذیب کی پہچان ہے اور کوئی تہذیب تب تک پہچانی نہیں جا سکتی جب تک کہ اس کی کوئی انفرادی شکل اور انفرادی زبان پیدا نہ ہو۔ ہرڈر کا کہنا ہے کہ:

"تہذیب کوئی عمومی شے یا تصور نہیں ہے یہ صرف (تہذیب) قومی شکلوں ہی میں ظاہر ہوسکتی ہے اور ایسا ظہور ہی اس کی شناخت بن سکتا ہے۔ انفرادیت اور تفرید ہی اس کی پہچان ہے تاہم سب سے بڑی پہچان اس کی اپنی زبان ہے۔ اپنی فطرت اور تاریخ کے حوالے سے لوگ ایک عمومی شے ہیں لیکن جب وہ قومیت اختیار کرتے ہیں اور اپنی قومی زبان سے پہچانے جاتے ہیں اس وقت وہ اپنے تخلیقی کردار کی نشاندہی کرتے ہیں۔"

ایسی ہی کیفیت قرون وسطیٰ کے اختتام پر سولہویں صدی کے دوران میں تھی جب انسان پسند دانشور انگریزی کو کمتر خیال کرتے تھے اور اسے ورنیکلر کا مقام دیتے تھے۔ اس زمانے میں ملکاسٹر[2] (۱۵۸۲ء) نے انگریزی زبان کو قومی زبان کا مرتبہ فراہم کرنے کے لیے نمایاں کام کیا۔ ملکاسٹر کا کہنا تھا کہ اسے روم کے شہر کا بڑا احترام ہے لیکن محبت اسے صرف شہر لندن سے ہے۔ ----- لاطینی زبان کا مقام قابل تعریف ضرور ہے لیکن اسے دل و جاں سے صرف انگریزی زبان ہی عزیز ہے۔ ---- ملکاسٹر کی ایسی آراء کا اپنے زمانےمیں بڑا اثر تھا۔ وہ جس اسکول میں پڑھاتا تھا، انگلستان کا مشہور شاعر ایڈمنداسپنسر (وفات ۱۶۰۰ء) اسی اسکول کا طالب علم تھا۔ اس لیے کچھ عجب نہیں کہ جب اسپنسر نے اپنی مشہور رومانی رزمیہ نظم "فیری کوئین" (Fairy Queen) کے لکھنے کا ارادہ کیا تو اس کے ذہن میں یہ خواہش شدید تھی کہ انگریزی میں بھی اعلیٰ پائے کی ایک ایسی نظم موجود ہو جو اٹلی کے شاہکاروں سے کسی طرح کم تر نہ ہو۔ یہ امر کم خیال انگیز نہیں ہے کہ اسپنسر کی نظم اٹلی کے شہپاروں کے مقابلے کی ہے۔ اس ایک نظم نے انگریزی زبان کو ورنیکلر کے مقام سے اٹھا کر اعلیٰ ادبی زبان کا مقام دیا تھا۔ اس ضمن میں ملکاسٹر کا یہ قول بھی قابل توجہ ہے کہ زبانیں اپنے لکھنے والوں کی مسلسل محنت ہی سے اعلیٰ اور ارفع مقام پاتی ہیں۔ سولہویں صدی ہی

---

1. HERDER
2. Mulcastor (1582)

کے دوران انگریزی زبان کی افزائش[1] کی تحریک شروع ہوئی تھی جو اس زبان کو ورنیکلر کے بجائے قومی زبان بنانے کی آرزو مند تھی۔ فرانسیس بیکن نے غالباً اسی مقصد کے لیے اپنی علمی تحریروں کو انگریزی زبان کا قالب دیا تھا اور اس طرح انگریزی کو اس ذمہ داری سے روشناس کیا تھا جسے لاطینی انجام دے رہی تھی۔

جن مختلف زبانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زبانوں کا مسئلہ مقامی بولیوں اور مقامی زبانوں ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ کئی دوسرے اہم مقاصد بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے بڑا مقصد قومیت اور قیام مملکت کا ہے اور دوسرا بڑا مقصد قومی زبان کی افزائش کا ہے، کیوں کہ قومیت کے فلسفے کے مطابق قوم زبان کی نشاندہی کرتی ہے اور زبان قوم کی شناخت بنتی ہے۔ تاہم اس بارے میں یہ قابل غور ہے کہ مقامی بولیوں اور مقامی زبانوں میں سے کیوں کوئی ایک زبان ہی قومی شناخت کا مظہر بنتی ہے اور باقی بولیاں اور زبانیں کس لیے ایسا مقام حاصل نہیں کر سکتیں۔ اردو زبان کے تذکرے کے دوران بعض محرکات اور اسباب کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ قومیت کے تصور کے بغیر قومی زبان معرض وجود میں نہیں آ سکتی۔ قومیت کا تصور بنیادی طور پر ایک تخلیقی تصور ہے اور کئی اعتبار سے جدید انسانی تاریخ کے زیر اثر ہی ظاہر ہوا ہے۔ قومیت جدید دنیا کا تصور ہے اور اس کی صورتگری عموماً شاعروں اور دانشوروں نے کی ہے۔ اگر مقامی بولیوں اور زبانوں میں شاعر اور دانشور جب اپنے تخلیقی عمل کی برابر پیروی کرتے رہیں تو کوئی بھی مقامی بولی اور مقامی زبان، اصولی طور پر قومی مقام پا سکتی ہے لیکن مقامی زبانوں کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی رہی ہے کہ ان زبانوں کا مزاج اکثر اوقات مختلف ہوتا ہے اور اسی مزاج کی بناء پر قومیت اور مملکت کا تصور رونما ہوسکتا ہے۔ اگر اس حوالے سے دیکھا جائے تو جو زبانیں قومی درجے کی زبانیں قرار پاتی ہیں وہ عموماً مرکزی حکومت کی زبان کا کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ چودہویں صدی میں انگریزی نے انگلینڈ سے فرانسیسی زبان کو بے دخل کرکے عدالتوں اور سرکاری حکمناموں میں اپنا مقام پایا تھا۔ ۱۳۶۵ء ہی سے برطانوی پارلیمنٹ کی کارروائی انگریزی زبان میں ہوا کرتی تھی اور بحث و مباحث میں انگریزی زبان ہی کو استعمال کیا جاتا تھا۔ ۱۵۳۹ء میں فرانس کے بادشاہ فرانسس اول نے لاطینی کی جگہ فرانسیسی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا۔ فرانسیسی بادشاہ کے حکمنامے نے نہ صرف لاطینی کو کاروبار مملکت سے

---

1. Enrichment of The Vernacular

الگ کیا تھا بلکہ متعدد دوسری فرانسیسی مقامی بولیوں کو بھی پیرس کی بولی کے مقابلے میں ہمیشہ کے لیے مسترد کر دیا تھا۔ بادشاہ کی رائے تھی کہ صرف ایک زبان ہی فرانس جیسی وسیع مملکت کو متحد رکھ سکتی ہے۔ اس اعتبار سے ایک زبان کے تصور کو اتحاد مملکت کی اساس گردانا گیا ہے۔ برصغیر کی مقامی زبانوں کے سیاق و سباق میں یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ دربار مغلیہ میں ہر چند کہ سرکاری زبان فارسی تھی تاہم اٹھارہویں صدی کے دوران قلعۂ معلی کی اپنی زبان اردو بن چکی تھی۔ جب لکھنؤ کا دربار آباد ہوا اس وقت بھی اردو ہی کو شرفا اور تمدن کی زبان قرار دیا گیا۔ اسی دور میں پنجاب اور سرحد پر سکھوں کا تسلط ہوا۔ جن کے دربار کی سفارتی زبان فارسی رہی لیکن دربار لاہور کی اپنی زبان گورمکھی قرار پائی۔ زبان کے ایسے رشتے نے خالصہ شاہی اور گورمکھی کو ایک سے معانی دیے اور یوں اسلامیان برصغیر کے سیاسی مستقبل کے لیے گورمکھی مسلمانوں کے حق میں کسی قسم کا کردار ادا کرنے سے قاصر رہی۔ رسم الخط نے مسلمانوں کی مقامی زبان کو گورمکھی سے الگ کر دیا تھا۔ .... ۱۸۵۷ء کے بعد دربار رامپور، بھوپال، بہاول پور اور حیدر آباد میں اردو زبان کا مقام بدستور بحال رہا اور اس زبان کے ساتھ اسلامیان برصغیر کی اجتماعی یادداشتیں برابر وابستہ رہیں۔ .... اردو برصغیر کے مسلمانوں کے اقتدار کی علامت کے طور پر مرکزی اہمیت کی حامل رہی۔ ..... اور اس کا مقام تاریخی نسبتوں سے برابر قائم رہا۔ ..... اس لیے جب سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کے مستقبل کی جدوجہد کا آغاز ہوا اس میں اردو زبان کی اہمیت کو برقرار رکھا گیا اور اسے اسلامیان برصغیر کی وحدت اور اتحاد کا مظہر تسلیم کیا گیا۔ تاہم اسی سلسلے میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ گزشتہ اڑھائی سو برسوں کے دوران اردو زبان میں جتنا تخلیقی کام ہوا ہے اتنا کام کسی دوسری مقامی زبان میں ممکن نہیں ہوا۔ مقامی زبانوں میں انگریز حکمرانوں کے خلاف غصے اور بغاوت کے موضوع ضرور ملتے ہیں لیکن جس زبان کے ذریعے شاعروں اور نثر نگاروں نے برصغیر کے مسلمانوں کے احیاء کا تذکرہ کیا ہے وہ صرف اردو زبان ہے۔ اس اعتبار سے اردو زبان اسلامیان برصغیر کے شعور اور لاشعور کی امانت دار رہی ہے اور اسی کے بطن سے احیاء اور نشاۂ ثانیہ کی آرزو آشکار ہوتی رہی ہے۔

قومیت کے حوالے سے زبانوں کی تہذیبی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ زبانیں کہاں تک قومیت کے تصور کی پاسداری کرتی ہیں اور کہاں تک ان کا تہذیبی مافی الضمیر قومیت کے مقاصد کو نسل در نسل آنے والے زمانے کے لیے منتقل کر سکتا ہے۔ مقامی زبانوں کی مدد سے ماضی کی پہچان ممکن ہوتی ہے اور ان

زبانوں کی زرخیزی سے مادر وطن کے ساتھ رشتے کو ہر لمحہ سیراب کیا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ کہ مقامی زبانیں لوگوں کے پرخلوص جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں اور ان کے ذریعے مملکت کے باشندوں کے مشترکہ قومی شعور کا ادراک ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مقامی زبانوں کے ذریعے لوگوں کے بنیادی تجربات کا علم دستیاب ہوتا ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ قومیت کے تصور کی پاسداری اس کی نشوونما اور قوموں کی زندگی کا تاریخی شعور صرف اس وقت اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں جب مقامی زبانوں اور قومی زبان کے مابین دائمی رشتہ قائم ہوتا ہے۔ زبانوں کے ایسے رشتے اور تعلق کو لوک ورثے اور تاریخ کا رشتہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لوک ورثہ، جو مقامی بولیوں اور زبانوں کے رگ و ریشے میں جاری و ساری رہتا ہے قوموں کے زمانۂ حال کو ماضی کے دور ترین گوشوں کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ یوں سرزمین کے ساتھ قوموں کا تعلق، شعوری اور غیر شعوری طور پر مستحکم ہوتا ہے۔ مقامی بولیوں اور زبانوں کے ذریعے نہ صرف لوک ورثہ ہی عصر حاضر کے شعور کا حصہ بنتا ہے بلکہ وطن کی سرزمین کے ساتھ محبت بھی برابر زندہ رہتی ہے۔ یہ بات اس لیے بھی قابل غور ہے کہ مقامی زبانیں گھرانے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور لوک گیت گھرانے کے ساتھ انس اور رفاقت کی فضا قائم کرتے ہیں۔ زبانوں کے باہمی رشتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب ہے کہ مقامی بولیاں اور زبانیں انسان کو گھرانے اور علاقے کے ساتھ وابستہ کرتی ہیں اور محبتوں اور یادداشتوں کے پختہ اور پائدار رشتوں کی تشکیل کرتی ہیں۔ قومی زبانیں ان رشتوں کی موجودگی میں انسانی تاریخ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہوئے قومیت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کامیاب جدو جہد کر سکتی ہیں۔ ماضی میں زبانوں کے باہمی فرق اور تفاوت کو انسان کے لیے ضرررساں گردانا گیا تھا لیکن مسلمانوں کے فلسفۂ حیات کے مطابق زبانوں کی کثرت کو کائناتی مشیت کی نشانیاں قرار دیا گیا ہے۔ زبانوں کے اسی منظر کا ذکر کرتے ہوئے جرمنی کے مشہور مفکر ہرڈر نے سلطان سلیمان ذیشان کے ایک قول کی طرف اشارہ کیا ہے کہ زمین شاید اتنی خوب صورت نہ ہوتی اگر اس میں زبانوں اور انسانوں کی رنگارنگی شامل نہ ہوتی۔

۲- قومیت کے مسائل اور برصغیر

قومیت کے جن تصورات اور رویوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے حوالے سے عہد حاضر کی کئی قومیں آزاد ہوئی ہیں اور کئی ملک خود مختار مملکتوں کی صورت میں عالمی نقشے پر ظاہر ہوئے ہیں۔ قومیت کے ان تصورات کی روشنی میں یورپ کے ملکوں کے عمرانی اور تہذیبی ارتقا کی پہچان بھی ممکن ہوتی ہے۔ لیکن قومیت کے ان تصورات کی رہنمائی میں برصغیر کے عمرانی اور سیاسی معاملات کو سمجھنا بہت حد تک دشوار ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ غالباً یہ ہے کہ برصغیر جنوبی ایشیاء کی صورت حال مختلف رہی ہے۔ برٹش انڈین ایمپائر بننے سے پہلے یہ برصغیر بلاد اسلامیۂ ہند تھا۔ بلاد اسلامیۂ ہند کے زمانے میں قومیت کا جدید تصور ظاہر نہیں ہوا تھا۔ برٹش انڈین ایمپائر کی اپنی پالیسی برطانوی راج کے استحکام کی تھی اس لیے انیسویں صدی کے آخری دنوں میں متحدہ قومیت کے تصور کو سرکاری طور پر رواج دیا گیا اور قومیت کے خدوخال کو سیکولر صورت دی گئی۔ یہ عمرانی انتظام حکومت کے مقاصد کی تعمیل کرتا تھا۔ تاہم جس زمانے میں متحدہ قومیت کی اصطلاح کو برصغیر میں رائج کیا گیا تھا اس کے سیاسی افق پر محکوم قوموں کی آزادی کا قطعاً کوئی شائبہ موجود نہ تھا۔ یورپی قومیں دنیا کے طول و عرض میں اور برصغیر میں انگریز اپنے نوآبادیاتی ارادوں کی تکمیل ہی کے خواہاں تھے۔ انیسویں صدی کے آخری پچاس برس اس اعتبار سے استعمار کے عروج کے برس تھے اور امپیریلزم کے ماتحت ان کا ہر قدم محکوم علاقوں پر اپنے اپنے تسلط کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ہی آگے بڑھتا تھا۔ اس لیے کچھ عجب نہ تھا کہ متحدہ قومیت کو رواج دیتے ہوئے "مائیکرو پالیٹکس" (Micro-Politics) کو جاذب نظر بنایا گیا تاکہ ہندو اور مسلمان لوکل سیلف گورنمنٹ ہی کے دائرے میں اپنا وقار بحال کرتے رہیں! تاہم انیسویں صدی کے ان ایام کے دوران میں مسلمانوں کے ساتھ زمانے نے جو سلوک کیا۔ جو واردات ان کے ساتھ ہوئی اور جس نوع کے عمرانی تجربے سے ان کو گزرنا پڑا۔ ان کے نتیجے میں ایک ہی سوال مرتب ہوا کہ اگر برصغیر کی عمرانی اساس متحدہ قومیت ہے تو ----- ان کی اپنی قومیت کیا ہے؟ انیسویں صدی کے ان ایام کے تجربات کے بغیر یہ سوال برآمد نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہی مسلمانوں کے گھرانے مسدس حالی کو سنتے اور پڑھتے ہوئے زارو قطار رو سکتے تھے!

اس برصغیر میں مسلمانوں کا وجود ان کی تاریخی موجودگی سے پیدا ہوتا

تھا۔ بلاد اسلامیہ ہند کا دور اقتدار کم و بیش ایک ہزار برس پر محیط تھا۔ خلافت بنو امیہ کے زمانے میں مسلمان سندھ اور ملتان میں وارد ہوئے تھے اور ان کا اثر و نفوذ ساحل مالا بار تک تھا۔ خلافت عباسیہ کے دور میں مسلمان پنجاب میں وارد ہوئے اور بلاد اسلامیہ ہند کا سیاسی اور عمرانی وجود ظاہر ہوا۔ یہ سیاسی وجود بلاشرکت غیرے ۱۸۵۷ء تک برابر قائم اور موجود رہا۔ جس ہندوستان سے اور جس سونے کی چڑیا سے اہل یورپ واقف ہوئے تھے وہ بلاد اسلامیہ ہند تھا اور جس ملک کے لیے نئے سمندری راستے کی تلاش میں کولمبس روانہ ہوا تھا وہ یہی ملک تھا جس کی عنان حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ ایران اور توران سے مسلمانوں کی آمد اور تبلیغ اسلام کے سبب برصغیر کے باشندوں کے مسلمان ہونے کے نتیجے میں مسلمانوں کی عددی موجودگی کے خدوخال مرتب ہوئے اور یہی موجودگی ایک ہزار برس کے مسلسل قیام کے سبب برصغیر میں ان کی تاریخی موجودگی قرار پائی۔ جس اصول کے تحت مسلمانوں کی موجودگی تاریخی حقیقت میں بدلی تھی ویسا اصول انگریزوں کے دور اقتدار میں نظر نہیں آتا۔ وجہ یہ تھی کہ انگریز حکمران برصغیر میں نہ تو آباد ہوئے تھے اور نہ انہوں نے زمین کے ساتھ ویسا رشتہ پیدا کیا جو مسلمانوں کے دور قیام میں دکھائی دیتا ہے۔ اینگلوانڈین لوگوں کا اس اعتبار سے یہاں ایک مذہبی وجود ہے، تاریخی وجود نہیں ہے، کیوں کہ اینگلوانڈین لوگوں نے برصغیر کے اقتدار میں اس طرح شرکت نہیں کی تھی جیسے مسلمان حکمرانوں کا اقتدار رہا تھا۔ ایسے رویے کا اظہار کہ انگریزوں نے برصغیر کے ساتھ مقامی باشندوں کا سا رشتہ کیوں پیدا نہ کیا، لارڈ ویول کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ بلاد اسلامیہ ہند کے طویل دور اقتدار میں مسلمانوں کی موجودگی کا تصور یہاں پر موجود کثرتوں کا تصور تھا۔ ان کثرتوں میں بے شمار اکائیاں شامل تھیں جو راس کماری سے خیبر تک، حیدر آباد اور کشمور سے کشمیر اور چترال تک اور چاٹگانگ سے مستونگ اور خضدار تک جابجا مقیم تھیں۔ ان اکائیوں کو ان کی نمائندہ نسبتوں سے پکارا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے وہ گروہ جو ایران، عرب، عراق، آذربائیجان اور توران سے برصغیر میں وارد ہوئے تھے اور جنہوں نے اس ملک کی سرزمین کے ساتھ دائمی رشتہ قائم کیا تھا، ان کی نسبت علاقائی اور نسلی تھی۔ اسی طرح برصغیر کے جن باشندوں نے اسلام قبول کیا ان کی نسبت بھی نسلی رہی۔ اس زمانے میں انسانی گروہوں کی شناخت کے لیے نسل کا حوالہ مستعمل تھا، جو برصغیر کے آریائی نظام معاشرت کے سبب زیادہ سے زیادہ سنگلاخ اور سخت تر ہوتا رہا تھا۔ کثرتوں کی اس دنیا میں وحدت مذہب عطا کرتا تھا اور اسلام کے تصور مساوات کے تحت نسلی اور

علاقائی نسبتوں کے باوجود مسلمان برابر ایک وحدت تھے جس کی نشاندہی مذہبی عبادات، عیدین اور بزرگوں کے مزاروں کی جانب راہ سپار زائرین کے قافلے کرتے رہے ہیں۔ تاہم عمرانی طور پر مسلمانوں کی موجودگی کثرتوں ہی کے تصور کو نمایاں کرتی رہی تھی لیکن اس ضمن میں قابل غور یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودگی کا کثرتی تصور ایک مخلوط معاشرے میں رونما ہوا تھا جہاں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اور یہ تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ایک ہزار برس کے طویل عرصے میں بھی ۳:۱ کے تناسب میں رہی ۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق برصغیر میں مسلمانوں کی آبادی ۲۳٪ تھی۔

اس برصغیر میں مسلمانوں کی موجودگی عمرانی اعتبار سے کثرتوں کے تصور کو ظاہر کرتی تھی اور مذہبی اعتبار سے وحدت کے تصور کی نشاندہی کرتی تھی اور چونکہ اقتدار اور حکمرانی مسلمانوں کی ذمہ داری تھی اس لیے مسلمانوں کی موجودگی کا عمرانی تصور کثرتوں ہی کا تصور رہا اور اس تصور کے تحت اس میں شامل اکائیاں اپنے اپنے انداز میں زندگی بسر کرتی رہیں۔ تاہم اگر عمرانی کثرتوں اور مذہبی وحدت کے رشتے کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ کا سیاسی تصور جہاں ان (عمرانی) کثرتوں اور (مذہبی) وحدت کو تحفظ فراہم کرتا تھا وہیں اس احساس تحفظ کے ذریعے عمرانی کثرتیں سیاسی وحدت اختیار کر لیتی تھیں۔ تاہم عمرانی کثرتوں سے سیاسی وحدت کا ظہور معرض التواء میں تھا۔ ہر چند کہ اس کی امکانی صورت برابر موجود تھی۔ ۱۸۵۷ء کی صورت حال نے عمرانی کثرتوں کو سیاسی وحدت میں منتقل کرتے ہوئے اس امکانی کیفیت کی واضح طور پر نشاندہی کی۔ سیاسی وحدت کا یہ تصور مسلمانوں کی مذہبی وحدت کا تصور بھی تھا۔لیکن اس کی صورت جدید مفہوم کے مطابق شعوری نہ تھی۔

بلاد اسلامیہ ہند کے زمانے میں مسلمانوں کی حکمرانی اور دہلی میں مسلمان بادشاہ کی موجودگی سےمسلمانوں کی عمرانی کثرتوں کو مذہبی اور سیاسی وحدت کا احساس حاصل تھا۔ اگر ایسے رشتے کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوگا کہ عمرانی کثرتیں، مذہبی اور سیاسی وحدتوں کے دائرے میں اور ان وحدتوں کے حوالے سے اپنا وجود پاتی تھیں۔ ایسے منظر کے باعث عمرانی کثرتوں کو اعتماد میسر تھا اور اگر ایسا اعتماد میسر نہ ہوتا تو بلاد اسلامیہ ہند کے زمانے میں مسلمانوں کی تخلیقی قوتیں نہ تو نشوونما پا سکتیں اور نہ اپنے تخلیقی اظہار ہی کو پائیدار مفہوم دے سکتیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی اور بلھے شاہ اسی تخلیقی اور تاریخی اعتماد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ

شاہ عبداللطیف بھٹائی اور بلھے شاہ دو الگ الگ عمرانی وحدتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور کثرتوں کے تصور کو نمایاں کرتے ہیں لیکن مذہبی وحدت کا حصہ ہوتے ہوئے اس تخلیقی اعتماد کو آشکار کرتے ہیں جو سیاسی وحدت کے تصور ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ یہ بات اس لیے بھی درست دکھائی دیتی ہے کہ تخلیقی اعتماد ہمیشہ سیاسی استحکام کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اور اثباتی صورت اختیار کرتا ہے کیوں کہ جہاں لوگ سیاسی طور پر محکوموں کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ وہاں تخلیقی اعتماد نہ تو پیدا ہوتا ہے اور نہ ان کی تحریروں ہی میں اثباتی مزاج رونما ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخی موجودگی سے وابستہ یہ تصورات(جن کا ذکر کیا گیا ہے) اٹھارہویں صدی کے دوران حالات کے بدلتے ہوئے سلسلے سے دو چار ہوئے۔ ان حالات کی تشویش ناکی اس امر سے بھی واضح ہے کہ اسے قائداعظم نے "زبردست تباہی" کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ اس صدی کے دوران بلاداسلامیہ ہند کا مرکزی سیاسی تصور پارہ پارہ ہوا اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی علامت نکبت و ادبار سے دو چار ہوئی۔ بادشاہ قتل ہوتے رہے، اندھے ہوتے رہے، بے بس بنائے گئے اور بالاخر معزول کرکے تاریخ سے بے دخل کر دیے گئے۔ مسلمانوں کا برصغیر سے سیاسی اقتدار رخصت ہوگیا ! سیاسی تصور کے تلف ہو جانے سے مسلمانوں کی تاریخی موجودگی عمرانی کثرتوں اور مذہبی وحدت کے سہارے قائم رہی۔ اگر اس زمانے کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ابتلاء کے اس زمانے میں عمرانی کثرتوں کے تصور نے مسلمانوں کی تاریخی موجودگی کو نابود ہونے سے بچایا۔ قبیلے اور برادری نے مسلمان گروہوں کے تحفظ کی جدوجہد کو قائم رکھا۔ پنجاب میں "چٹھیاں دی وار" اس ضمن میں قابل ذکر ہے۔ تاہم کثرتوں کےتصور پر دباؤ شدید سے شدید تر ہوتے گئے۔ سکھوں، مرہٹوں اور آخر میں انگریزوں کی تاخت و تاراج نے جہاں مسلمانوں کو قبیلے اور برادری کے حصار میں اور زیادہ محصور ہونے پر مجبور کیا، وہیں جب اقتدار کا مکمل خاتمہ ہوگیا تو مایوسی، نامرادی، تھکن اور نفسیاتی احساس شکست نے فرد کو کسی بڑے رشتے سے بھی محروم کر دیا۔ کثرتوں کا تصور ٹوٹ کر فرد کے بے حس ہونے کی کیفیت میں ظاہر ہوا۔ اقتدار کی شکست وریخت نے مسلمانوں کی برصغیر میں تاریخی موجودگی کو عمرانی طور پر پامال کیا اور مذہبی وحدت کا تصور۔ دشمن قوتوں کی دنیا میں نئی ابتلاؤں سے دو چار ہوا۔ پرتھوی راج راسو سے ستیارتھ پرکاش تک جو زمانہ دکھائی دیتا ہے وہ مسلمانوں کی تاریخی موجودگی کو برابر نابود کرنے کی کوششوں کو نمایاں کرتا ہے۔

بلاد اسلامیہ ہند کے مٹ جانے اور مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ کی شکست و ریخت سے جو دنیا ظاہر ہوئی اس میں مسلمانوں کی حالت کچھ ویسی تھی جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی تاریخی موجودگی کے تینوں بنیادی تصور ٹوٹ چکے تھے۔ مذہبی وحدت کے تصور پر عیسائی مشنریوں اور آریہ سماج کی یلغار ناقابل بیان تھی۔ کثرتوں کا عمرانی تصور، قبیلے اور برادری اور نام و نسب کے حصاروں میں پناہ پانے پر مجبور ہو چکا تھا۔ اس عمرانی تصور کا وحدت کے سیاسی تصور سے کوئی بھی رشتہ باقی نہ تھا۔ اس صورت حال کو جس زبان نے سب سے پہلے محسوس کیا اور جس زبان نے اس صورت حال سے نبٹنے اور عہدہ برآ ہونے کی ترغیب دی وہ اردو زبان تھی۔ کبھی کبھی خیال گزرتا ہے کہ اگر اردو زبان کی یہ خدمات حاصل نہ ہوتیں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے احیاء کی کیا صورت ہوتی !

مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی قومیت کے جدید تصور کی نشرو اشاعت کے زمانے کی ابتدا ہوئی اور یہ تصور "سرزمین وطن" کو مرکزی قرار دیتے ہوئے "سرزمین" سے "قومیت" کو اخذ کرتا تھا۔ سیاسی طور پر اس تصور کے ساتھ مسلمانوں کے مستقبل کو وابستہ کرتے ہوئے متعدد مسائل رونما ہوئے تھے جن کی تفصیل مسلمانوں کی سیاسی جد و جہد کو مرتب کرتی ہے۔ تاہم اس ضمن میں یہ امر غور طلب ہے کہ انگریزوں کی آمد سے قبل برصغیر میں قومیت ان معنوں میں موجود نہ تھی جن معنوں میں یہ جدید اصطلاح میں ظاہر ہوئی اس کے علاوہ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مسلمان ۱۸۵۷ء کے بعد جس کیفیت سے گزر رہے تھے اسے اس زمانے کے اہل فکر انتشار اور نفسانفسی سے تعبیر کرتے تھے۔ مسلمان من حیث القوم منتشر تھے اور ان کی صفوں میں اتحاد ناپید تھا۔ کثرتوں کے جس عمرانی تصور کا قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے وہ مزید بکھر چکا تھا۔ اس زمانے کے ادب کو پڑھتے ہوئے گہرا احساس ہوتا ہے کہ وحدت کے کسی تصور کو مسلمانوں کے ذہنوں میں اتارنا ایک بے حد مشکل کام تھا۔ یہ باتیں ایسی ہیں جن سے ہمارے عہد کا غالباً ہر شخص واقف ہے۔ سرسید کی تحریک اور علی گڑھ کے بزرگوں کی خدمات کو اس سلسلے میں نمایاں مقام حاصل ہے کہ ان کی محنتوں سے مسلمانوں کی صورت حال میں یگانگت اور اعتماد پیدا ہوا اور نئے نامساعد زمانے کے ساتھ مسلمانوں کے مقدر کے نئے رشتے اور نئے زاویے قائم ہوئے۔ اس عظیم انقلاب کو اردو زبان کے ذریعے بروئے کار لایا گیا تھا اور یہ اردو زبان کا باہمی رابطہ تھا جس نے انڈین ایمپائر کے طول و عرض میں آباد مسلمان گھرانوں کو ایک مشترکہ سوچ میں شریک کیا اور ایک بااعتماد ذہنی افق فراہم کیا۔اس

ضمن میں یہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ علاقائی زبانیں اس زمانے میں اس سطح اور اس اعتماد سے کلیتاً محروم تھیں اور ان میں آل انڈیا مقاصد کی تکمیل کے لیے صلاحیت بھی موجود نہ تھی! ان حالات میں مسلم شعور کی تشکیل اور برصغیر کے مسلمانوں کے احیاء اور حیات نو کے لیے اردو زبان نے مسلم قیادت کی زبان کا کردار ادا کیا اور دور افتادہ علاقوں میں اپنے الفاظ اور رسم الخط کے ذریعے برصغیر کے اسلامی تشخص کو اجاگر کرنے کی ذمہ داریاں پوری کیں۔ ......

اس زمانے کی علاقائی زبانیں بھی خال خال ان حالات کا ذکر کرتے دکھائی دیتی ہیں جو انگریزوں کے تسلط سے پیدا ہوئے تھے۔ مگر ایسا اظہار سرسری نوعیت کا ہے۔ میاں محمد کی تصنیف سیف الملوک[1] میں حکومتوں کے بدلنے کا ذکر ہے اور مسلمانوں کی دردناک حالت کا احساس نظر آتا ہے لیکن یہ کیفیت سیف الملوک کی رومانوی داستان بیان کرنے کے بعد آخر میں ایک مسلسل نظم کے ایک حصے میں شامل کی گئی ہے۔ جس سے مصنف کے مضامین کی ترجیحات کا علم بھی ہوتا ہے۔ سیف الملوک ابتلا کے دنوں میں لکھی گئی تھی اور امیر بہاولپور کے نام نامی سے معنون تھی لیکن مصنف "قوم" کے درد سے آشنا ہوتے ہوئے بھی سردست اس مقام سے بہت دور دکھائی دیتا ہے جس پر علی گڑھ تحریک کے بزرگ اور سرسید نظر آتے ہیں۔ علاقائی زبانوں میں البتہ ایسے قصے بھی دکھائی دیتے ہیں جن میں بہادروں نے انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے جان دی اور غیرت پر آنچ نہیں آنے دی۔ ...... ایسے قصوں سے مسلم اقتدار کے تحفظ کی آرزو آشکار ہوتی ہے لیکن یہ قصے زیادہ تر زبانی روایت ہی کا حصہ رہے اور گم ہوگئے۔ انگریزوں کے زمانے میں ایسے قصے شائع کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔

اس زمانے میں مسلمانوں کی منتشر حالت کو اور ان کے نفسیاتی اور تہذیبی سانحے کو قومیت کے جدید تصور کے قریب تر لانے اور صورت حال کو بہتر بنانے میں اردو زبان کی خدمات بے حد گراں قدر تھیں۔ تاہم انتشار زدہ انسانی کیفیت اور قبیلوں اور برادری اور علاقائی کثرتوں سے وابستہ ملی صورت کو ایک قوم کی جانب بلانا اتنا آسان کام نہ تھا۔ سرسید کی تحریروں نے ایک نئے احساس کو رونما کیا اور مسدس حالی نے مسلمانوں کو اس ابتلاء سے آشنا کیا جو ان پر وارد ہو چکی تھی۔ مسدس اس اعتبار سے مسلمانوں کے ملی تشخص کو مستحکم کرتی ہے، مسلمانوں کو نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جگاتی ہے، عظمت رفتہ

---

[1] پنجابی کی مشہور رومانوی داستان۔ (انیسویں صدی)

کی یاد دلاتی ہے اور اس دکھ کو نمایاں کرتی ہے جو اس رباعی میں جھلملاتا ہے:

"ہستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کوئی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!"

برصغیر کی مسلم قومیت اور مسلم تشخص کی طرف یہ پہلا درد ناک اشارا تھا جو بدلے ہوئے ماحول میں اردو زبان کی وساطت سے ہر گھرانے کے در و بام میں گونج گیا تھا۔ ....

"کہ کل کون تھے اور کیا ہوگئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سوگئے تم؟"

علامہ اقبال کا جواب شکوہ اس ضمن میں اس لیے غور طلب ہے کہ اس طویل نظم میں برصغیر کے مسلمانوں کی عمرانی کیفیت کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے اور جہاں جواب شکوہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی کی کئی صورتیں دکھائی دیتی ہیں، وہیں اس زبوں حالی کے ایک نمایاں مظہر کی طرف واضح اشارا بھی ہے۔ ...... جواب شکوہ کے کچھ اقتباس قابل غور ہیں:

"منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہے سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟
شور ہے ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود؟
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟"

انتشار کے ہوش ربا سانحے کے باعث جواب شکوہ کے عمرانی اور تہذیبی رویے ظاہر ہوئے تھے لیکن اس سانحے میں فرقہ بندی ذات پات اور قبائلی تفاوتیں نمایاں تھیں جن کی موجودگی میں ملّی وحدت کا مقصد حاصل ہونا مشکل تھا۔ ایسے مشکل اور مایوس ترین ماحول میں برصغیر کے ملّی تشخص کی حفاظت،

نشرو اشاعت اور کثرتوں کو وحدت میں شامل کرنے کی دعوت اردو زبان کی قسمت بنی اور برصغیر کی ملّی تاریخ اس امر کو فراموش نہیں کر سکتی۔

جدید زمانے میں قومیت کی اصطلاح تین نمایاں تقاضوں کی طرف اشارا کرتی ہے ایک اہم تقاضہ قوم کے تشخص اور وجود کا ہے۔ دوسرا قومی زبان کا اور تیسرا خطہ زمین کی موجودگی ہے۔ بلاداسلامیہ ہند کے زمانے میں مسلمانوں کی تاریخی موجودگی کے ضمن میں ان تین تقاضوں کے حوالے سے بحث ممکن نہیں تھی لیکن اقتدار کے چھن جانے کے بعد ان تینوں تقاضوں کو پورا کیے بغیر قومیت کا تصور رونما نہیں ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں کے ملّی تشخص اور وجود کے تحفظ کے ساتھ جو زبان ان ذمہ داریوں کی تکمیل کے لیے بروئے کار آئی اور جسے قومی زبان (ملّی زبان) کا درجہ حاصل ہوا وہ اردو زبان تھی۔ اس برصغیر میں مسلمانوں کے ملّی تشخص کو متحدہ قومیت کے ذریعے ناقابل فہم قرار دیا گیا اور اردو زبان کے مقابلے میں ہندی اور ناگری رسم الخط کو ہندو اکثریت کا جائز مظہر گرداننے کی زبردست کوششیں ہوئیں۔ جو استدلال کیا گیا یہ تھا کہ مذہب کی بناء پر کسی گروہ کو الگ قوم کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اور ریاست اور سیاست کے ساتھ اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں تبدیلیٔ مذہب سے الگ قوم رونما نہیں ہو سکتی[1] اور چونکہ اس برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت نو مسلموں پر مشتمل رہی ہے اس لیے مذہب کی بناء پر ان کے نسلی رشتے کو ہندو معاشرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس اعتبار سے بھارت ورش ان کی جنم بھومی ہے۔ کانگرس ان کی ترجمان ہے اور انڈین نیشنلزم ہی ان کا سیاسی مسلک ہے تاہم جو لوگ ایسے استدلال سے اتفاق نہیں کرتے ان کے لیے اس خطہ زمین میں قیام کسی طرح جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ ان کا وطن نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ مسئلہ بہت اہم بن چکا تھا کہ کیا ہندوستان مسلمانوں کا وطن بھی ہے؟ علامہ اقبال کی مشہور نظم "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ہندو اکثریت کی سرزمین میں دریافت وطن کے موضوع کی نشاندہی کرتی ہے اور اس سوال کو نمایاں کرتی ہے کہ کیا ہندوستان کی اس سرزمین پر مسلمانوں کا حق نہیں ہے؟ اس نظم کے دو بند قابل غور ہیں :

"چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

---

1. ... Separate Nation." Gandhi

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے!
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے!"

اس برصغیر کے مسلمانوں کی قومیت اور اس کی تشکیل کے لیے جن اجزائے ترکیبی کی ضرورت تھی ان میں قومی تشخص اور ملّی وجود کے تحفظ اور اقرار کی اہمیت بنیادی تھی اور "خطۂ زمین" کا مسئلہ اس کی منطقی توجیہ تھا۔ تاہم یہ دونوں اہم امور ایک مسلسل جد وجہد کی صورت میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کو توانائی فراہم کرتے رہے۔ شعوری طور پر ملّی وجود اور قومی تشخص کو آشکار ہوتے ہوئے اور سیاسی عمل کا مرکزی مفہوم بنتے ہوئے متعدد مقامات سے گزرنا پڑا۔ خطۂ زمین (آزاد وطن) جد و جہد کے آخری ایام کے دوران سیاسی فکر میں شامل ہوا، لیکن قومیت کے اجزائے ترکیبی کا ایک اہم عنصر "قومی زبان" ابتدا ہی سے برصغیر کے مسلمانوں کی جد وجہد میں شریک ہو چکا تھا۔ اس اعتبار سے اردو زبان کو برصغیر کے مسلمانوں کے ملّی سیاسی اور فکری شعور کی زبان بھی کہا جا سکتا ہے۔ تاہم اس ضمن میں ہندی ساہتیہ سمیلن اور ہندوؤں کی اردو مخالفت کچھ اس لیے بھی قابل فہم دکھائی دیتی ہے کہ اردو کو مسلمانوں کے شعور سے منہا کرکے برصغیر کے مسلمانوں کے مابین رابطے کی زبان کو ختم کرنا ممکن نظر آتا تھا۔ اردو کی مخالفت رابطے کو توڑنے کے مترادف تھی۔ ---- مسلمانوں کی قومیت کے تصور کی راہ میں جہاں کئی اور دشواریاں تھیں وہاں اردو کے تحفظ کی ذمہ داری سب سے اہم تھی۔

۲۔ اسلامی ہندوستان میں مقامی زبانوں کی صورت

اسلامی ہندوستان سے قبل برصغیر مقامی بولیوں کا ملک تھا۔ تحریری مقام صرف سنسکرت کو حاصل تھا جو ایک محدود طبقے کی زبان تھی اور جس زبان تک کسی عام شخص کی رسائی، (جو برہمنوں کے طبقے سے تعلق نہ رکھتا تھا) ناممکن تھی۔ سنسکرت سے پھوٹتی ہوئی مقامی بولیاں صرف بول چال کے کام آتی تھیں۔ اگر کہیں کسی پراکرت میں کوئی شے لکھی بھی گئی تھی تو وہ عام خیال کے مطابق پالی زبان تھی لیکن پالی زبان بھی بدھ مت کے ساتھ منسوب تھی اور ایک عام ہندو بھی غالباً اس زبان کے بارے میں فراخدل واقع نہیں ہوا تھا۔ ایسے لسانی حالات کی روشنی میں یہ کہنا درست ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے برصغیر کی مقامی بولیاں بہت ہی پست انسانی سطح پر تھیں اور تمدنی طور پر شائستہ معیار سے ابھی بہت دور تھیں تاہم اگر زبانوں کی مدد سے کلچر کی شناخت ممکن ہو سکتی ہے تو سنسکرت زبان کے حصار بند ہو جانے سے (یہ کہنا غلط نہ ہوگا) اس عہد کا کلچر زبانوں کی اعانت سے محروم تھا کیوں کہ مقامی زبانیں سردست کسی کلچرل کردار کی حامل نہیں تھیں۔ اسلامی ہندوستان کا تہذیبی اور لسانی احسان غالباً یہ بھی ہے کہ اس تاریخ ساز عہد حکومت نے مقامی بولیوں کو مقامی زبانوں کا مقام فراہم کیا۔ ان زبانوں کو سوچنا اور لکھنا سکھایا اور ان کے الفاظ کو خیالات اور جذبے کو بیان کرنے کی صلاحیت اور قدرت مہیا کی۔ اسلامی ہندوستان سے قبل مقامی بولیوں کا مقام غیر واضح اور بے حد ابتدائی نوعیت کا تھا۔ لیکن اسلامی ہندوستان کے دوران انہی مقامی بولیوں سے علاقائی زبانیں ظاہر ہوئیں۔ اسلامی ہندوستان سے پہلے مقامی بولیوں کا نطق موجود تھا لیکن ذہن ناپید تھا۔ اسلامی ہندوستان نے ان بولیوں کے نطق کو ذہن سے وابستہ کیا جس نے ادب و شاعری کی تخلیق کی۔ اسلامی ہندوستان کا علاقائی ادب اس شاندار کامیابی کی بخوبی نشاندہی کرتا ہے۔

مقامی زبانوں کی لسانی تشکیل اور ترقی کے ضمن میں مسلمانوں کے رائج کردہ نظام تعلیم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں سے قبل برصغیر میں تعلیم عامہ کی ایسی جامع صورت بہت کم دکھائی دیتی ہے جیسی اسلامی ہندوستان کے زمانے میں نظر آتی ہے۔ عالم اسلام کے تعلیمی نظام کے مطابق غزنوی

عہد میں لاہور میں مسجدوں کے ساتھ مکتب اور مدرسے قائم کیے گئے تھے۔ فتح دلی کے بعد سلطنت میں ناصریہ اور شمسیہ مدرسوں کا بہت شہرہ ہوا۔ اسی دوران میں جب وسط ایشیا میں منگولوں کی تاخت و تاراج سے تمدن و ثقافت تباہ ہونے تو بے شمار اہل علم نے اسلامی ہندوستان کا رخ کیا اور بلاد اسلامیہ ہند میں مدرسے قائم کیے۔ یوں اسلامی نظام تعلیم کے مراکز دور دور تک پھیل گئے۔ ان دینی مراکز کی ضرورت اور افادیت اس لیے بھی نمایاں ہوئی کہ سلطنت کے نظم و نسق کے لیے قاضی اور مفتی درکار تھے۔ علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت میں سلطان کا امیرالامراء شمس الملک علم و ادب کا مربّی اور پرستار تھا۔ اس کی توجہ کے سبب سلطنت میں فقہ، دینیات، ادب اور شاعری، علم تفسیر اور علم طب کو خاص طور پر فروغ ہوا۔ تغلق خاندان کے سلطان محمد تغلق نے تعلیم عامہ پر بہت زور دیا کیوں کہ وہ خود علم دوست حکمراں تھا اور معقولات کی تدریس و تعلیم میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ اس کے عہد میں تعلیمی اداروں کے ساتھ املاک کو وقف کرنے کی روایت قائم ہوئی۔ اس نے اہل علم کو اپنی سلطنت کے دور دراز قصبوں میں آباد ہونے پر آمادہ کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ علم اور درس و تدریس کا سلسلہ صرف دارالخلافے ہی تک محدود نہ رہے بلکہ سلطنت کے دور افتادہ گوشے بھی اس فیض سے برابر مستفید ہوں۔ تعلیمی مراکز کے ساتھ املاک کو وقف کرنے کی حکمت عملی نے تعلیم کے فروغ میں بہت اضافہ کیا۔ ...... سلطان محمد تغلق کا یہ کارنامہ اسلامی ہندوستان کی علمی تاریخ کا ایک نمایاں پہلو ہے۔

تعلیم و تدریس کی اس روایت میں جو اسلامی ہندوستان میں قائم ہوئی، سلطان سکندر لودھی (۱۴۸۹ء۔ ۱۵۱۷ء) کا عہد حکومت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نے فوجی اور غیر فوجی افراد کے لیے ایک خاص تعلیمی معیار کی ضرورت پر زور دیا۔ سلطان سکندر لودھی کے عہد حکومت سے پہلے نچلی سطح پر سلطنت کا کاروبار ناگری رسم الخط میں ہوتا تھا اور حساب کتاب کے لیے مہاجنوں اور منیموں کی زبان استعمال کی جاتی تھی۔ گو اعلی سطح پر فارسی زبان ہی سرکار دربار کی زبان تھی۔ سلطان سکندر لودھی نے ایک حکم نامے کے ذریعے نظم و نسق کی زبان فارسی قرار دی یوں حساب کتاب کے لیے بھی فارسی زبان استعمال ہونے لگی۔ اس طرح ہندو اہلکار بھی فارسی پڑھنے کی جانب آمادہ ہونے اور مسجدوں کے ساتھ ملحق مدرسوں کے علاوہ ایسے مدرسے بھی قائم ہوتے گئے جہاں مروجہ نصاب تعلیم کےمطابق درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوا۔ ان مدرسوں نے اسلامی نصاب تعلیم کو غیر مسلموں کے لیے ممکن بنایا اور وہ عالم اسلام کے علمی اور فکری سرچشموں سے براہ راست مستفید ہونے لگے۔ سلطان سکندر لودھی نے

منقولات کے ساتھ ساتھ معقولات پر بھی زور دیا اور سلطنت کے لیے اسلامی ممالک سے نامور عالموں کی خدمات حاصل کیں۔ ..... تاکہ اس کے اپنے عہد حکومت میں علم و تدریس کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے۔ بابر بادشاہ کے مختصر عہد حکومت (۱۵۲۶ء- ۱۵۳۰ء) میں امور عامہ کے محکمے(شہرت عام) کے سپرد یہ کام ہوا کہ نئے مدرسوں کے لیے عمارتیں تعمیر کی جائیں تاکہ درس و تدریس کا سلسلہ زیادہ سے زیادہ پھیل سکے۔ اکبر کے زمانے میں تعلیم کا محکمہ فتح اللہ شیرازی (وفات ۱۵۸۸ء) کے پاس تھا جو خود ایک نامور عالم تھا اور معقولات، ادبیات اور دینیاتی علوم پر یکساں عبور رکھتا تھا۔ اس لیے عہد اکبری میں فلسفے اور معقولات کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ سرٹامس رو کا کہنا ہے کہ سلطنت کے امراء ارسطو اور افلاطون کے فلسفے پر بڑا عبور رکھتے ہیں۔ تعلیم و تدریس کی اس اسلامی روایت میں جہانگیر کا یہ حکم نامہ بھی قابل ذکر ہے جس کے مطابق ہر اس صاحب جائداد شخص کی وفات پر جو لاولد مر جائے لازم تھا کہ اس کی ساری جائداد مدرسوں اور دارالعلوم کی مدد کے لیے بحق سرکار استعمال کی جائے۔ اس حکم نامے کے نتیجے میں نئے مدرسے قائم ہوئے اور پرانے مدرسوں کو مستحکم کیا گیا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں سیالکوٹ کی شہرت بہت دور دور تک تھی۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے علم و فضل کا شہرہ عام تھا۔ معقولات کی تعلیم کے لیے دور دراز سے علم کےخواہش مند مولانا سے فیض حاصل کرنے کے لیے سیالکوٹ پہنچتے تھے۔ داراشکوہ کے مطابق اس زمانے میں صرف لاہور شہر ہی میں آٹھ ہزار سے زائد مدرسے درس و تدریس میں مصروف تھے۔

اسلامی ہندوستان کے دور میں جن مقامی زبانوں نے نئے علمی ماحول سے استفادہ کیا اور اس ماحول کی مدد سے اپنا لسانی وجود پایا ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق برٹش انڈین ایمپائر میں کم و بیش پانچ سو زبانیں بولی جاتی تھیں۔ تاہم جن زبانوں پر مسلمانوں کا غالب اثر دکھائی دیتا ہے اور جن کو مسلمانوں ہی نے زیادہ تر اپنے اظہار کے لیے استعمال کیا تھا ان میں پشتو، کشمیری، پنجابی، سندھی اور اردو کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان زبانوں کا ذکر اس لیے بھی ملحوظ ہے کہ ان کا رسم الخط ایک ہے۔ برصغیر کی بیشتر زبانوں کا رسم الخط عربی/فارسی کے بجائے ناگری ہے۔ بنگالی جو اپنے ناگری رسم الخط کے حوالے سے آریائی گھرانے کی زبان نظر آتی ہے، مسلمانوں کے عہد میں فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ بنگالی کا پوتھی ادب ۱۷۵۷ء تک اسی رسم الخط کا مظہر ہے اور یوں مسلمانوں کے مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ پنجاب میں ایسی ہی صورت گورمکھی اور پنجابی کی ہے۔ غیر گورمکھی رسم الخط کی پنجابی زبان

کو مسلمانوں سے منسوب کیا گیا ہے۔

اسلامی ہندوستان لسانی اعتبار سے علاقائی زبانوں کا ملک تھا لیکن اس کی سرکاری اور علمی زبان فارسی تھی۔ عربی مذہبی زبان تھی اور اس کے علمی اور تہذیبی تاثر کے مخاطب زیادہ تر مسلمان تھے۔ فقہ، علم تفسیر، علم حدیث اور فتوی اور قضاۃ کے عہدوں کے لیے عربی کی تحصیل ضروری تھی۔ تاہم اسلامی ہندوستان کے صوبوں میں عربی اور فارسی کے ساتھ مقامی زبان بھی برابر کار فرما دکھائی دیتی ہے۔ صوبوں کے مابین فارسی رابطے کی زبان بھی تھی، خط و کتابت کی زبان بھی تھی اور علم کی زبان بھی تھی۔ اس زمانے کا طبعی جغرافیہ، فاصلے، سفر کی دشواریاں، معاشرے کا غیر متحرک ہونا اور لوگوں کا عموماً ایک ہی جگہ قیام کرنا ایسے اسباب تھے جو صوبوں کے درمیاں لوگوں کے میل ملاپ کو پنپنے سے روکتے تھے۔ ایسی کیفیت صرف بین الصوبائی ہی نہیں تھی۔ ایک ہی صوبے کے اندر لوگ اپنی مقامی بولیوں ہی کے دائرے میں زندگی بسر کرتے تھے۔ پنجاب میں لاہور کا صوبہ ملتان کے صوبے سے الگ تھا اور دونوں کی زبان میں فرق تھا ڈاکٹر نذیر احمد کی رائے ہے کہ عہد اکبری کے ابتدائی دور میں لاہور اور ملتان کی زبان ایک تھی لیکن اٹھارہویں صدی میں لاہور کی زبان پر دوابہ کی زبان کے اثرات مرتب ہوتے گئے اور ملتان کی زبان اور لاہور کی زبان کا باہمی فرق بڑھ گیا۔[1]

مقامی زبانوں کے ایسے منظر کو دیکھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ان زبانوں کی لسانی نشوونما کا اصل سبب وہ علمی ماحول تھا جو اسلامی ہندوستان کے دوران رواج پایا تھا۔ اس ضمن میں اگر زبانوں کی ساخت پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کا اثر ان زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں دکھائی دیتا ہے۔ مضامین اور عنوانات، الفاظ کے اس پھیلتے ہوئے سلسلے کی مدد سے رونما ہوتے ہیں۔ اسی بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ مقامی زبانوں نے مختلف ادوار میں مکتوبی اور تحریری صورت اختیار کی تھی۔ یہ بات اس لیے ضروری ہے کہ مکتوبی صورت اختیار کیے بغیر زبان ادب کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی۔ غیر مکتوبی ادب لوک کلچر اور سینہ بسینہ روایت ہی کے مقام کی نشاندہی کرتا ہے اور زبانوں کے ارتقاء میں اس مقام کی حیثیت ابتدائی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے مقامی زبانوں کی تحریری اور مکتوبی صورت پندرہویں صدی کے آخیر میں دکھائی دیتی ہے۔ جب سلطان سکندر لودھی کی تعلیمی حکمت عملی کی

۱۔ مرحوم ڈاکٹر نذیر احمد نے ان باتوں کا اظہار راقم کے ساتھ ایک گفتگو میں کیا تھا۔

بدولت درس و تدریس کا سلسلہ عام ہوا تھا۔ اس امر کی طرف اس لیے اشارا کیا گیا ہے کہ زبانوں کی نشوونما کا بنیادی رشتہ علمی ماحول کے ساتھ ہوتا ہے۔ علمی ماحول ہی واحد ذریعہ ہے جو مضامین اور مسائل فراہم کرتا ہے۔ جن کے اظہار کے لیے زبانیں استعمال کی جاتی ہیں اور ان کی استعداد اور صلاحیت کو آزمایا جاتا ہے۔ تاہم اگر زبانوں کے مضامین کو پیش نظر رکھا جائے تو ایک نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ اردو کے سوا باقی زبانیں اس عہد کے ان اہم رویوں کو بیان کرتی ہیں جن کا بیشتر تعلق انسان کی عارضی زندگی سے ہے اور جو تصوف اور مقامی جغرافیے سے اپنا تخلیقی مواد اخذ کرتے ہیں۔ ایسے مواد کے مقابلے میں اردو اپنی دکنی زندگی کے دوران غزل اور مثنوی کو استعمال کرتی ہے۔ اس زبان کی "داستان عشق" (مثلاً قطب مشتری) میں مجاز اور حقیقت کے اشارے مقابلتاً زیادہ گہری معنویت اختیار کرتے ہیں تاہم دوسری علاقائی زبانوں کی شاعری تصوف کے تجربے کو جس والہانہ واردات کے طور پر قبول کرتی ہے وہ اردو شاعری میں کم دکھائی دیتا ہے۔ میر درد کے بعد اردو شاعری شہر آشوب کو بیان کرتی ہے جو علاقائی شاعری کے ادب میں مفقود ہے۔ ...... تاہم اگر ایسی ہی کیفیت کو ملحوظ رکھا جائے تو احساس ہوگا کہ علاقائی زبانوں اور اردو زبان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اپنی نشوونما کے دوران علاقائی زبانیں تصوف کے نظام اور داستانوں کے دائرے ہی میں اپنا اظہار تلاش کرتی رہی تھیں جبکہ اردو شاعری نے غزل کے ساتھ ساتھ شہر آشوب کو بھی اپنے مضمون کے طور پر منتخب کر لیا تھا۔ شہر آشوب کا مضمون دراصل ادب اور زندگی کے براہ راست رشتے کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایسے رشتے نے علاقائی زبانوں کے مقابلے میں اردو زبان کو زندگی کے مسائل سے دو چار کیا اور اردو زبان کی صلاحیت اور استعداد کی نشو ونما کے لیے ان گنت مواقع میسر آئے۔ زندگی کے ساتھ ایسا رشتہ قائم کرنے سے اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوا اور مضامین کی کثرتوں نے اردو زبان کو علاقائی ماحول سے آزاد کرکے تہذیبی ماحول کا حصہ بنا دیا۔ ایسے تہذیبی کردار کے سبب اردو زبان کا علمی، فکری اور ادبی ارتقا ممکن ہوا اور انیسویں صدی کے دوران اردو برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیبی زبان بن گئی۔

اسلامی ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی ارتباط و اختلاط سے جو زبان پیدا ہوئی اسے ایک طویل عرصے تک ہندوی کے نام سے پکارا گیا تھا جسے حافظ محمود شیرانی نے اردو ہی کا ابتدائی روپ قرار دیا ہے۔ تاہم اگر اسلامی ہندوستان کے دور میں مسلمانوں کے تمدن کے پھیلتے ہوئے سلسلے کا جائزہ لیا جائے تو یہ احساس ہوگا کہ جہاں کہیں مسلمانوں کا تمدن پہنچا، ہندوی ان کے

ہمراہ وہاں پہنچتی رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کو مقامی طور پر کسی دوسرے نام سے بھی پکارا گیا۔ پنجاب میں اس زبان کی صورت غیر منقسم رہی اور اگر یہ کہا جائے کہ پنجابی ہی ہندوی ہے اوراس طرح اردو زبان ہی کی ایک صورت ہے تو غلط نہ ہوگا۔ حافظ محمود شیرانی نے اس ضمن میں اٹھارہویں صدی کے دو شاعروں کی تحریروں کی طرف اشارا کیا ہے جن کے نام ہیں۔ نامدار خاں اور محمد غوث۔ ان شاعروں سے دو مرثیے منسوب ہیں جو سکھ سرداروں کی موت پر لکھے گئے تھے نامدار خاں نے رنجیت سنگھ کے دادا سردار چڑت سنگھ کی ناگہانی موت پر پنجابی میں مرثیہ کہا تھا اور محمد غوث نے سردار گوربخش سنگھ کی موت پر غم زدہ اشعار کہے تھے۔ ان دونوں مرثیوں کی زبان (۱۷۷۴ء اور ۱۷۸۳ء) لسانی اعتبار سے اس عہد کی اردو ہے۔ مثلاً چڑت سنگھ کے مرثیے کا ایک شعر یہ ہے۔

"افسوس ہے جہان کے ثبات و قرار پر
اس باغ بے وفا کی خزاں اور بہار پر"

اور گوربخش سنگھ کے مرثیے کا ایک شعر یوں ہے'

"بہار اندر آیا تھا باغ جہاں
قضاسوں پڑی جھول باد خزاں ۔۔۔۔"

اسی طرح بلّھے شاہ کا یہ مصرعہ "اب ہم گم ہوئے پریم نگر کے شہر" اور وارث شاہ کی غزل کا یہ شعر بھی قابل ذکر ہیں۔

"جس دن سے ساجن بچھڑے ہیں تس دن کا دل بیمار ہویا
اب کتھی بنا کیا فکر کروں گھر بار سبھی بیزار ہویا"[۵]

عہد اکبری کے مشہور پنجابی صوفی شاعر مادھولال حسین کا یہ مصرعہ بھی غور طلب ہے'

"ہائے ہائے جہان پکارتا ہے سمجھ کھیڈ بازی شاہ حسین پیارے"[۶]

اسلامی ہندوستان کے شمالی صوبے میں زبانوں کا لسانی منظر جہاں تہذیبی اثرات اور رابطوں کی نشاندہی کرتا ہے وہیں اس منظر سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ تہذیبی طور پر آگرہ دہلی اور لاہور میں ایک ہی لسانی فضا تھی اور مقامی زبانوں کے بدلتے ہوئے روپ اس سارے منطقے کو ایک تہذیبی وحدت میں منسلک کرتے تھے۔ تاہم اس سلسلے میں یہ بات اہم ہے کہ مقامی زبانیں شاعری ہی کے مضامین استعمال کرتی تھیں اور ان مضامین کے بدلتے ہوئے انداز کے ساتھ ان زبانوں کا مستقبل وابستہ تھا۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مقامی زبانوں کا مسلمانوں کے

علمی تمدن کے ساتھ رشتہ دو قسم کی مقامی زبانوں کو رونما کرتا تھا۔ ایک زبان وہ تھی جو پڑھے لکھے لوگ استعمال کرتے تھے اور دوسری زبان وہ تھی جسے ان پڑھ اکثریت بول چال کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اسلامی ہندوستان کی مقامی زبانوں میں ان دونوں لسانی رویوں کو بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے جب تک مقامی زبانیں پڑھے لکھے لوگوں کے استعمال میں رہیں اور مسلمانوں کےعلمی تمدن کا تخلیقی وقار قائم رہا، مقامی زبانوں کی لسانی اور فکری نشوونما ہوتی رہی اور جب یہ دونوں ضروری باتیں نامساعد حالات کے سبب متاثر ہوئیں مقامی زبانوں کے نشوونما کا سلسلہ رک گیا اور ان پر غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی چھاپ نمایاں ہوتی گئی۔ مقامی زبانوں کے ارتقا کے رکنے میں ان باتوں کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ پنجابی زبان کے سلسلے میں ایسا سانحہ اس وقت رونما ہوا جب لاہور کا رشتہ دہلی سے منقطع ہوا اور ستلج دریا کے اس طرف کا سارا علاقہ خالصہ شاہی کے تسلط میں آگیا۔ خالصہ شاہی کا تمدن مکتوبی اور تحریری نہ تھا اور نہ پنجاب کے نئے حکمرانوں کے پاس علم و حکمت ہی کی کوئی روایت تھی۔ ایسے حالات میں ہندوی کے اس لسانی ارتقا کا سلسلہ رک گیا جو اسلامی ہندوستان کو لسانی طور پر سیراب کر رہا تھا۔ اسلامی ہندوستان کے سیاسی وجود کے ٹوٹنے سے ہر علاقے کی مقامی زبان کا ارتقا متاثر ہوا اور زبانیں روایتی موضوعات اور مقامی لفظیات میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ ......

زبانوں کے بارے میں یہ امر نمایاں ہے کہ بول چال کی زبان کا دائرہ وسیع ہوتا ہے لیکن رسم الخط کے ذریعے جہاں زبان کی تحصیل کے لیے تعلیم و تدریس ضروری ہوتی ہے وہیں رسم الخط زبانوں کے تہذیبی منطقوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ یورپ کے لسانی منظر میں خلافت عثمانیہ اور یورپی ریاستوں کے درمیان کسی زمانے میں رسم الخط تہذیبی منطقوں کی نشاندہی کرتا تھا۔اور جدید ترکی کا رومن رسم الخط کچھ ایسے ہی انداز میں جدید ترکی کو یورپی تہذیبی منظر کا جزو بناتا ہے۔ اس اعتبار سے رسم الخط قوموں کے تہذیبی تشخص کی نمائندگی کرتا ہے۔ ...... اسلامی ہندوستان برصغیر کے جس لسانی ماحول میں ظاہر ہوا تھا اس کا رسم الخط دیوناگری تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے تہذیبی اثرات سے ہندوی کا جو لسانی مظہر رونما ہوا اسے رسم الخط کے ذریعے جداگانہ تشخص ملا۔ دیوناگری نے پنجاب کی مقامی زبان کو رسم الخط کے ذریعے دو الگ الگ تہذیبی منطقوں میں بانٹ دیا اور یوں گورمکھی اپنے الگ تشخص سے وابستہ ہوئی اور مسلم پنجاب کی زبان کا تشخص اس کے فارسی رسم الخط سے نمایاں ہوا۔ ایسے ہی رویے نے ہندوی کو ہندی بھاشا کی شکل دی اور مشرق میں پوتھی ادب کے بعد

بنگالی کا دیوناگری ادب ظاہر ہوا۔ رسم الخط اس اعتبار سے تشخص کو نمایاں کرتے ہوئے تہذیبی اکائیوں کی نشاندہی کرتا تھا اور تہذیبی گروہوں کے ورثے کی پہچان فراہم کرتا تھا۔ اس ضمن میں عددی اکثریت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری دکھائی دیتا ہے۔ برصغیر میں دیوناگری رسم الخط عددی اعتبار سے اکثریت کا رسم الخط تھا اور اسلامی ہندوستان کا اپنا تشخص جس رسم الخط سے نمایاں ہوتا تھا اسے استعمال کرنے والے اکثریت میں نہ تھے۔ اس امر کی موجودگی میں مسلمانوں کی قومیت کے تصور کو رسم الخط کے تقدس سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی ہندوستان میں اگرچہ علم و تدریس کی روایت عربی اور فارسی علوم سے اکتساب کرتی تھی اور مدرسوں میں اسلامی ہندوستان کے باشندے بغیر کسی امتیاز کے علم سے فیض یاب ہوتے تھے اور مقامی زبانیں ایسے علمی طرز احساس کی نشاندہی کرتی تھیں تاہم رسم الخط اسلامی ہندوستان کو تقسیم کرتا تھا۔ دیونا گری سے ہندوؤں اور ہندو آرتھک رویوں کا تشخص مستحکم ہوتا تھا اور فارسی /عربی رسم الخط کے ساتھ مسلمانوں کا تہذیبی وجود آشکار ہوتا تھا۔ اسلامی ہندوستان میں رسم الخط کے ذریعے دو تہذیبیں باہم کارفرما دکھائی دیتی ہیں۔ جن کے دھارے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔

مقامی زبانوں کے اس لسانی نقشے میں سندھی کا تذکرہ اس اعتبار سے بھی توجہ طلب ہے کہ سندھ میں مقامی باشندوں کی غالب اکثریت نے پندرہویں صدی کے دوران اسلام قبول کیا تھا۔ اس وسیع روحانی انقلاب نے جہاں بے حد گہرے اثرات مرتب کیے وہاں سندھی زبان کو مستقل طور پر عربی رسم الخط فراہم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام قبول کرنے سے قبل سندھی زبان بھی دیوناگری رسم الخط استعمال کرتی تھی۔ ۱۵۵۰ء سے ۱۷۹۱ء تک سندھی زبان بھی عربی اور فارسی کے زیر اثر ارتقا پذیر ہوتی رہی جس طرح اسلامی ہندوستان کی دوسری مقامی زبانیں متاثر ہوئی تھیں لیکن جب کلہوڑا حکمرانوں نے خود مختار حیثیت اختیار کی تو سندھی زبان کا مقام بھی بدلا اور فارسی کے ساتھ یہ زبان بھی زندگی کے کاروبار میں شامل ہوئی لیکن اس دوران اس زبان کا زیادہ تر استعمال شاعری ہی میں ہوتا رہا۔ ۱۷۸۳ء کے بعد تالپور حکمرانوں کے عہد میں سندھی شاعری کو بہت فروغ حاصل ہوا لیکن علمی زبان بدستور فارسی رہی۔ تاہم جب ۱۸۴۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے سندھ پر فوج کشی کرکے اسے اپنی سرکار میں شامل کر لیا، سندھی زبان کو چھوٹی عدالتوں اور کچہری کی زبان بنا دیا گیا اور سندھ کو بمبئی کے صوبے میں شامل کیا گیا۔

جس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے سندھ کو فتح کیا تھا اس وقت کمپنی

کی زبان کے بارے میں پالیسی نمایاں نہ تھی۔ کمپنی کا بڑا مقصد اپنے مقبوضات کی وسعت ہی تھا اور الحاق کی پالیسی اس کی حکمت عملی میں بے حد اہم تھی۔ شمالی ہندوستان اس وقت تک کمپنی کے دائرۂ اقتدار سے باہر تھا کیوں کہ دریائے ستلج کے شمالی علاقے خالصہ شاہی کی قلمرو میں شامل تھے ۔ اس لیے جہاں دربار لاہور نے پنجاب کو دلّی سے منقطع کر دیا تھا اور گورمکھی نمایاں ہوئی تھی، کچھ اسی طرح سندھ میں سندھی ظاہر ہوئی لیکن اس فرق کے ساتھ کہ سندھ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور سندھی زبان کلہوڑا اور تالپور حکمرانوں کے دور میں بھی برابر زیر استعمال تھی۔ سندھی زبان کا لسانی کردار اس اعتبار سے بھی قابل غور ہے کہ ہندوی کا جو ارتقائی سلسلہ لاہور اور دہلی کے مابین دکھائی دیتا تھا سندھی اس لسانی منظر سے ہٹ کر تھی۔ طبعی جغرافیے کے حوالے سے حیدر آباد، میر پور اور خیر پور کا براہ راست رابطہ دہلی کے ساتھ جس گزرگاہ کے ذریعے قائم ہوتا تھا وہ شمالی علاقے سے نہیں گزرتی تھی۔ تاہم اسلامی ہندوستان کے دور میں سندھی زبان اور اس کے عربی رسم الخط نے سندھ کو اس کا مسلم تشخص برابر فراہم کیا اور سندھ کو راجستھان کے علاقے میں جداگانہ مقام دیا۔ راجستھانی زبانوں کے رسم الخط اور سندھی زبان کے رسم الخط نے تہذیبی تشخص کے دو واضح رویے قائم کیے جو اسلامی ہندوستان کے عہد میں اس منطقے کے تہذیبی وجود کی نشاندہی کرتے تھے۔

برصغیر کے شمالی علاقوں کی دوسری مقامی زبانیں مثلاً پشتو، پوٹھوہاری، گوجری اور کشمیری اپنے لسانی ارتقا کے دوران میں مسلمانوں کے تہذیبی ورثے سے اسی طرح فیض یاب ہوتی رہی تھیں جیسے دوسری مقامی زبانوں میں ممکن ہوا تھا۔ ان زبانوں میں بھی زیادہ تر شاعری اور مضامین شجاعت و تصوف ہی کو بیان کیا گیا تھا۔ تاہم اس ضمن میں یہ بات اہم ہے کہ نثری تحریروں میں مقامی زبانوں کا حصہ دکھائی نہیں دیتا۔ اسلامی ہندوستان میں نثری تحریروں کے لیے فارسی ہی کو استعمال کیا جاتا تھا اور فارسی ہی کو علمی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اس سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ زبانوں کی استعداد اور صلاحیت کو صرف نثری تحریریں ہی وسیع تر کر سکتی ہیں کیوں کہ نثری تحریروں کے تقاضے زیادہ وسعت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر اسلامی ہندوستان کی مقامی زبانوں کے ارتقائی سلسلے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان مختلف زبانوں میں سے جس زبان نے سب سے پہلے نثری تحریروں کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا وہ اردو زبان ہی تھی جسے آمد اسلام کے زمانے میں ہندوی کہا جاتا تھا۔ اس زبان کی ساخت، اس کی املا، حروف تہجی، قواعد، صرف اور نحو کے اصول اور ذخیرۂ

الفاظ کی وسعت مسلمانوں کے تہذیبی شعور کا نتیجہ تھے اور اس کا رسم الخط مسلمانوں کے تہذیبی تشخص کی علامت تھا۔ دیوناگری رسم الخط کے لسانی ماحول میں اردو زبان اسلامی ہندوستان کی مقامی زبانوں کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتی ہے۔

دوسرا حصّہ

۵- اردو زبان - ملّی کردار کی ذمہ داریاں

اسلامی ہندوستان کے آخری زمانے میں جہاں مسلمانوں کے علمی تمدن کے زیر اثر عربی اور فارسی رسم الخط کی مقامی زبانیں رونما ہوئیں وہیں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مقامی زبانیں تعلیم و تدریس کا ذریعہ بھی بنتی گئیں اور مکتب و مدرسہ کی ابتدائی تعلیم میں مذہبی اور علمی زبانوں کی تدریس کے ساتھ مقامی زبانوں کو بھی تدریسی عمل میں شامل کیا گیا۔ طلباء کو پڑھانے کے لیے مقامی زبانیں بروئے کار آئیں۔ اس طرح ان زبانوں کو پہلی بار تدریسی ذمہ داریوں میں شریک کیا گیا۔ حافظ محمود شیرانی کے مطابق ایسا تدریسی سلسلہ پنجاب، دہلی اور دکن میں ظاہر ہوا تھا۔ سترہویں صدی کے دوران مقامی زبانوں کا تدریسی کردار رونما ہوا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں (وفات ۱۷۰۷ء) طلباء کی تدریسی ضرورتوں کے لیے مقامی زبانوں میں منظوم کتابیں لکھی گئیں اور اردو املا کو تحریری تقاضوں کے لیے معیاری صورت دی گئی۔ اردو کی تحریری اور معیاری صورت کے بارے میں اورنگ زیب عالمگیر کے مشوروں کی بڑی اہمیت تھی۔ مقامی زبانوں کے ارتقا کے لیے اورنگ زیب عالمگیر کا عہد حیات آفریں تھا اور اس زمانے کے مقام نظر سے اسلامی ہندوستان کا لسانی مستقبل بلاشبہ درخشاں دکھائی دیتا ہے۔ تاہم مقامی زبانوں کے لسانی مستقبل کو برصغیر کے سیاسی حالات سے کسی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران جو کچھ برصغیر کے مسلمانوں پر وارد ہوا اس کی شکست و ریخت سے اسلامی ہندوستان کی مقامی زبانیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ سیاسی حالات نے جہاں حکمرانوں خانوادوں اور ریاستوں کے نقشے تہ و بالا کیے وہیں مقامی زبانوں کے باہمی رشتے بھی ٹوٹ گئے اور زبانیں ایک نئے زمانے اور نئے ماحول سے دوچار ہوئیں۔ ---- جس کے نتیجے میں زبانوں کی استعداد اور صلاحیت اظہار پر بڑا اثر پڑا اور کئی مقامی زبانوں کی نشوونما رک گئی۔ ان کے مضامین قدامت کا شکار ہوئے اور عمرانی اعتبار سے وہ زبانیں لوک کلچر اور لوک ورثے کے زمرے میں شامل ہوگئیں۔

زبانوں کے ارتقا میں جہاں لوگوں کی بولی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور علمی تمدن کا ماحول بھی ضروری ہے وہاں اس ضمن میں شہروں کی نفسیات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ زبانوں کے ارتقا میں شہروں کی حیثیت عموماً مرکزی ہوتی ہے۔ اسلامی ہندوستان کی مقامی زبانوں کا تعلق جن شہروں کے ساتھ تھا ان شہروں کی تمدنی اور تہذیبی فضا سے مسلمانوں کا اثر زائل ہوا۔ ان

شہروں کی علمی حیثیت تباہ ہوگئی اور تمدن کے حلقے بکھر گئے۔ ایسی کیفیت کو پنجاب میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد پنجاب خالصہ لشکریوں کی آماجگاہ بن گیا اور پنجاب کے بیشتر اہم شہر، جو علمی مراکز بھی تھے، خالصہ یلغار کی زد میں آگئے۔ لاہور شہر کو بلّھے شاہ کی عمر کے آخری دنوں میں جلا دیا گیا۔ سرہند کے اسلامی تشخص کو بری طرح مٹانے کی کوششیں کی گئیں۔ ملتان کو خالصہ شاہی میں شامل کیا گیا۔ سیالکوٹ پر پہلے پہاڑی ہندو راجے حاکم ہوئے، پھر رنجیت سنگھ کا قبضہ ہوا۔ قصور، جھنگ، ڈیرہ جات، پشاور اور کشمیر -------- یہ سارا وسیع علاقہ مسلمانوں کے تمدنی اثر سے برابر کٹتا چلا گیا۔ مرہٹوں، پنڈاروں اور دوسرے مہم جُو لشکریوں نے اسلامی ہندوستان کے تمدنی سکون کو تہ و بالا کر دیا۔ مشرق کے صوبوں میں مرشد آباد کا وقار ختم ہوا اور ایسٹ انڈیا کمپنی بھی اس عالیشان عمارت کے انہدام میں شریک ہوگئی جسے اسلامی ہندوستان کا نام دیا جاتا تھا۔ ------- اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اور ڈیڑھ سو برسوں کے دوران پرانے شہر اور پرانے علمی مراکز تباہ ہوئے اور نئے شہر اور نئے علمی مراکز قائم ہوئے۔

برصغیر کے شمال مغربی علاقوں کا جائزہ لیتے ہوئے جہاں ان سب باتوں کا علم ہوتا ہے جن کا ذکر کیا گیا ہے وہیں ایک بدلی ہوئی لسانی اور ادبی صورت حال کا علم بھی ہوتا ہے۔ پشتو کے لسانی علاقے میں روایتی مضامین ہی کے دائرے میں لوک شاعری کا سلسلہ جاری رہا لیکن مسلسل جنگوں کے سبب اس لسانی منطقے کی زبان گفتگو ہی کی زبان رہی۔ بلوچی علاقے میں مقامی زبان بول چال ہی کی زبان تھی اور اس کا شعری سرمایہ زبانی روایت پر مشتمل تھا۔ سندھی میں بھی روایت ہی کے مضمون برابر باندھے جاتے رہے لیکن تالپور حکمرانوں کے زمانے میں (۱۷۸۳ء - ۱۸۴۳ء) غزل، مرثیہ اور طنز مزاح کے عنوان پر شعر گوئی ہوتی رہی۔ سچل سرمست (وفات ۱۸۲۶ء) کا زمانہ اس روایت کی مقابلے میں جدید دکھائی دیتا ہے جس کی طرف پہلے اشارا کیا گیا ہے۔ پنجاب میں خالصہ دربار کا شعری ذوق روایتی رہا جس میں مغلیہ لاہور کے شاعروں ہی کا ذکر برابر جاری تھا۔ بلھے شاہ اور وارث شاہ کو خالصہ دربار نے کلاسیک کا مقام دے کر پنجاب کی مغلیہ شعری روایت کو استحکام بخشا۔ اس دور کے شاعر علی حیدر (وفات ۱۷۸۵ء) اور شاہ ہاشم (وفات ۱۸۲۳ء) کی شاعری علاقائی مضامین ہی کو بیان کرتی ہے۔ ------- تاہم جہاں تک زبانوں کی نئی ذمہ داریوں کا تعلق ہے ان زبانوں میں ایسی ذمہ داریوں کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ یہ زبانیں ایک جامد معاشرے کے طے شدہ ذوق ہی کی پیروی کرتے دکھائی دیتی ہیں۔ اوران کی صلاحیت اظہار ۱۸۳۰ء سے قبل

شعری دائرے سے باہر کسی اور مضمون کو بیان کرتے نظر نہیں آتی۔ ان مقامی زبانوں میں نثر یکسر ناپید ہے۔

اس امر کے باوصف کہ مقامی زبانیں عہد اورنگ زیب کے بعد کسی ارتقائی سلسلے کی نشاندہی نہیں کرتیں اور یہ کہ شہروں کا تمدنی نقشہ برابر بدلتا ہے اور عموماً غیر تخلیقی دکھائی دیتا ہے۔ یہ حقیقت بہرحال غور طلب ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران ان زبانوں نے مسلمانوں کے تمدن اور علمی ورثے کو شعری صورت میں محفوظ رکھا اور اسے لوک ورثے کی گہری محسوساتی معنویت فراہم کی۔ زمانے کے بدلتے ہوئے مناظر میں مقامی زبانوں کی شاعری کی اہمیت اس امر میں بھی ہے کہ اس شاعری کے ذریعے مسلمانوں کی ملّی یادداشت برابر قائم رہی - جنگ نامے، مرثیے ، کافیاں، واریں، دوہے اور ٹپے، قصے اور داستانیں، اس اعتبار سے برصغیر کے اس عہد کی برابر نشاندہی کرتے ہیں جب اس برصغیر پر مسلمانوں کی حکومت تھی اور ایک ایسا علم مدرسوں کے ذریعے معاشرے تک پہنچتا تھا جو بندے اور خدا کے رشتے کو اہم گردانتا ہے۔ مقامی زبانوں کی شاعری نے اسلام کے ساتھ لوگوں کی محبتوں کو برابر قائم رکھا اور سیاسی، معاشرتی اور عمرانی ابتلاء کے صبرآزما دور میں مسلمانوں کی ملّی انا کو استقامت فراہم کی۔ اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب ہے کہ مقامی زبانوں نے برصغیر کے طول و عرض میں اور انتہائی دور افتادہ قریوں اور علاقوں میں مسلمانوں کے ملّی تشخص کو مضبوط کیا، مناجات، نعت گوئی اور مرثیے کے ذریعے اپنے علاقوں کے روحانی رشتوں کی پاسداری کی اور عیسائی مشنریوں کی تبلیغی یلغار کے آگے تحفظ ملت کے فرائض کو بدرجہ احسن نبھایا۔ اگر علاقائی زبانوں کا تہذیبی شعور اس درجہ گہرا نہ ہوتا تو قومیت کی تشکیل کے لیے دشواریاں بڑھ جاتیں۔ مقامی زبانوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے لاشعور میں برابر آباد رکھا اور ان کی ملّی یادداشتوں کو بکھرنے سے بچایا۔

مقامی زبانوں اور سیاسی حالات کے اس بڑے پس منظر میں عہد اورنگ زیب کے بعد بائبل کا اردو اور فارسی رسم الخط میں ترجمہ جسے ڈاکٹر شلز نے ۱۷۴۷ء میں مکمل کیا تھا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں(اس زمانے میں) اردو زبان بہت حد تک ایک باقاعدہ زبان بن چکی تھی۔ بائبل کے اردو ترجمے کی غالباً ضرورت اس لیے بھی پیش آئی تھی کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد اسے پڑھ اور سمجھ سکتی تھی۔ اس زبان کا مقام ایک ایسی زبان کا تھا جو بین الصوبائی تھی اور جسے باہر سے آنے والے یورپین بھی سیکھ رہے تھے۔ اسی صدی کے دوران ایسے انگریز اور یورپین افراد بھی دکھائی دیتے ہیں جو اردو زبان میں

مشق سخن کرتے تھے۔ تاہم اسی زمانے میں جب دوسری مقامی زبانیں اپنے طبعی اور لسانی جغرافیے میں محصور اور محدود ہوتے دکھائی دیتی ہیں۔ اردو زبان نہ صرف نئے علمی مراکز کے قیام کی خبر دیتی ہے اور دہلی سے لکھنؤ اور کلکتےکی طرف پھیلتے نظر آتی ہے بلکہ اس زبان کے مکالماتی حلقے میں غیر ملکی افراد کے شامل ہونے کا احساس بھی ہوتا ہے۔ پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں کے بعد جہاں اردو زبان کے دو ادبی مرکز دلی اور لکھنؤ اس زبان کی تخلیقی استعداد میں اضافہ کرتے ہیں وہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں فارسی کے ساتھ اردو بھی نمایاں ہوتی ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر اپنے ملازمون کےلیے اردو کی تحصیل ضروری سمجھتے ہوئے فورٹ ولیم کالج کے قیام کی منظوری دیتے ہیں۔ اس طرح اردو زبان کی نشوونما میں کلکتہ شہر شامل ہوا اور جدید نثری روایت کی ابتدا ہوئی۔ یہ کیفیت دیکھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ اردو زبان کی اپنی نشوونما میں وہ رویے برابر موجود تھے جو اسے بدلتے ہوئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار کرتے تھے۔ سلیس زبان کااستعمال اور نفس مضمون کے ابلاغ کی اہمیت -------- اٹھارہویں صدی کے آخر میں قرآن کریم کا اردو ترجمہ بھی ایسے ہی اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس زمانے میں نثر کا رونما ہونا اردو زبان کی نئی ذمہ داریوں کے شدید احساس کو نمایاں کرتا ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی غورطلب ہے کہ مغلیہ ہندوستان (جسے تاریخی طور پر اسلامی ہندوستان سے موسوم کیا جاتا ہے) اہل یورپ کی نظر میں عالم اسلام ہی کا ایک حصہ تھا۔اس لیے فرنگی نوواردوں کے لیے فارسی کے بعد اردو ہی واحد لسانی ذریعہ تھی جو ذخیرۂ الفاظ اور رسم الخط کے اعتبار سے ان کے لیے کوئی مسائل پیدا نہیں کرتی تھی۔ پلاسی کی جنگ کے کافی عرصہ بعد انگریز سنسکرت اور ہندی سے آشنا ہوئے تھے۔ تاہم ابتدا میں عیسائی مشنری جس تعصب کا اظہار ہندوؤں کے بارے میں کرتے تھے وہ مسلمانوں کے بارے میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسا تہذیبی رشتہ اردو زبان کے ارتقا کے سلسلے میں قابل توجہ ہے۔ مغربی علوم کی تدریس کے مراکز (جن میں مرحوم دلی کالج بھی شامل ہے) سائنس کی تعلیم کے لیے اردو زبان استعمال کرتے تھے۔ اور یہ ایک نیا تقاضہ تھا جس کے ساتھ اردو زبان کی استعداد اور صلاحیت اظہار میں اضافہ ہوا۔ ایسا ماحول برصغیر کی ان مقامی زبانوں کو دستیاب نہیں ہوا تھا جو اپنے جغرافیے میں محصور تھیں اور نئے علمی شعور سے بے تعلق تھیں۔ اسی ضمن میں مرثیے کا عروج اور دربار لکھنؤ میں ڈرامے کی تحریک ایسے عوامل بھی ہیں جو اردو زبان کی صلاحیت اظہار کو اعتماد فراہم کرتے ہیں۔ یہ زبان با وقار انداز میں ادب کی زبان بنتے ہوئے ابلاغ عامہ کی ذمہ

داریوں کو قبول کرتے دکھائی دیتی ہے۔ ان ذمہ داریوں سے اردو زبان کے ملّی کردار کے اجزائے ترکیبی ظاہر ہوتے ہیں۔

اردو زبان کے ملّی کردار کی وضاحت کے لیے برصغیر کے مسلم تمدن میں زبان اور معاشرے کے رشتے کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ ادب کے دائرے میں مشاعرے کی روایت بھی قابل ذکر ہے۔ اسی طرح مرثیہ خوانی، مجالس محرم، جمعے کے اجتماع اور وعظ، میلاد کی محفلیں، عیدین کے خطبے اور مذہبی موضوعات پر علماء کی تقریریں، ایسے نمایاں تمدنی ادارے تھے جہاں اردو زبان براہ راست معاشرے سے خطاب کرتی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز ہی میں اردو زبان ذریعۂ ابلاغ کے طور پر ظاہر ہوئی تھی اور جن اداروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے رابطے سے مسلم معاشرے کے ساتھ ہمکلام ہونے کی صلاحیت اختیار کر چکی تھی۔ ہر چند کہ خط و کتابت، ابتدا میں بدستور فارسی زبان ہی میں کی جاتی تھی لیکن عام گفتگو اور مجلسی تقاضوں اور ضرورتوں کے لیے اردو کااستعمال ناگزیر ہو چکا تھا ۱۸۲۶ء کے ارد گرد سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور اس کی دعوت عمل کا ذریعۂ اظہار بھی اردو زبان تھی اور ۱۸۵۷ء کے سانحے کے دوران، جو اشتہار چھاپے گئے اور جن میں رعایا سے کہا گیا تھا۔ کہ وہ بادشاہ کی فوج میں شامل ہوں اور کمپنی کی ملازمت نہ کریں ان اشتہاروں کی زبان بھی اردو تھی۔ اسی طرح مرحوم دلّی کالج کی زبان اردو تھی اور ۱۸۵۷ء سے قبل مسلم صحافت کی زبان بھی اردو تھی جو اپنے قارئین کو آشوب ملّت سے آگاہ کرتی تھی۔ اس ضمن میں مولوی محمد باقر کے " دہلی اردو اخبار" کا ملّی کردار مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔

اگر ۱۸۵۷ء سے قبل زمانے کا جائزہ لیا جائے اور اردو زبان کے کردار کی پہچان کی جائے تو جہاں اردو زبان فورٹ ولیم کالج کے حوالے سےکلکتہ میں دکھائی دیتی ہے اور اس کی تدریسی ذمہ داریوں کا بخوبی علم ہوتا ہے وہیں اس امر کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ اردو زبان کا دائرہ ابلاغ بہت حد تک طے ہو چکا تھا اور وسیع تر مکالمے کے لیے اس زبان کو بخوبی استعمال کیا جا سکتا تھا تاہم یہ ذمہ داریاں گفتگو اور مکالمے سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن الحاق اودھ (۱۸۵۶ء) کے بعد اور ۱۸۵۷ء کے واقعات کے دوران اردو زبان سیاسی اعتبار سے پہلی بار ملّی کردار کی ذمہ داریوں سے دو چار ہوتے دکھائی دیتی ہے۔ اس زبان کے ذریعے قارئین اور سامعین کو ملّی آشوب سے آگاہ کیا گیا اور اسی زبان نے لوگوں کو کمپنی کے خلاف صف آراء ہونے کی تلقین کی اور اسی زبان کے لسانی چہرے پر وہ زخم ظاہر ہوئے جو ۱۸۵۷ء کے واقعات کے نتیجے میں مسلمانوں کو سہنے پڑے

جن کی نشاندہی غالب کے مکتوبات اوراس عہد کی شاعری کرتی ہے۔ ملی آشوب اور ملی وقار کے زوال کی روداد اردو زبان بیان کرتی ہے اور ایسی گواہی کو محفوظ کرنے میں برصغیر کی مقامی زبانوں میں اردو سرفہرست ہے۔ ملت اسلامیۂ ہند کی روداد بیان کرنےکی ان ذمہ داریوں سے اردو زبان کا ملی کردار مرتب ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کی جدید تاریخ کے ساتھ ہی اردو زبان کا ملی کردار نمایاں ہواتھا۔ ۱۸۵۸ء کے بعد مسلم معاشرے کے جن تہذیبی اداروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی وساطت سے اردو زبان نے اپنے ملی کردار کو برابر وسیع سے وسیع تر کیا۔ اسی زبان کے سہارے برصغیر کے مسلمانوں کی دھڑکن دور و نزدیک ہر طرف سنی گئی اور برصغیر کے وسیع و عریض خطۂ زمین پر آباد مسلمان آشوب ملت کی کیفیت سے روز افزوں آگاہ ہوتے گئے۔ ان حالات کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو زبان نے مسلمانوں کے آشوب کی آگہی سے اپنا کردار اخذ کیا تھا اور ملی ذمہ داریوں نے اس زبان کی صلاحیت اظہار کی باقاعدہ تربیت کی تھی۔ برصغیر میں مسلمانوں کے احیاء کی زبان اردو بن چکی تھی!

اردو زبان کے ملی کردار کےضمن میں برصغیر کی مسلم صحافت کی خدمات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ۱۸۵۳ء میں اردو زبان کے اخبارات کی تعداد ۳۵ تھی۔ جن میں مولوی محمد باقر کا دہلی اردو اخبار سرفہرست تھا تاہم ۱۸۵۸ءمیں انگریزوں کی مسلمان دشمنی کے نتیجے میں گو اخباروں کی تعداد گر کر ۱۲ رہ گئی، لیکن ان اخباروں میں صرف ایک اخبار کی ادارت ایک مسلمان کے پاس تھی۔ اس ابتدائی دور میں ورنیکلر پریس میں مسلمانوں کی ملی آواز، نئے حالات کے جبر کے تحت، مفقود ہوچکی تھی۔ ان صبرآزما حالات میں سرسید جہاں اصلاح ملّت کے لیے لفظ اور عمل کو بروئے کار لائے وہیں انہوں نے اردو زبان کی وساطت ہی سے اس تاریخ ساز جد وجہد کی پاسداری کی۔ تہذیب الاخلاق اور "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کی خدمات بے حد اہم ہیں۔ ان کے علاوہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا فورم بھی اردو زبان کے ملی کردار کی مرکزی اہمیت کا حامل تھا۔ سرسید کے خطبات، ان کی تحریریں اور علی گڑھ تحریک کے اکابرین کی علمی خدمات اور قومی موضوعات پر نظمیں، جن میں حالی کی مسدس نمایاں تھی، ایسے قابل قدر ذرائع تھے جن کی وساطت سے اردو زبان کا ملی کردار برابر واضح ہوتا گیا اور یہ زبان برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندہ زبان بنتی گئی۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی صورت حال اور ان کی تمدنی اور تہذیبی زندگی کے جن پہلوؤں کو اردو زبان نے اپنے قارئین اور سامعین تک پہنچایا اور یہ ابلاغ نہایت جامع اور مکمل تھا وہ کسی دوسری مقامی زبان کے حصے میں مطلق دکھائی نہیں

دیتا۔ مسلمانوں کی ترجمانی کاکام اور ان کےملی عزائم کی نشرو اشاعت اردو زبان کا مقدر بن چکی تھی۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصےمیں اردو زبان برصغیر کے مسلمانوں کی ملی زبان تھی اور مسلمانوں کے آشوب کی پہچان، اس آشوب کے ساتھ وابستہ مسائل، مسلمانوں کی تحریکوں کا اعلان اور ان کی روداد، مسلمانوں کے احیاء کی جدوجہد، آزادی اور قیام وطن کی تحریک کی نشرو اشاعت ---- ان تمام محاذوں پر اردو زبان ہی کی موجودگی دکھائی دیتی ہے-------

۱۸۵۷ء کے سانحے کے نتیجے میں جو دنیا رونما ہوئی تھی وہ مسلمانوں کی دنیا نہیں تھی اور نہ اس دنیا کا کوئی تعلق ماضی کے اسلامی ہندوستان سے تھا۔ حقیقت میں یہ دنیا اسلامی ہندوستان کے انہدام سے پیدا ہوئی تھی اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے خاتمے سے اس نئی دنیا کے خدوخال ظاہر ہوئے تھے۔ اس دنیا کے ساتھ جہاں مسلمانوں کے نئے رشتوں کا استحکام اس زمانے کی ضرورت تھا جسے سرسید اور ان کے رفقاء کی کوششوں نے پورا کیا وہیں ایسے نامساعد حالات میں علوم اسلامیہ کا تحفظ بھی اشد لازمی تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور دوسرے بے شمار دینی مدرسوں نے اسلامی علوم کو محفوظ کیا اور ان کی نشرو اشاعت، تعلیم و تدریس میں اردو زبان کو ذریعہ بنایا۔ اس اعتبار سے اردو زبان کو دینی ذمہ داریوں کے نبھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ تاہم یہ صرف اس زمانےکی دشواریوں کا ایک پہلو تھا جسے اردو زبان اور علمائے کرام نے بہ احسن نبھایا اورکامیاب ہوئے۔ لیکن ان غیر موافق حالات میں عیسائی مشنریوں کی تبلیغی یورشیں بھی تشویش ناک تھیں۔ عیسائی مشنریوں کا رویہ ۱۸۵۷ءکے بعد جارحانہ بن چکا تھا اور وہ مسلمانوں کو اپنا دشمن تصور کرتے ہوئے انتقاماً مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کی مہم میں اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ مصروف تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں نے تحفظ دین اور حقانیت اسلام کو ملی وجود کے لیے اہم قرار دیا اور اردو زبان اس فرض کی تکمیل کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائی۔ مناظرے، اشتہارات، پمفلٹ اور کتابیں، حقانیت اسلام کے بارےمیں کتابیں، سیرت مقدسہ کے بارےمیں تحریریں منظر عام پر آتی رہیں اور اردو زبان کے ذریعے دین کی صداقتوں کاتذکرہ جاری رہا۔ عیسائی مشنریوں کی یلغار کے ساتھ ہی آریہ سماج نے بھی مسلمانوں سے دینی امور پر جنگ آزمائی کی ابتدا کی اردو زبان اس رزم آرائی کے دوران استدلال، دلیل و برہان، سند اور حوالہ جات، تفسیر اور تاویل اور مسائل و معقولات کے علمی اصولوں اور اصطلاحوں سے مستفید ہوئی۔ اس کی استعداد میں‌بے پناہ اضافہ ہوا۔ تاہم اردو زبان کی پختگی محل نظر نہ تھی۔ اردو زبان نے مسلمان گھرانوں کو دین

اسلام کی حقانیت کے بارے میں اعتماد فراہم کیا اور مسلمانوں کے ملی وجود کو استحکام دینے میں اپنا کردار برابر ادا کیا۔ تاہم یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ اس سارے عرصے میں یہ فرض صرف اردو زبان ہی کے ذمے تھا۔ دوسری مقامی زبانیں ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کی قوت سے ناآشنا تھیں۔ مسلمانوں کے ملی وجود کے استحکام کے ضمن میں اردو زبان کی ان خدمات کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمانوں کے لیے ۱۸۵۷ء کے بعد رونما ہونے والی دنیا نفسیاتی بحران کی دنیا بھی تھی جس نے مسلمانوں کے قویٰ پر بڑے گہرے نشان مرتب کیے تھے اورمایوسی کی فضا نے اُن کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ اس صورت حال کو مثبت طور پر بدلنے کے لے اور مسلمانوں کے ملّی وجود کو مستحکم کرنے کے لیے عظمت رفتہ کی نشرواشاعت کے رویے مرتب ہوئے۔ برصغیر میں مسلمانوں کے اقتدار کا ذکر عام ہوا۔ ان کی عظمت کا تذکرہ ہوا۔ مسلمانوں پر جو افتاد پڑی تھی اس کی دردمند روداد سنائی دی۔ تاریخی ناول لکھے گئے، تاریخی کہانیاں چھپنے لگیں اور اس طویل منظر میں عالم اسلام کی عظمت کے کئی مظہر دکھائی دینے لگے۔ خلافت عثمانیہ اور تاریخ اندلس نے مسلمانوں کو ایک نیا تاریخی شعور دیا۔ اس تاریخی شعور کو پیدا کرنے میں اردو زبان ہی واحد لسانی ذریعہ تھی جو برصغیر کے طول و عرض میں مسلمان گھرانوں سے براہ راست خطاب کر سکتی تھی۔ اگر اردو زبان موجود نہ ہوتی تو نہ مسلمانوں کا ملی وجود ہی مستحکم ہو سکتا تھا اور نہ وہ تاریخی شعور ہی مسلمانوں کی ملّی حیات کو سیراب کر سکتا تھا جس کے ساتھ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور جدوجہد کا گہرا تعلق تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جہاں وہ دنیا رونما ہوئی تھی جس میں حکومت انگریزوں کی تھی اور ملازمتیں اور اختیارات ہندوؤں کے پاس تھے، وہیں اس دنیا کے عمومی ماحول میں مسلمانوں کی حالت پسماندہ افراد کی تھی۔ جن بڑے بڑے اثرات کا عموماً اس زمانے میں ذکر کیا جاتا تھا ان سے خارجی ماحول مرتب ہوتا تھا۔ مسلمان اگر اپنے زخموں کو رو سکتے تھے اور یادداشتوں کا تذکرہ کر سکتے تھے تو وہ صرف گھر کی چار دیواری میں تھا۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کی اصل پناہ گاہ ان کا گھرانہ تھی۔ اردو زبان نے مسلم گھرانے میں داخل ہو کر ملی رویوں کی تربیت کی اور خاص طور پر تعلیم نسواں کے ذریعے عورتوں کو بھی اس ملی شعور میں شامل کیا جو اس زمانے میں اردو زبان کی وساطت سے مسلمانوں کی صفوں میں ارتعاش پیدا کرتا تھا۔ مراۃ العروس کو اس سلسلے میں نقش اول کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر عورتوں کی تعلیم کی طرف دھیان ممکن نہ ہوتاتو معاشرے کے اندر

ملی شعور کی خاطر خواہ تربیت نہ ہوتی۔ عورتوں کے جرائد اس ضمن میں واقعی تعریف کے قابل تھے اور مسلم معاشرے میں ان کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ لاہور سے محمدی بیگم کے تہذیب نسواں، اور دہلی سے عصمت کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ان رسالوں کے اثرات نے خواتین میں ملّی شعور کو پختہ کیا۔

اس زمانے میں اگرچہ انگریزی تعلیم کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ پھر بھی اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں اردو زبان کا درسی مقام نمایاں تھا۔ سائنس کے ابتدائی مضامین، ریاضی، الجبرا اور جیومیٹری، تاریخ اور جغرافیہ اردو میں پڑھائے جاتے تھے(شمالی ہندوستان میں نصاب تعلیم کی صورت ایسی تھی) جن کے ذریعے اردو زبان میں اصطلاح سازی کی ابتدا ہوئی لیکن تعلیم کا طریق کار حقیقت میں مختلف تھا۔ اردو زبان مڈل تک لازمی تھی لیکن ثانوی درجے میں اسے اختیاری مضمون کا مقام حاصل تھا۔ اعلیٰ تعلیم کی درس گاہوں میں اردو بہ طور مضمون موجود نہ تھی۔ ایک طویل عرصے کے بعد اس زبان کو معمولی سا مقام دیا گیا اور اسے آپشنل (اختیاری) کا درجہ دیا گیا۔ انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے میں پچاس نمبروں کی اردو نصاب میں شامل تھی اور ان نمبروں کو طالب علم کے تعلیمی معیار کی صحت میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ طالب علم کا اصل ڈویژن اردو زبان میں حاصل شدہ نمبروں کو منہا کرنے سےظاہر ہوتا تھا۔ اس زمانے کے تعلیمی نصاب میں اردو ہی کے ساتھ ایسا سلوک روا نہیں رکھا گیا تھا۔ کالجوں میں نہ تو اسلامی تاریخ پڑھائی جاتی تھی اور نہ اسلامی علوم ہی اس نظام تعلیم میں کوئی مقام رکھتے تھے۔ اس زمانے کی اعلیٰ تعلیم اردو زبان، اسلامی تاریخ اور علوم اسلامیہ کی نفی سے پیدا ہوتی تھی۔

انگریزوں کے اس نظام تعلیم کے بارے میں بہت کچھ کیا گیا ہے لیکن اس امر کو بہت کم نمایاں کیا گیا ہے جس کے تحت اردو زبان، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کو نصاب تعلیم میں شامل کرنے سے گریز کیا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری برسوں کے دوران سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں "سیکولر قومیت" کا تصور رائج تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ان کے تشخص سےالگ کرتے ہوئے سیکرلر قومیت کے تحت ایک اکائی میں شریک کرنے کی کوشش عام تھی۔ تاہم اس ضمن میں ہندوؤں نے جلد ہی تعلیم اور نصابِ تعلیم میں اپنے تشخص کے خدو خال شامل کر لیے۔ لیکن مسلمانوں کو اس سلسلے میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ ----

ان حالات میں برصغیر کا مسلم گھرانہ ہی واحد تمدنی اور معاشرتی ادارہ تھا جو مسلمانوں کے ملی تشخص اور وجود کو قائم رکھ سکتا تھا۔ اس لیے

سرکاری اسکولوں اور کالجوں مں تعلیم پانے والی مسلمان نسلوں کی ملی تربیت گھرانے کے سپرد تھی اور گھرانہ ہی اس مقصد کی نگہداشت کرتا تھا۔ اردو زبان نے گھرانے کو اپنے ارادوں کا محور بناکر گھرانوں کےاندر مسلم تشخص اور ملّی وجود کی پرورش کی اور اخباروں اور رسائل اور خواتین کے لٹریچر کی مدد سے اس کمی کا ازالہ کیا جو سرکاری درس گاہوں میں برابرموجود تھی۔ گھرانوں کے اندر اسلامی تاریخ کا علم، اسلامی علوم سے اگاہی اور اردو ادب کا چرچا اردو زبان کی وساطت سےہوا اور اس طرح مسلمانوں کے ملّی وجود کو ایک پائیدار عمرانی اساس حاصل ہوئی۔

اگر ۱۸۵۸ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیاں اس زمانے کی شائع شدہ تحریروں کا جائزہ لیا جائےتو جہاں ورنیکلر پریس میں اردو زبان کے رسائل اور اخباروں کی نمایاں تعداد دکھائی دیتی ہے، وہاں کتابیں بھی بڑی کثرت سے شائع ہوتی نظر آتی ہیں۔ تاہم کتابوں،رسالوں اور اخباروں کے اس وسیع منظر میں دو الگ الگ دھارے بخوبی سامنے آتے ہیں۔ جن کا تعلق تشخص اور اجتماعی وجود کے ساتھ ہے۔ ہندو اپنے تشخص کو اجاگر کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اپنی تاریخ ہی کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے برعکس مسلمانوں کی تمام تر توجہ کا مرکز ان کا اپنا تشخص اور اپنا ملی وجود ہی دکھائی دیتا ہے۔ برصغیرکی یہ دونوں متحارب تہذیبیں اردو زبان کی وساطت سے اپنے ارادوں کی تکمیل کرتی ہیں۔ بنگالی ناول نگار بنکم چندر چیڑ جی کا ناول "آنند مٹھ" بنگالی سے اردو میں ترجمہ ہو کر قارئین تک پہنچتا ہے اوراس کا ایک دوسرا ناول " زہریلا آب حیات" کے عنوان سے بنگال پر مسلمانوں کے عہد اقتدار کی باقاعدہ مذمت کرتے ہوئے مسلمانوں کے بارے میں نفرت پھیلاتا دکھائی دیتا ہے۔ ان ناولوں کے برعکس "منصور موہنا" مسلمانوں کے اعلی اخلاق اور شجاعت کی کہانی سناتا ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے لکھے ہوئے تاریخی ناولوں میں مسلمانوں کی عظمت کو خاص طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ منشی محمد دین فوق کے ناول اکبر اعظم میں ایسے ہی رویے مدنظر رکھے گئے ہیں۔ اگر زبان کے حوالے سے اس زمانے کی تحریروں کا مشاہدہ کیا جائے تو مسلمان عظمت، رواداری، انصاف و عدل اور شجاعت و جوانمردی کی اقدار کو نمایاں کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اردو زبان ان قدروں کے ذریعے مسلمانوں کے ملی وجود اور تشخص کو محفوظ کرنے کی جدوجہد میں شریک نظر آتی ہے۔

جس زمانے کا ذکر کیا گیا ہے اس کے دوراں نظام تعلیم کی لازمی تدریسی زبان انگریزی تھی۔ جو انڈین ایمپائر کی سبھی درس گاہوں میں قانونی طور پر رائج تھی۔ اس زبان کے حلقۂ اثر میں تمام مقامی زبانیں آتی تھیں۔ لوگ پشتو،

کشمیری، پنجابی، بلوچی اور سندھی بولتے تھے لیکن یہ زبانیں ان مقاصد کے ادراک سے بہت دور تھیں جو برصغیر کے ملی تشخص اور وجود کی نشاندہی کرتے تھے۔ اس لیے اس ضمن میں مقامی زبانیں بے حرکت تھیں اور صرف لوک رابطے ہی کا کام کرتی تھیں اور کبھی کبھی لوک گیتوں کی شکل میں زمانے کی شکایت کرتی تھیں۔ اس کی عمرانی وجوہات تھیں۔ کشمیر میں سیاسی شعور کی ابتدا بھی ۱۹۲۲ء کے بعد ہوئی تھی جب ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ پنجاب میں پنجابی سکھوں کے پاس تھی اور وہی پنجابی کے قدیم لکھنے والوں کا گورمکھی میں ذکر کرتے تھے۔ پشتو اور سندھی، بلوچی کی حالت بھی ان سے مختلف نہ تھی۔ برصغیر کے مسلمان سیاسی اعتبار سے ابھی خود آگاہی کی منزل سے بہت دور تھے۔ مقامی زبانوں کی اس دنیا میں اردو زبان نےمسلمانوں کے ملی تشخص اور وجود کے قیام اور استحکام کے مقاصد کو اپنے ابلاغی مقاصد میں شریک کیا اور ملی ذمہ داریوں کو اپنی استعداد اور صلاحیت اظہار کی پوری قوتوں کے ساتھ نبھایا۔ ----- اس ضمن میں قابل غور یہ امر بھی ہےکہ قومیت کی تشکیل اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک کہ مسلمانوں کے ملی وجود کو استحکام نہ ہوتا۔ اردو زبان نے تشکیل قومیت کے عمل کو ملی وجود کے استحکام کے ذریعے ممکن کیا اور اس طرح اپنا ملی کردار ادا کیا جو برصغیر کی مسلم سیاست میں نہایت اہم مقام رکھتا ہے۔ اردو زبان کے بغیر اس زمانے کی مسلم آبادی علاقوں میں بٹی ہوئی تھی اور مقامی زبانوں کے جغرافیے میں حصار بند تھی۔ اردو زبان نے ان تفاوتوں کو رفع کیا، فاصلے طے کیے، منزلیں عبور کیں اور مسلمانوں کو ملی وجود کا احساس فراہم کیا جس کی عدم موجودگی میں ان کی اجتماعی زندگی کا مستقبل مخدوش اور تشویش ناک تھا۔

٦- اردو- ہندی مسئلہ

---- تہذیبی اور تعلیمی رویے

اس امر سے بہت کم اختلاف کیاجا سکتا ہےکہ تہذیب اپنی زبان سے پہچانی جاتی ہے اور زبان اس اعتبار سے ان لوگوں کی شناخت بنتی ہے جو اس تہذیب کے اپنے کردار اور اقدار کو اخذ کرتے ہیں- اس برصغیر میں سترہویں صدی تک تہذیبی اور تعلیمی امور کے بارے میں ایک طے شدہ لائحہ عمل رائج تھا- فارسی زبان علم و دانش، دربار اور بازار کےمعاملات کی زبان تھی- مغلیہ ہندوستان مخلوط آبادی کا ملک تھا اور ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی علمی اور تہذیبی سرچشمے سے اکتساب فیض کرتے تھے- لیکن اٹھارہویں صدی کے دوران ایسا لائحہ عمل قائم نہ رہا اور جہاں مسلمانوں کے اقتدار کی مرکزیت کمزور ہوئی وہیں برصغیر کے حالات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی دخل اندازیوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا- انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پالیسی ساز اداروں میں فارسی زبان کے بارے میں مخالفت کےرویے ظاہر ہوئے اور ۱۸۲۳ء میں یہ کھل کر کہا گیا کہ فارسی زبان آل تیمور کے اقتدار کی علامت ہے اور جب تک یہ زبان برقرار ہے اور دفتروں اور زندگی کے معاملات میں اس کا عمل دخل برابر موجود ہے تب تک نہ تو انگریزوں کا دبدبہ قائم ہو سکتا ہے اور نہ کمپنی ہی اپنے مقبوضات میں اپنے اقتدار کاخاطر خواہ اظہار کر سکتی ہے- ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب اختیار کی پختہ رائے تھی کہ آل تیمور کا اقتدار رخصت ہو چکا ہے-اس لیے، اس اقتدار کی علامت کو ختم کر دینا بھی نہایت ضروری ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ مغل باقی نہیں رہے اور اب انگریز اس ملک کے حکمراں ہیں- ----- ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطابق زبان نہ صرف ایک لسانی پیکر ہے بلکہ اقتدار اور حکمرانی کی علامت بھی ہے- ------ ان رویوں نے ۱۸۳۵ء میں انگریزی زبان کو لازمی تدریسی زبان کا درجہ دیا اور گورنر جنرل نے حکماً یہ لازم قرار دیا کہ آئندہ ملازمت صرف اسے دی جائے گی جو انگریزی زبان جانتا ہوگا- ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کے اس حکم نے فوری طور پر عربی اور فارسی جاننے والوں کو ان پڑھ قرار دیا اور ان پر ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے گئے-

جس زمانے میں لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل نے انگریزی زبان کو لازمی تدریسی اور لازمی مضمون کا درجہ دیاتھا اس وقت کمپنی کے مقبوضات میں ابھی

شمالی ہندوستان شامل نہیں تھا۔ بنگال کے صوبے میں آسام اور بہار کے علاقے بھی شامل تھے اور جنوب میں احاطۂ مدراس کا وسیع و عریض رقبہ تھا۔ بمبئی کا صوبہ مرہٹوں کی شکست کے بعد ۱۸۱۸ء میں ایک الگ انتظامی وحدت کے طور پر ظاہر ہوچکا تھا۔ کمپنی کے اقتدار کےدوران بنگال میں ہندو بنگالیوں کا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہو چکا تھااور ہندو بنگالیوں کی ایک بڑی تعداد نے عیسائی مذہب بھی قبول کر لیا تھا۔ بمبئی میں پیشواؤں کے اقتدار کی یاد مرہٹوں کے دلوں میں اس دور کو برابر تازہ رکھتی تھی جب وہ برصغیر کی سب سے طاقتور قوت تھے اور انہوں نے لاہور تک کامیاب یلغار کی تھی۔ ان حالات میں کمپنی کے مقبوضات میں دو زبانیں بااثر تھیں جو بنگالیوں اور مرہٹوں کی زبانیں تھیں۔ مدراس میں تامل اور تلیگو کا چرچا ضرور تھا لیکن کمپنی کے مقبوضات میں ان کااثر مقابلتاً کم تھا۔

لارڈ ولزلی کے زمانے (۱۷۹۸ء۔ ۱۸۰۵ء) میں فورٹ ولیم کالج کو اس خاص مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا کہ کمپنی کے انگریز اہلکار مقامی زبانوں کو سیکھ سکیں تاکہ نظم و نسق کے معاملات میں انہیں کوئی دشواری نہ ہو۔ اس کالج میں ڈاکٹر گلکریسٹ کے ذمے عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانیں تھیں جبکہ کیری بنگالی، مراٹھی اور دوسری زبانوں کا نگران تھا۔ چونکہ اس کالج کے پیش نظر زبانوں کا افادی پہلو تھا اور اس کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ انگریز اہلکاروں کو بول چال کی زبانوں کی واقفیت بہم پہنچائے اس لیے زبان کے اسلوب کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ فورٹ ولیم کالج نے آسان زبان کو رواج دیا اور فارسی کےاسلوب کو جو عبارت آرائی اور شکوۂ الفاظ کی نثر کا اسلوب تھا غیر ضروری قرار دے کر رد کر دیا۔ یوں اس عہد کی ہندوستانی زبان سے جب فارسی اور عربی کے الفاظ کو کم سے کم کیا گیا تو جو عام فہم زبان دستیاب ہوئی اسے ہندوستانی کے ساتھ ساتھ ہندی بھی کہا گیا۔ اس سلسلے میں یہ امر غور طلب ہےکہ فورٹ ولیم کالج ہندوستانی زبان سے اردو زبان ہی مراد لیتا تھا۔ ڈاکٹر تارا چند کی رائے ہے کہ اس زمانے میں اردو نہ صرف شمالی ہندوستان میں مستعمل تھی بلکہ دکن اور جنوب کے بڑے بڑے شہروں میں بھی اس کا اثر رسوخ تھا۔ البتہ ہندی کی صورت مختلف تھی۔ برج بھاشا ایک وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی لیکن نہ تو اس کی کوئی معیاری صورت تھی اور نہ اسےتحریروں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ برج بھاشا اور دوسری بولیوں میں نثر مفقود تھی۔ ان حالات میں فورٹ ولیم کالج نے دہلی اور اس کے نواح میں مستعمل کھڑی بولی کو ہندی زبان کی لسانی بنیاد بنایا۔ ہندی کے مقابلے میں اردو(ہندوستانی + فارسی رسم الخط) کا مقام بڑا تھا۔
...... ہندی زبان نے ادبی زبان کا مرتبہ صرف بیسویں صدی کے دوران حاصل کیا

ہے۔ ..... تاہم فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی کے دو روپ ظاہر ہوئے۔ سنسکرت رسم الخط نے ہندی زبان کی بنیاد رکھی اور فارسی رسم الخط اردو زبان کی تاریخی پہچان کے طور پر برابر قائم رہا۔

اس ضمن میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ بول چال کی زبان عموماً مشترک ہوتی ہے کیوں کہ الفاظ کی ادائیگی صوتی صورت اختیار کرتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی لسانی پالیسی یہ تھی کہ زبان عام فہم ہو اور اس اعتبار سے بول چال کے بے حد قریب ہو۔ کالج کی پالیسی کے مطابق سنسکرت اور عربی و فارسی زبانیں علمی زبانیں تھیں اور ان کی لفظیات عام آدمی کی گفتگو سے کوئی افادی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے ان زبانوں کی لفظیات کو بڑی احتیاط اور توجہ کے ساتھ برابر منہا کیا گیا۔ یوں عام ہندوؤں کی معلومات کے لیے ہندوستانی کو ناگری رسم الخط میں لکھا گیا اور ہندی زبان اور ادب کی بنیاد پڑی جبکہ فارسی رسم الخط پہلے ہی سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے کوئی غیر مانوس شے، نہ تھا اور ہندوستانی کو بخوبی اردو کہا جا سکتا تھا۔اکبر کے زمانے میں جو مشترک زبان پیدا ہو رہی تھی جسے ہندی/ہندوی کہا جاتاتھا اس میں سنسکرت کے الفاظ کو شامل کرنےکی کوشش کی گئی تھی لیکن بادشاہ کی خوشنودی کے پیش نظر ایسے طرزِ عمل کو ترک کیا گیا تھا۔ اکبر کےزمانے میں ہندی زبان ان معنوں میں ناپید تھی جن کے تحت یہ زبان فورٹ ولیم کالج کے دور میں وجود میں آئی تھی۔ ڈاکٹر تارا چند کی رائے کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندی کے مقابلے میں اردو کی تاریخ زیادہ پرانی ہے۔ کھڑی بولی کو لوک بولی کا درجہ تو دیا جا سکتا ہے لیکن اردو کے مقابلے میں زبان کی حیثیت دینےکے لیے کوئی معروضی شواہد مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ عمرانی اعتبار سے فورٹ ولیم کالج کی اہمیت اس امر میں ہے کہ اس کالج نے رسم الخط کے ذریعے برصغیر کی عام فہم زبان کو جو لوگوں کی مشترکہ زبان تھی، دو زبانوں میں تقسیم کر دیا اور یوں ہندی اور اردو کے لسانی سیاسی مسئلے کو پیدا کیا۔

جس زمانے میں سرسید نے آنکھ کھولی تھی (ولادت ۱۸۱۷ء) وہ زمانہ فورٹ ولیم کالج کا تھا۔ جہاں بنگالی، مراٹھی اور ہندی زبانوں کی تشکیل ہو رہی تھی۔ گلکریسٹ اور کیری ان مقامی بولیوں کو زبانوں کے لسانی زمرے میں شامل کرنے کی مہم میں مصروف تھے۔ کچھ ایسا ہی عمل ۱۸۱۲ء میں مدراس میں شروع ہوا تھا جہاں فورٹ سینٹ جارج کالج قائم کیا گیا تھا تاکہ تامل، تلیگو اور ملیالم کی تدریس کا انتظام ممکن ہو۔اگرچہ ان دونوں کالجوں کا مقصد لسانی تھا اور اس کی افادیت اس امر میں تھی کہ کمپنی کے اہلکار مقامی زبانوں کو سیکھ کر کمپنی

کے معاملات کو کامیابی سے چلا سکیں تاہم ایک اعتبار سے کمپنی کے پالیسی ساز ارباب اختیار زبانوں کے معاملے میں اپنے عہد کے یورپی منظر ہی کی پیروی کر رہےتھے۔ یہ زمانہ یورپ میں قومیت کے جغرافیائی تصور کا زمانہ تھا۔ غالباً برصغیر میں زبانوں پر ایسی توجہ کسی حد تک استعماری مفادات کی پردہ پوشی بھی تھی۔ کمپنی کی نگرانی میں جتنی زبانیں افزائش پا رہی تھیں ان میں فارسی رسم الخط کی ہندوستانی زبان واحد اردو تھی جس کا تہذیبی رشتہ مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ یوں رسم الخط کے اعتبار سے اردو زبان کا مقام اقلیتی نوعیت کا دکھائی دیتا تھا۔ اس بات کو دیکھتے ہوئے فورٹ ولیم کالج کے بارے میں کسی قسم کا حسن ظن پیدا نہیں ہوتا۔ زبانوں کا یہ لسانیاتی منظر مسلمانوں کو زبان کے حوالے سے الگ تھلگ کرتا تھا اور جہاں اقتدار برابر کمزور ہو رہا تھا۔ وہیں فارسی رسم الخط کی اردو زبان کا مستقبل بھی کچھ تسلی بخش نہ تھا۔ یہ الگ بات ہےکہ اس زمانے میں لکھنئو کا عروج تھا اور اودھ کا تہذیبی مقام قابل رشک تھا۔ اس لیے کچھ عجب نہیں تھا کہ نوجوان سید احمد خان (سرسید) ۱۸۴۷ء میں ماضی کے آثار کو دیکھنے اور جاننے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسی رویے نے سرسید کو ۱۸۴۷ء میں اردو زبان کے بارے میں لکھنے کی شاید ترغیب دی تھی۔ اپنے ایک مضمون "اردو زبان کی عہد بعہد ترقی" میں سرسید لکھتے ہیں:۔

> "..... جب شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا اور سب ملکوں کے وکلا کے حاضر رہنے کا حکم دیا اور دلی شہر کو نئے سرے سےآباد کیا اور قلعہ بنایا اور شہاہ جہان آباد اس کا نام رکھا۔ اس وقت اس شہر میں تمام لوگوں کا مجمع ہوا۔ ہر ایک کی گفتار اقتاد جدا تھی۔ ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا۔ جب آپس میں معاملہ کرتے ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اس کی زبان کے، تین لفظ دوسرے کی زبان کے، ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ خود ایک نئی زبان ہوگئی اور جو کہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے اور بادشاہی امیر امراء اسی کو بولا کرتے تھے۔ گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی۔ ہوتے ہوتے خود اس زبان ہی کا "اردو" نام ہوگیا۔ ....."

اردو زبان کے بارے میں سرسید کے اس نظریے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے تاہم اس امر سے شاید اختلاف ممکن نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان اردو تھی اور ۱۸۴۷ء میں جب سرسید کی عمر تیس برس تھی، ان کا اردو زبان کے

بارے میں تہذیبی نظریہ قابل توجہ ہے۔ زمانے کے جن بدلتے ہوئے رویوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی روشنی میں سرسید کے تہذیبی نظریے کی اہمیت بھی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ اگر اردو مسلمانوں کی زبان تھی اور اس اعتبار سے ان کی تہذیب کی علامت بھی تھی تو فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس جن دوسری زبانوں کو ان کے لوک زمانے سے باہر نکال کر انہیں نئی دنیا سے متعارف کرا رہے تھے ان کے سامنے اس علامت کی کیا قد و قامت تھی ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جسے بہرصورت پوچھنا پڑتا ہے۔

مغلیہ دور حکومت کے آخری ایام میں جب ناگری اور دوسرے رسم الخط میں بنگالی، مراٹھی، ہندی، تامل، تلگو اور ملیالم زبانیں اپنے طبعی جغرافیے اور زمین کے رشتے کی بدولت وجود میں آرہی تھیں، مسلم اقتدار شام کے سائے کی طرح رخصت ہو رہا تھا اور "دلّی کا آخری یادگار مشاعرہ" اس بزم کی آخری نشست تھا جس نے اسلامی ہندوستان کی تہذیب کو اس کا منفرد رنگ دیا تھا۔ تاہم اگر مظاہر زمانے کے مخفی ارادوں کی نشاندہی کرتے ہیں تو جس منظر کا ذکر کیا گیا ہے اس کے پردے میں واقعی کوئی سانحہ پرورش پاتے دکھائی دیتا ہے۔ اس منظر کے پھیلتے پھیلتے اودھ کی بساط اُلٹ گئی، لکھنئو باقی نہ رہا اور جنرل اوٹرم کے فوجی بادشاہ اودھ کو اپنے ہمراہ کلکتہ لے کر رخصت ہوئے۔ ١١ مئی ١٨٥٧ء کو وہ سانحہ رونما ہوا جس نے اسلامی ہندوستان میں مسلم اقتدار کو ختم کردیا۔ بادشاہ کی علامت باقی نہ رہی اور مسلمانوں کی تہذیبی علامت، اردو زبان تشویش ناکیوں سے دوچار ہوئی۔ --------

١٨٥٧ء کے بعد برصغیر کے مسلمانوں پر کیا گزری اس کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ تاہم اس ضمن میں ایک مختصر اقتباس قابل توجہ ہے :

" ١٨٥٧ء میں ہندوؤں کی سازش اور انگریزوں کی قاہرانہ طاقت کی بدولت مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اور وہ جس طرح تباہی اور بربادی کا شکار ہوئے وہ بڑی ہی ہولناک داستان ہے۔ لاکھوں بچے یتیم ہوئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہوئیں اور مسلمانوں کی آبادیاں ویران ہوگئیں-----٦٠
[شیخ محمد اسماعیل پانی پتی : مقالات سرسید]

١٨٥٧ء کے بعد مسلمانوں پر جو صبرآزما کیفیت طاری ہوئی اسے اجتماعی نفسیات کے اس سانحے سےتعبیر کیا جاسکتا ہے جو ظلم ، تشدد، بے سرو سامانی، خوف و ہراس، تباہ حالی، اور عزت نفس کے خاتمے سے رونما ہوتا ہے۔ قوموں کی نفسیات میں ایسے سانحے بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ غالباً پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر جرمنوں کی حالت بھی ویسی نہ تھی جو اس برصغیر میں ١٨٥٧ء کے بعد

مسلمانوں کی تھی۔ اس اعتبار سے ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت ایک سنجیدہ نفسیاتی مطالعے کا موضوع بھی بنتی ہے۔ عام طور پر اس کیفیت کو یہ کہہ کر بیان کیا جاتا ہے کہ اس سانحے کے بعد مسلمان گر چکے تھے اور مایوسی کا شکار تھے۔ ان کی قوت عمل ماؤف ہو چکی تھی۔ حقیقت میں اس سانحے کے بعد جو کچھ رونما ہوا اسے صرف مسلمانوں کی نسل کشی ہی کہا جا سکتا ہے۔ برصغیر کے انسانی منظر میں اس سانحےکے بارے میں دو رویے ظاہر ہوئے تھے۔ ایک رویہ انگریزوں کا تھا جو فاتحانہ تکبر کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے بارے میں نفرت، عداوت اور کھلے عناد کا رویہ تھا جس نے مسلمانوں سے نہ صرف ان کا روزگار چھین لیا بلکہ ان کے خاندانوں کو گداگری کے حالات سے دوچار بھی کیا۔ انگریزوںکا ایسا رویہ نہایت پست اور اخلاق باختہ تھا۔ اس کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے جان رسکن[1] (۱۸۱۹ء - ۱۹۰۰ء) کا کہنا ہے کہ انگریزوں نے جو کچھ کیا ہے اس نے ان کی شجاعت اور جوانمردی کو داغدار کر دیا ہے اور انہو ںنے اپنی بہادری کے سارے امتیاز گنوا دیے ہیں۔ گرے ہوئے دشمن کے ساتھ ایسا سلوک تاریخ میں صرف اینگلوسیکسن قوم کے ان رذیل بیٹوں نے کیا تھا جو روپے کمانے کے لیے اس ملک میں مہم جُو بن کر وارد ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی انگریزوں کے خلاف جدوجہد اور ۱۸۵۷ء کا واقعہ تاریخی حق تھا۔ جیسےکسی صورت مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مسلمانوں سے ان کی عبادت گاہیں تک چھین لی گئی تھیں۔ لاہور کی بادشاہی مسجد بھی ایک لمبے عرصے کے بعد واگزار ہوئی تھی۔ اس تفصیل سے مراد صرف یہ ہےکہ مسلمان برصغیر میں بے تحفظ ہو چکے تھے۔ ------ اس انسانی منظر میں دوسرا رویہ ہندوؤں کا تھا جو بہت حد تک غیر واضح اور ملا جلا رویہ تھا۔ مسلمانوں کے بارے میں ان کی غالباً ایک ہی رائے تھی کہ آخر کار ان کی حکومت کا خاتمہ ہو ہی گیا ہے اور جس کام کو رانا سانگا، رانا پرتاپ اور سیواجی نے شروع کیا تھا بالاخر اس کی تکمیل ہوگئی تھی۔ اس میں خوشی کا عنصر شاید مفقود تھا تاہم ایک گونہ اطمینان کا شائبہ ضرور موجود تھا۔ ------ ۱۸۵۸ء کے بعد برصغیر کی دنیا بدل گئی تھی۔ لیکن یہ دنیا مسلمانوں کے لیے اور طرح بدلی تھی اور ہندوؤں کے لیے یہی دنیا کسی اور طرح بدلی تھی۔ اس دنیا کے بارے میں دونوں کے زاویے مختلف تھے! ۱۸۵۷ء میں برصغیر کی صورت حال میں تین فریق رونما ہوئے تھے۔ انگریز، اور ہندو اور مسلمان ------ لیکن مسلمانوں کا فریق ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ انگریزوں کی نگاہ میں ان کا وجود اور عدم

---

1. John Ruskin : The Crown of Wild Olive. 1876

وجود دونوں برابر تھے۔

انگریزوں کی وہ نوجوان نسل جو ۱۸۵۷ء کے واقعات میں ملوث تھی اور جس کے ذمے کمپنی اور بعد ازاں حکومت ہند کا نظم و نسق تھا برصغیر کے بارے میں جن خیالات کی حامل تھی اس کا سرسری جائزہ بھی غیر مناسب نہ ہوگا، کیوں کہ انہی افسروں نے ۱۸۵۸ء کے بعد مسلمانوں کے بارے میں مختلف فیصلے دیے تھے۔ زبان کا مسئلہ بھی ان فیصلوں میں شامل تھا لارڈ رابرٹس[1] کا کہنا تھا کہ غدر کو اپنے طور پر کتنا ہی بُرا کیوں نہ کہا جائے یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس کے بغیر اس ملک میں ہمارا اقتدار کسی طرح مستحکم نہیں ہوسکتاتھا۔ ----" اس دور کے انگریز افسروں کی نظر میں لال قلعے کی دنیا غیر ضروری، بے کار اور مصنوعی دکھائی دیتی تھی۔ جہاں ایک بادشاہ اپنے بڑھاپے میں شعر گوئی کرتا تھا اور ہر طرف بستی، کاہلی اور جمود کی فضا برپا تھی۔ خواجہ سراؤں کی اس دنیا کے باہر خونخوار سپاہیوں کی بھیڑ پھرتی تھی جو صرف قتل و غارت کرنا جانتے تھے۔ انگریزوں کی نگاہ میں بوڑھا مغل تاجدار بہادر شاہ ایک ایسی عجیب و غریب شے تھا جس کی افادیت کو وہ لوگ سمجھنے سے قاصر[2] تھے۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے جب میجر ہڈسن شہزادوں کے کٹے ہوئے سر بادشاہ کو بھیجتا ہے، اسکاٹ لی لکھتا ہے[3]

"یہ دیکھ کر ایسا لگا جیسے لوگوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ انہوں نے اس منظر کو بے حواسی کے عالم میں دیکھا ---- کہ صاحب کیا کچھ کر سکتا ہے اور آخر آہ بھرتے ہوئے سب نے ایک ہی بات کہی کہ قسمت کے آگے کس کا زور چل سکتا ہے۔ ---"

دلّی پر جنرل نکلسن کے حملے کے ضمن میں نکلسن کو مسیحی تعلیمات کا مظہر گردانتے ہوئے ایسے بے شمار اشارے دستیاب ہوتے ہیں کہ نکلسن واقعی کسی صلیبی جنگ میں برسر پیکار تھا۔ فلورا سٹیل لکھتی ہے[2]

"سب کے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی جسے نکلسن نے صبح سویرے عبادت کے وقت سنا تھا اور جب گرجے کے پادری نے اسے دعا دی تھی۔ ---- اور وہ الفاظ تھے، نابود ہو جائے وہ شہر جو خونی شہر ہے۔ ---- اور تلوار اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ ---- دلی کا معرکہ نہ

---

1. Lord Roberts : Forty Years in India.
2. Flora Steel : On Face Of The Waters, 1897
3. Escott Lynn: A hero of The Mutiny, 1895

تو محض انتقامی تھا نہ اس میں کسی قسم کی تعزیری بات تھی۔ یہ معرکہ اصل میں مسیح اور دجّال کے درمیان ایک فیصلہ کن لڑائی تھی۔ ..... جو نکلسن لڑ رہا تھا۔ ....."

تاہم جب اس زمانے کےانگریز افسروں نے غدر کے بارے میں سوچا کہ ایسا واقعہ کیوں پیش آیا تھا تو سب کی ایک ہی رائے تھی کہ کارتوسوں والا سبب اصل سبب نہ تھا۔ اصل وجہ صرف یہی تھی کہ ہم نے (انگریزوں نے) حکومت نرمی کے ساتھ کی تھی اور لوگوں کی ذات پات کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھا تھا۔[1] .....

لندن کا اخبار ٹائمز اگست ۱۸۵۷ء کے دوران اپنی اشاعت کے اداریے میں لکھتا ہے:

"جب لوگ تمیں اپنی بدکاریوں اور برائیوں سے پریشان کردیں اور ان کی بدشعاریاں حد سے تجاوز کر جائیں اور ان کے ہر کام شیطانی دکھائی دیں تو مان لینا چاہیے کہ وہ یہ سب کچھ اس لیے کر رہے ہیں کہ انہیں کسی نے مذہب ہی کے نام پر بھڑکایا ہے۔ ..."

اخبار ٹائمز کے اسی اداریے میں کہا گیا تھا کہ " مسلمان خونخوار جانور ہیں۔ ان کے مذہب نے ان کو ایسی تعلیم دی ہے۔ انھیں اندھا کر دیا ہے۔ ان کے دلوں میں نفرت بھر دی ہے۔ -- اور وہ ہر اعتبار سے بدروحوں[2] کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ ....."

انگریزوں کے نقطۂ نظر سے ۱۸۵۷ء کے بعد کی دنیا ایک بے نام اژدہام کی دنیا تھی جس میں کالے رنگ اور کالے لوگ نمایاں تھے۔ یہ رنگ انگریز کے ذہن میں جرائم کا رنگ تھا اس لیے ان کی نگاہ میں سارا برصغیر جرائم پیشہ لوگوں کا ملک تھا۔ ایسی کیفیت نسلی اور تہذیبی صورت حال کو پیدا کرتی تھی۔ جس میں انگریز نسلی اعتبار سے برتر اور دوسرے لوگ کمتر تھے اور چونکہ انگریزوں نے مسیح اور دجّال کی جنگ لڑی تھی اور دجّال کو مغلوب کیا تھا اس لیے بھی وہ تہذیبی طور پر برتر تھے اور دجّال کے ساتھی جو برصغیر کے باشندے تھے کمتر تھے۔ اس صورت حال نے برصغیر میں "صاحب کمپلکس" کو پیدا کیا۔ جس کے تحت انگریز ارفع و اعلی دکھائی دیا اور مقامی باشندے نہایت کمتر اور کمزور نظر آئے۔ جنرل نکلسن کے زمانے میں پنجابی کا ایک قصہ بھی بہت مشہور تھا جس میں صاحب کو "نکل سائیں" کہا گیا ہے اس کی سوانح عمری میں ایسے واقع بھی دیے گئے ہیں جن کے مطابق مقامی لوگ سمجھتے تھے کہ صاحب آسمانوں[3] سے اترے

---

1. Brere John:- A Hero of Lucknow, 1905.
2. Demons
3. Life of John Nicholson : by Trotter, 1897

ہیں اور آسمانی مخلوق ہیں۔ یوں "صاحب کمپلکس" نے جہاں انگریزوں کو نسلی اور تہذیبی طور پر برتر، اعلیٰ اور ارفع قرار دیا وہیں اس کمپلکس کے تحت انگریزوں میں تکبر اور وحشیانہ پن کی خصلتیں جڑ پکڑ گئیں اور چند ایک عالی ظرف انگریزوں کو چھوڑ کر نئے ملکی انصرام کے انگریز اہلکار ان خصلتوں کاشکار ہوگئے۔ سرانٹونی میکڈونل نے جس رعونت کے ساتھ نواب محسن الملک سے زبان اردو کے بارے میں سلوک کیا تھا وہ صاحب کمپلکس ہی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس زمانے میں انگریز افسروں کے انفرادی فعل بھی انتہائی وحشیانہ پن اور سنگدلی کو ظاہر کرتے تھے۔ صاحب کمپلکس نے جہاں نفسیاتی، نسلی اور تہذیبی تفاوتوں کو پختہ کیا وہیں ایک عام آدمی کے ذہن میں "مائی باپ کمپلکس" کو بھی راسخ کیا اور اس طرح عام فرد کی عزت نفس یکسر تلف ہو گئی۔

ان حالات میں جن کا ذکر کیا گیا ہے اور ۱۸۵۷ء کے دس برس بعد بنارس میں پہلی بار زبان کا مسئلہ رونما ہوا۔ جب سے فارسی زبان کو کمپنی نے دفتری امور سے خارج کیا تھا عدالتوں کی نچلے درجے پر ساری کارروائی، اردو میں ہو رہی تھی جسے ہندوستانی کہا جاتا تھا اور جس کا رسم الخط فارسی تھا۔ اس عرصے میں ہندوستانی زبان کے دیوناگری رسم الخط میں ہندی زبان بھی ظاہر ہوئی تھی جسے بھاشا کہتے تھے۔ اگر اس دور کے لسانی منظر کو دیکھا جائے تو فارسی رسم الخط میں صرف اردو دکھائی دیتی ہے۔ باقی سب زبانیں (بنگالی/ مراٹھی/ بھاشا/ تلگو/ تامل/ ملیالم) ناگری اور اسی قسم کے دوسرے رسم الخط کی زبانیں تھیں۔ اس لیے جب ۱۸۵۷ء میں مغلیہ حکومت ختم ہوگئی اور اقتدار کا روایتی تصور ناپید ہوگیا تو ۱۸۶۷ء میں بنارس کے ہندوؤں نے مطالبہ کیا کہ تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو موقوف کیا جائے اور اس کے بجائے بھاشا زبان جاری کی جائے جو دیونا گری میں لکھی جائے۔ حقیقت میں ۱۸۵۷ء کے عین بعد بعض انگریز افسروں نے ہندی زبان کی خاص طور پر سرپرستی کی اور اس کی نشوونما میں گہری دلچسپی لی تھی۔ انہوں نے اس زبان کی گرائمر بنائی اور ہندی میں لکھنے والوں کی بڑھ چڑھ کر حوصلہ افزائی کی۔ ڈاکٹر تارا چند کا کہنا ہے کہ ایک انگریز نے جس کا نام بیلی (ایس۔ سی) تھا اس نے حکومت کو مشورہ دیا کہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر ہندی زبان کو عدالتوں اور دفاتر کی زبان بنا دیا جائے کیوں کہ فارسی رسم الخط میں بڑی قباحت یہ ہے کہ اس کے حروف کو کسی وقت بھی بدلا جا سکتا ہے اور جعلی دستاویزات تیار کی جاسکتی ہیں۔ دیوناگری رسم الخط میں حروف کا بدلنا آسان نہیں ہے۔ .... اسی دوران بہار کے گورنر جارج کیمبل (۱۸۷۱ء - ۱۸۷۴ء) نے

صوبہ بہار کی عدالتوں اور مدرسوں سے فارسی رسم الخط اور اردو زبان کو موقوف کر دیا۔ گورنر کی رائے تھی کہ بہار کے لوگ غریب اور ان پڑھ ہیں اور جب تک ہندی زبان میں دفتری کارروائی نہیں کی جاتی یہ بے چارے مظلوم لوگ فارسی رسم الخط جاننے والے عملے، پولیس اور زمینداروں کے ظلم و جبر کا شکار رہیں گے۔ جس زمانے میں بنارس کے ہندوؤں نے ہندی بھاشا کا مطالبہ کیا اس وقت سرسید بنارس میں منصف تھے۔ ڈاکٹر تارا چند کا کہنا ہے کہ سرسید کو اس مطالبے اور بعد ازاں صوبہ بہار کے فیصلے سے بہت دکھ ہوا۔ لیکن اس دکھ کی وجہ یہ نہ تھی کہ فارسی رسم الخط جاننے والے عملے اور پولیس اہلکاروں کی بہت بڑی تعداد بے روزگار ہو جائے گی اور صوبہ بہار میں واقعی بے روز گاری بھی ہوچکی تھی۔ ان کا دکھ ایک اور وجہ سے تھا کہ رسم الخط کے ساتھ مسلمانوں کا تمدن وابستہ ہے۔ ------ اور اسے عدالتوں سے موقوف کرنے کی تہ میں مسلمانوں کے بارے میں حکومت انگلیشیہ کا معاندانہ رویہ کارفرما ہے۔ ------ ۱۸۷۲ء میں صوبجات متوسط میں اردو کو عدالتوں اور مدرسوں سے موقوف کر دیا گیا اور اس کے بجائے ہندی بھاشا اور دیوناگری لپی کو رائج کیا گیا۔

۱۸۷۲ء میں "تہذیب الاخلاق" کے ایک شمارے میں سرسید نے تعلیمی صورت حال کے بارے میں بنگال، مدراس اور بمبئی کے صوبوں کا تذکرہ کیا اور اس ضمن میں ان صوبوں کے ڈائریکٹر تعلیمات کی چٹھیوں کا تفصیلی جائزہ بھی دیا۔ ان چٹھیوں اور ان میں درج شدہ ریزولیوشنوں کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان تینوں وسیع و عریض صوبوں میں مسلمان طالب علموں کی تعداد کم تھی اور اکثر و بیشتر انہیں ہندوؤں کی دیسی زبان ہی میں پڑھایا جاتا تھا کیوں کہ ان اسکولوں اور مدرسوں کو ہندوؤں کی ضرورت کے مطابق قائم کیا گیا تھا۔ تاہم مدراس کی حکومت نے یہ قدم اٹھایا تھا کہ جہاں آبادیاں مسلمانوں کی زیادہ ہوں وہاں مسلمانوں کو ابتدائی تعلیم ہندوستانی زبان میں دی جائے جو فارسی رسم الخط میں لکھی جائے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کے لیے الگ مدرسے اوراسکول بھی قائم کیے جائیں کیوں کہ "ایک ایسے ملک کے انتظام ملکی میں مسلمانوں کا شریک نہ رہنا جس پر وہ حکمرانی کر چکے ہیں ملنساری اور تدبیر مملکت کے برخلاف ہے" [ریزولیوشن گورنمنٹ مدراس۔ ۷ اکتوبر ۱۸۷۲ء] اسی ضمن میں سرسید، گورنمنٹ کی اس پالیسی کا تذکرہ بھی کرتے ہیں کہ کالج کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں دیسی زبانوں کو شامل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ہندوستانی زبان کو مغربی ایشیا کی زبانوں (عربی/فارسی) سے الفاظ لینے پڑیں گے جو قابل عمل نہیں ہے تاہم گورنمنٹ کی یہ پالیسی بھی سرسید کی نظر میں قابل توجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم

کے مقابلے میں ابتدائی تعلیم پر زیادہ زور دینا نہایت واجب اور لازمی ہے۔ ......

جن رویوں اور حالات کی جس کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے ان میں مسلمانوں کے تمدنی مقام کی صورت بے حد واضح ہے۔ انکی حیثیت نئی حکومت کی نظر میں کسی توجہ کی مستحق نہ تھی۔ سکولوں اور مدرسوں میں مسلمان طلبا کی گنتی نہ ہونے کے برابر تھی اور جہاں کہیں وہ پڑھتے بھی تھے وہاں ہندوؤں کی دیسی زبانیں انہیں پڑھائی جاتی تھیں۔ تاہم ۱۸۷۰ء تک دفتروں اور عدالتوں کی کارروائی اردو ہی میں ہوتی تھی اور یہ رواج کم ازکم چالیس برس پرانا تھا۔ ان حالات میں بنارس کے ہندوؤں کا مطالبہ معنی خیز تھا۔ ان کا ہندی بھاشا کے حق میں مطالبہ اس امر کی نشاندہی کرتا تھا کہ ان کا اس ہندوستانی زبان کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور جسے اردو کہا جاتا ہے۔ اس مطالبے کا تمدنی اور عمرانی مفہوم بھی غالباً یہی تھا کہ جب مسلمانوں کا وقار باقی نہیں ہے تو ان کی زبان کو کسی طرح بحال رکھنا کہاں تک مناسب اور ضروری ہے۔ اردو کو موقوف کرنے کی روش نے اس امر کی وضاحت بھی کی تھی کہ ہندو، مسلمانوں کو الگ تصور کرتے ہیں اور ان کی کسی بھی روایت کی پاسداری کرنے سے انکاری ہیں۔ ان ہندوؤں کا مطالبہ اس اعتبار سے اجتماعی تشخص کے اظہار کا مطالبہ تھا۔ تاہم ۱۸۵۷ء کے بعد اس قدر جلد ایسا مطالبہ کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جسے نمایاں کرنا مناسب دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ اس مطالبے کی تہ میں ہندوؤں کی مسلمانوں کے ساتھ معاندت اور تمدنی منافرت کے رویے بھی نظر آتے ہیں۔ ۱۸۳۵ء کے بعد ہندوؤں نے انگریزی تعلیم کو قبول کیا تھا اور بنگال میں نئے مدرسوں کے تعلیم یافتہ ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مسلمان نئے تعلیمی عمل کے خلاف تھے اور انہوں نے انگریزی پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں کا یہ مطالبہ کہ سکولوں اور عدالتوں میں ناگری رسم الخط اور بھاشا کو نافذ کیا جائے اس اعتبار سےبھی قابل غور ہے کہ اول تو مسلمان ایسے مطالبے کی کسی طرح اجازت نہ دیں گے اور اگر حکومت انگلیشیہ نے ہندوؤں کی کثرت کے بموجب بھاشا کو اردو کے بجائے دفتری زبان بنا دیا تو مسلمان نئے ملکی نظام میں پوری طرح الگ تھلگ ہو جائیں گے اور ان کی تمدنی حالت کے سدھرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔ جہاں تک انگریز افسروں اور حاکموں کا تعلق تھا ان کے رویوں کا پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔ وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کے ہمدرد نہ تھے۔ مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ان کو اگر کوئی دلچسپی تھی تو یہی تھی کہ یہ "خونخوار جانور" جس قدر جلد ختم ہو جائے اسی قدر حکومت انگلیشیہ کے حق میں بہتر ہوگا۔ ...... اسی ضمن میں یہ امر

بھی قابل ذکر ہے کہ اس برصغیر میں مسلمان سوائے چند علاقائی منطقوں کے ہر صوبے میں بکھرے ہوئے تھے اوران کی تعداد بھی ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ مزید یہ کہ ان صوبوں میں بھی ان کو ہندوؤں کی دیسی زبانوں میں پڑھایا جاتا تھا۔ اردو زبان کو موقوف کرنے کے مطالبے کا ایک دور رس نتیجہ یہ بھی نکلتا تھا کہ مسلمانوں کے مابین کسی قسم کا تمدنی رابطہ قائم نہ رہ سکے اور وہ بھاشا اور دوسری ہندو زبانوں کے زیر اثر اپنا تہذیبی تشخص قائم نہ رکھ سکیں اور بالاخر اکثریت کے اندر جذب ہو جائیں۔ ------ اس اعتبار سے اردو ہندی مسئلہ محض لسانی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ تمدنی اور تہذیبی رشتے اور اندیشے بھی وابستہ تھے۔ کم از کم مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ ان کی اجتماعی زندگی کے بقا کا مسئلہ تھا اور اس کے ساتھ ان کے مستقبل کا گہرا تعلق تھا۔

۱۸۶۷ء کے اس مطالبے کی نفسیاتی توضیحات کی تلاش میں دور جانے کی غالباً کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اگر ہندو اور مسلمان دونوں ایک طویل عرصے سے فارسی رسم الخط کو علمی روایت کے طور پر بروئے کار لانے کے عادی تھے اور اردو زبان نہ صرف دونوں کی مشترکہ زبان تھی بلکہ یہ زبان پیدا بھی اسی سرزمین میں ہوئی تھی تو ہندوؤں کو بھاشا کے حق میں اور اردو کی مخالفت پر کن رویوں نے آمادہ کیا تھا؟ اور کیا رسم الخط ایسی شے ہے جسے قبول کرتے ہوئے کوئی دشواری بھی پیش آسکتی ہے؟ حقیقت یہ ہےکہ بنارس کے ہندوؤں کا ایسا مطالبہ دراصل بنگالی قومیت کی ترغیب سے پیدا ہوا تھا جس کی بنیاد مسلم دشمنی پر تھی۔ مسلمانوں کے دور کی مذمت اس زمانے کا نمایاں ہندوانہ رویہ تھا اور اورنگ زیب کے عہد کو مسخ کرنے کی روایت بھی اسی زمانے ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ اگر ان محرکات کو نفسیاتی مفہوم دیا جائے تو بنارس کے ہندوؤں کا مطالبہ تہذیبی انتقام کی شکل اختیار کرتے دکھائی دیتا ہے۔ سرسید نے انہی باتوں کو بھانپتے ہوئے کہا تھا کہ اب دونوں قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ -------- اردو محض ایک زبان نہ تھی بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی زبان تھی۔ ------

۱۸۵۸ء کے بعد اگرچہ انگریزوں نے مسلمانوں کو کچلنے اور تہذیبی طورپر مغلوب و ماؤف کرنے میں انتہائی تشدد سے کام لیا تھا۔ تاہم انگلستان میں بہت جلد ایسے رویے بھی ظاہر ہوئے تھے جو استبداد کے ایسے طرز عمل کی مذمت کرتے تھے۔ لندن کے اخبار ٹائمز میں جہاں مسلمانوں کو "خونخوار جانور" کا نام دیا گیا تھا وہیں ہندوؤں کے بارے میں بھی لکھا تھا کہ بظاہر یہ لوگ بے حد مسکین دکھائی دیتے ہیں لیکن ایسے بہروپ کے پیچھے ان کی نیت ہمیشہ معاندانہ

ہوتی ہے۔[1] اور غالباً ایسے ہی سیاسی[2] احساس کے نتیجے میں انگریزوں نے برصغیر کے اسکولوں میں اردو کو رائج کیا تاکہ مسلمان اس زبان میں ابتدائی تعلیم پا سکیں۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے اس کا الحاق ۱۸۴۹ء کے بعد عمل میں آیا تھا۔ اس زمانے میں اس صوبے کا علاقہ پشاور تک پھیلا ہوا تھا۔ مغلوں کے زمانۂ اقتدار اور انگریزوں کے تسلط کے درمیانی عرصےمیں پنجاب خالصہ شاہی کی سلطنت تھا اور اس پر دربار لاہور کی حکومت تھی۔ الحاق کے بعد اس زمانےکے مسلمان بزرگوں نے مرکز کے مسلمانوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کے لیے اردو زبان کے حق میں رائے دی اور اسے پنجاب کے اسکولوں میں رائج کرنےکی حمایت کی۔ مسلمانوں کے ان رویوں کو تاریخی صداقتوں کے طور پر مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ہندوؤں کے معاندانہ رویے کی موجودگی میں مسلمانوں کی تہذیبی وحدت اردو زبان کے ذریعے محفوظ رہی تھی اور اسی زبان نے انہیں ایک ملت کے طور پر قائم رکھا تھا۔ .... ۱۸۶۷ء کے ہندو مطالبے نے مسلمانوں کو ان کے تشخص کی برقراری میں مدد دی اس طرح اس احساس کو نمایاں کیا کہ ہندو اور مسلمان دونوں کا ماضی الگ ہے اور شاید اسی طرح ان کا مستقبل بھی الگ ہے!

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کی مسلم سیاست میں آگرہ اور اودھ کی سرزمین کا کردار مرکزی نوعیت کا تھا۔ یو۔ پی جسے صوبجات متحدہ آگرہ اور اودھ کہا جاتا تھا، ایک اعتبار سے مسلمانوں کے تہذیبی قالب کا دل تھا۔ اس لیے زبان کا مسئلہ بنارس میں پیدا ہوا۔ یوپی میں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندوؤں کی اکثریت غالب تھی۔ ۱۸۶۷ء میں بھاشا کے مطالبے کی براہ راست زد مسلم تمدن پر پڑتی تھی۔ اس مطالبے کی حمایت میں ہندو آبادی کی کثرت کو دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا تھا۔ صوبے کی زبان اکثریت کی زبان ہوتی ہے، اقلیت کی زبان کو ایسا مقام دینا کسی طور پر جائز دکھائی نہیں دیتا۔ اردو اقلیت کی زبان ہے اس لیے اسے دفتروں اور اسکولوں میں رائج رکھنا اکثریت کو اس کے حق سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ ۱۸۶۷ء میں اس تحریک کو کامیابی نہ ہوئی لیکن اس کا اثر برابر پھیلتا گیا۔ اس دوران بہار میں بہاری زبان کو کیتھی حروف میں لکھنے اور دفتروں میں اسے جاری کرنے کے سرکاری احکام صادر ہوئے اور مختلف صوبوں میں ہندوؤں کی دیسی زبانوں کا چرچا عام ہونے لگا تاہم ہندو اکثریت کے صوبوں میں

---

1. London: The Times August 1857 (Editorial)

۲۔ اس زمانے میں یہ رائے بھی سنی جاتی تھی کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں ایک بات یقیناً مشترک ہے کہ دونوں نے ہندوستان کو فتح کیا ہے اور دونوں کا تعلق فاتحین سے ہے۔

یوپی واحد صوبہ تھا جہاں مسلمانوں کی زبان ابھی تک دفتروں اور عدالتوں میں رائج تھی۔ ایسے احساس نے بھاشا تحریک کے ابھرنے میں بڑی مدد دی اور آخر کار سرسید کے انتقال (۱۸۹۸ء) کے دو برس بعد یوپی کے گورنر سرانٹونی میکڈونل نے ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء میں وہ مشہور حکم جاری کیا جس کی رو سے اردو کے ساتھ ساتھ دفتروں اور عدالتوں میں ہندی کا استعمال جائز قرار دیا گیا۔ یہ فیصلہ یوپی کے بڑے بڑے معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں کے ایک میموریل کے نتیجے میں کیا گیا جسے ہندوؤں کے ایک وفد نے مارچ ۱۸۹۸ء میں گورنر کے حضور پیش کیا تھا۔ ہندوؤں کی عرضداشت یہ تھی کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اس حکم نامےکے تحت ہندی زبان کو اردو کے برابر مقام دیا گیا حالانکہ ہندی بھاشا ابھی اپنے لسانی ارتقا کے ابتدائی مراحل ہی میں تھی۔ اس طرح یوپی میں ہر سرکاری معاملے کے لیے دونوں زبانوں کے استعمال کی پابندی عائد کی گئی اور یہ بھی لازمی قرار دیا گیا کہ آئندہ سرکاری ملازمت کا صرف وہی شخص مستحق ہوگا جو دونوں زبانوں کو جانتا ہوگا اور دونوں میں ایک جیسی مہارت رکھتا ہوگا۔

گورنر یوپی سر انٹونی میکڈونل کے اس فیصلے سے بادی النظر میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو موقوف نہیں کیا گیا تھا جیسا کہ ۱۸٦۷ء کے مطالبے اور بعدازاں ۱۸۹۸ء کی عرضداشت میں مانگ کی گئی تھی۔ یوپی کی حکومت نے اردو کے ساتھ ہندی کو بھی رائج کیا تھا اور یوں دو زبانوں کو ہم پلہ قرار دیتے ہوئے ہندی کی اہمیت کو تسلیم کیا تھا۔ لیکن ملازمت کے لیے دونوں زبانوں میں برابر کی مہارت پر اصرار ایک ایسا قدم تھا جو مسلمانوں کے لیے خاصہ پریشان کن تھا۔ اپریل ۱۹۰۰ء کے اس حکمنامے نے یوپی کے مسلمانوں کو فوری طور پر ایک نامساعد اور بدلے ہوئے لسانی، معاشرتی، تہذیبی اور عمرانی منظر سے دو چار کیا تھا جس کے رونما ہونے کی انہیں کسی طرح توقع نہ تھی۔ ایسی کیفیت میں کئی سوال اٹھتے تھے۔ کیا ایسا فیصلہ اس لیے کیا گیا تھا کہ مسلمان کمزور اور بے بس ہیں اور ان کے مقابلے میں ہندی زبان کے مداح طاقتور ہیں؟ یہ سوال عمومی نوعیت کا تھا تاہم مسلمانوں کے لیے غور طلب یہ تھا کہ کیا وہ واقعی اتنے کمزور ہو چکے ہیں کہ ان کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ بھی بڑی آسانی سےکیا جا سکتا ہے؟ کیا اردو زبان اودھ دربار کے زمانے سے صوبے کی دفتری زبان نہ تھی؟ اور کیا زبان کے پس پردہ مسلمانوں کے وقار کی آزمائش تو نہیں تھی؟ ان سوالوں کی موجودگی میں مسئلہ محض زبان ہی کا نہ تھا۔اس میں نفسیاتی اور تہذیبی

محرکات بھی برابر شامل تھے۔ ۱۸۵۶ء کے بعد غالباً یہ آخری بڑا چرکا تھا جو یوپی کے مسلمانوں کے دل پر لگا تھا کہ اقتدار سے گر جانے کے بعد کیا گزرتی ہے اور کیسی ذلتوں سے آدمی کو گزرنا پڑتا ہے! سرانٹونی میکڈونل کے اس اقدام سے مسلمانوں کے اندر نفرت کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔ ......

گورنر یوپی کا یہ فیصلہ گورنمنٹ انگلیشیہ کی اسی پالیسی کے مطابق تھا جس کے تحت ہندو اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں کی دیسی زبانوں کو رائج کیا گیا تھا۔ لیکن یوپی کے بارے میں ایسے فیصلے کا اطلاق اور ایسی پالیسی پر عمل درآمد دراصل زبان کے حوالے سے یوپی میں مسلمانوں کے تہذیبی وقار اور ہندو اکثریت کے عمرانی دباؤ کو نمایاں کرتا تھا اور چونکہ اس زمانے میں مسلم سیاست کا مرکز یہی صوبہ تھا اس لیے حکومت انگلیشیہ نے اس فیصلہ کے ذریعے مسلمانوں کی "انا" اور ان کے بچے کچھے وقار کو مجروح کرنے کی سوچی سمجھی اور کامیاب کوشش کی تھی۔ انگریزوں کے ذہن میں ۱۸۵۷ء برابر تازہ تھا اور ان کے لاشعور میں وہی معاندانہ رویہ موجود تھا جو ایک نسل پہلے پوری طرح آشکار ہوا تھا۔ اس حکمنامے میں بڑی آسانی سے دونوں زبانوں کو برابری دی جا سکتی تھی۔ لیکن ملازمتوں کے لیے ہندی کا ضروری طور پر جاننا اور اس میں مہارت رکھنا ایسے تقاضے تھے جو محض لسانی مقاصد ہی کی نشاندہی نہ کرتے تھے۔ اس شق کے تحت مسلمانوں کو ان کے لسانی اور تہذیبی وجود سے محروم کرنا تھا اور انہیں باور کروانا مقصود تھا کہ اس صوبے میں دراصل ہندو اکثریت آباد ہے جس کی مرضی انہیں ہرطور قبول کرنا ہے اردو ہندی مسئلہ درحقیقت مسلمانوں کی تہذیبی تاخت و تاراج کی جانب پہلا قدم تھا۔

گورنر یوپی سرانٹونی میکڈونل کے بارے میں عموماً یہ رائے دی گئی ہے کہ یہ انگریز حاکم ہندوؤں کی طرفداری کرتا تھا اور مسلمانوں کے خلاف تھا۔ تاہم محض یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ وہ ہندوؤں کا طرفدار تھا۔ کیوں کہ اس زمانے میں گورنر کے عہدے پر عموماً ایسے افراد کو فائز کیا جاتا تھا جن کی معاملہ فہمی میں ان کے ذہنی رویے بھی برابر شریک ہوتے تھے۔ سرانٹونی کا تعلق انگریزوں کی اس پود سے تھا جو سنسکرت کے قدیم ورثے سے رومانی طور پر متاثر تھی۔ جرمنی میں بھی سنسکرت کا چرچا تھا اور برطانیہ جرمنوں سے اس دور میں بے حد مرعوب تھا۔ اسی زمانے میں کیمبرج میں پروفیسر اے اے میکڈونل (۱۸۵۴ء - ۱۹۲۷ء) ہندوؤں کے ویدک زمانے کی تحقیق میں مصروف تھا اور ۱۸۹۹ء میں اس کی کتاب "سنسکرت ادب کی تاریخ" شائع ہوئی تھی۔ تاہم ان دونوں گورنر اور پروفیسر .. کے مابین کسی قسم کے رابطے کے بارے میں شواہد کی کمیابی کے

باعث، محض قیاس ہی کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ سرانٹونی میکڈونل علمی اور ذہنی اعتبار سے سنسکرت زبان کے مداحوں کے زمرے میں شامل تھا اور ایسا رویہ رومانی طور پر ممکن بھی تھا۔ ...... یہاں تک تو میکڈونل کے فیصلے کے منطقی اور ذہنی رویوں کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن محسن الملک کے ساتھ اس کا رویہ علمی اور ذہنی نسبتوں کی روشنی میں ناقابل فہم ہے۔ مسلمانوں کی احتجاج کو قابل تعزیر گرداننا، علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں پر ناجائز دباؤ ڈالنا۔ سرانٹونی کا خود علی گڑھ پہنچنا اور زبان کے مسئلے کو کالج کی گرانٹ کے ساتھ نتھی کرنا ایسے رویوں کی نشاندہی کرتا ہے جو "صاحب کمپلکس" ہی کی بناء پر پیدا ہوسکتے تھے۔ ایسے رویے انگریزوں کی قومی نفسیات میں سینٹ جارج کی بجائے جان بُل کو نمایاں کرتے تھے۔

اردو ہندی کے بارےمیں حکومت یوپی کے فیصلے پر مسلمانوں کے احتجاج کو محض ایجی ٹیشن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ علی گڑھ میں اس ریزولیوشن کو نہایت سنجیدگی اور افسوس کے ساتھ دیکھا گیا اور مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ کے ٹاؤن ہال میں نواب چھتاری کی زیرصدارت جلسہ ہوا۔ جس میں عرضداشت مرتب کرنے کا کام نواب محسن الملک کے سپرد ہوا۔ مسلمانوں کے اس رد عمل کو ہر اعتبار سے فطری کہا جا سکتا ہے لیکن گورنر کو مسلمانوں اور خاص طور پر علی گڑھ کے اکابرین کی کارروائی بُری محسوس ہوئی۔ اتنے برس گزرنے کے بعد خیال آتا ہے کہ گورنر کے ناراض ہونے کی آخر کیا معقول وجہ ہو سکتی تھی۔ ایک عقلمند حاکم کی حیثیت سے اسے بخوبی سمجھنا چاہیے تھا کہ مسلمان کیوں پریشان ہوئے ہیں ؟ اور پڑھے لکھے انگریز کے طور پر اسے تہذیبی وابستگی کا علم بھی ہونا چاہیے تھا۔لیکن میکڈونل نے اپنی ناراضگی اور ناخوشگوار ردعمل کو، اینگلوسیکسن کردار کے عین برعکس چھپانے سے احتراز نہ کیا اور اپنی تقریروں اور خطوط میں مسلمانوں کے رویے پر سخت نکتہ چینی کی۔ گورنر کےاس اقدام سےمسلمانوں کے خلاف سرکاری رائے پختہ ہوئی اور مسلمانوں پر بلاوجہ دباؤ اور خوف و ہراس کو مسلط کیا گیا جس کے نتیجے میں نواب محسن الملک کو بڑے صبرآزما حالات سے گزرنا پڑا۔ انھوں نے کالج کی ذمہ داریوں سے مستعفی ہونے کی کوشش کی لیکن علی گڑھ اور قوم کے مفادات کے پیش نظر استعفیٰ واپس لے لیا۔ مگر اس

۱- سلیم احمد مرحوم کے ٹیلی وژن سیریل "تعبیر" میں سرانٹونی، محسن الملک کو مولوی مہدی کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ حالانکہ ان کو قانونی طور پر "نواب صاحب" کہہ کر مخاطب کرنا جائز اور مہذب تھا۔

سارے عرصے میں اردو کے بارے میں تحریک ختم ہوگئی- ----- اور سرانٹونی میکڈونل کا فیصلہ بدستور قائم رہا۔ تاہم اس تحریک کے نتیجے میں مسلمانوں کو اپنے ملی وجود کے تحفظ کے لیے نئے ذرائع کی تلاش کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کے اپنے رویے حکومت انگلیشیہ کے بارے میں بدلنے لگے۔

تاہم اگر زبان کے بارے میں یہ اصول تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی اور مشترکہ اور مخلوط تمدن کی نمائندگی کرتی تھی- تو ۱۸۶۷ء اور ۱۸۹۸ء میں ہندوؤں نے اس احتجاج میں کیوں حصہ نہیں لیا تھا جو پہلے تو سرسید اور بعد ازاں نواب محسن الملک کی آراء اور رویوں کی وساطت سے ظاہر ہوا تھا۔ ڈاکٹر تارا چند اس بات کو ماننے سے گریز کرتے ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان تھی- ان کی رائے ہے کہ یہ اردو بولنے والے افراد کی زبان تھی اور اس میں ہندو بھی شامل تھے لیکن احتجاج میں غالباً کوئی بھی ہندو شریک نہیں ہوا تھا۔ ۱۸۶۷ء سے قبل سرسید نے مراد آباد میں فارسی مدرسہ اور غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کرتے وقت ہندو اور مسلمان کی کوئی تمیز اور تخصیص نہیں کی تھی- دونوں اداروں میںاردو زبان ہی کا استعمال ہوتا تھا۔ اس امر کی روشنی میں احساس ہوتا ہے کہ زبان کے بارے میں علیحدگی کے رویے ہندوؤں ہی میں پیدا ہوئے تھے- انہوں نے اردو زبان کے مشترکہ رسم الخط کو رد کرکے اپنے آپ کو اس مشترکہ تہذیب سے الگ کر لیا تھا جو ایک طویل عرصے سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو عمرانی وحدت دیتی تھی- علاوہ ازیں فارسی رسم الخط ان کے تشخص کو کسی طرح مجروح بھی نہیں کرتا تھا۔ اگر اس کیفیت کا جواب اثبات میں ہے تو یہ بات بھی بخوبی واضح ہے کہ علیحدگی کے رویے سب سے پہلے ہندوؤں ہی میں ظاہر ہوئے تھے اور اگر زبان تہذیب اور تشخص کی علامت ہے تو ہندی اور ناگری کو قبول کرکے انہوں‌نے اپنے الگ ہونے کی تصدیق کی تھی- تاہم اگر علیحدگی کے اس ابتدائی رویے (۱۸۶۷ء) کو ملحوظ رکھا جائے اور اس کے نفسیاتی محرکات اور ممکنہ نتائج کا ادراک کیا جائے تو صرف دو باتیں آشکار ہوتی ہیں- پہلی کا تعلق ہندوؤں کی اکثریت سے ہے اور دوسری کا تعلق مسلمانوں پر ان کے حاوی ہو جانے کی دبی دبی خواہش سے ہے- حاوی ہونے اور غلبہ پانے کی خواہش کو اس اعتبار سےبھی ہندوؤں کی فطری جبلت کا جزو قرار دیا جا سکتا ہے کہ ایک ہزار برس کے بعد کوئی بھی قوم ایسے رویے کو اپنے کردار سے منہا نہیں کرسکتی جب وہ اتنے لمبے عرصے تک خود مغلوب اور بے اختیار رہی ہو- ------ اس تناظر میں زبان ایک ابتدائی مظہر تھی اور مستقبل اسی طرح رونما ہو سکتا تھا جس کی تصویر بے پن چندرپال اور لوکمانیہ تلک کی تقریروں اور تحریروں میں دکھائی دیتا تھا۔

۷۔ اردو ہندی مسئلہ ... سیاسی رویے

انیسویں صدی کے دوران مسلمان جن دشواریوں سے دوچار ہوئے تھے اور حالات نے جس نوع کی سنگین صورت پیدا کی تھی ان کے بارے میں مختلف علمی اور فکری زاویے رونما ہوتے رہے ہیں۔ عہد حاضر میں جب اس زمانے کی صورت باقی نہیں رہی اور برصغیر کا سیاسی نقشہ بھی بدل چکا ہے اس تشویش ناک صورت حال کا ادراک اور بھی ضروری ہو چکا ہے۔ وہ زمانہ بنیادی طور پر نفسیاتی رویوں کا زمانہ تھا اور اس زمانے کے سیاسی فیصلے انھی رویوں سے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ایسے نفسیاتی رویے یکساں نوعیت کے نہیں تھے۔ انگریزوں کی نفسیات اپنی جگہ الگ نوعیت کی حامل تھی اور اس کے بارے میں پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے تاہم جہاں تک ہندوؤں کاتعلق ہے ان کی نفسیات کاجائزہ بہت کم پیش کیا گیا ہے۔ زبان کا مسئلہ (اردو ہندی مسئلہ) اسی نفسیات کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس برصغیر میں سب سے پہلے جو تہذیبی گروہ مغربی علوم اور تاریخی شعور سے آشنا ہوا تھا وہ بنگال کے تعلیم یافتہ ہندو تھے اور چونکہ انیسویں صدی کے ابتدائی برس یورپی رومانی تحریک کے ایام بھی تھے اور رومانی طرز احساس میں دریافت ماضی کا ایک اہم تخلیقی اور فکری عنصر تھا اس لیے بنگال میں ہندو قومیت کا تصور پرا چین بھارت کے جذباتی رشتوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان رشتوں نے دھرتی ماتا کے تصور کو رونما کرتے ہوئے بھارت ماتا کے تصور کو پیدا کیا جو ہمہ جہت ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی تصور بن گیا۔ مغربی تعلیم نے اس تصور کو تاریخی شعور فراہم کیا اور مادی مواقع کے پیش نظر اور اقتصادی ذرائع میں حوصلہ افزا شراکت کے باعث بنگالی قومیت (جو انڈین نیشنلزم کی ابتدائی صورت تھی) برہمنوں کے نسلی تفوق کو برقرار رکھتے ہوئے تہذیبی اور سیاسی تفوق کا نمایاں اظہار بن گئی۔ اگر اس مقام نظر سے انیسویں صدی کے عمرانی منظر کا جائزہ لیا جائے تو بخوبی احساس ہوگا کہ ہندوؤں کے جو نئے طبقے ظاہرہوئے تھے ان کے ذہنی رویوں میں ایک عجیب و غریب احساس تکبر تھا۔ اس ضمن میں قابل غور یہ ہےکہ اس احساس تکبر کا رخ انگریزوں کی جانب نہیں تھا...... اس کا ہدف مسلمان تھے۔ ایسے عمرانی ماحول میں مسلمانوں کی کیا صورت تھی اس کی توضیح کے لیے نرادھ چودھری کی رائے توجہ طلب ہے - نرادھ

چودھری کا کہنا ہے[1]

"جدید تاریخ میں پولینڈ کے باشندوں کا عموماً ذکر کیا جاتا ہے کہ زمانے نے ان کے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر جو گزری تھی وہ اہل پولینڈ سے بھی کئی گنا زیادہ دردناک تھی۔ جس دن سے انگریزوں نے ان کو اقتدار سے محروم کیا تھا اسی دن سے ان کی دردناک روداد کی ابتدا ہوئی تھی۔ ایک ہی وار میں ان کی تمام تر حیثیت تباہ و برباد ہوگئی۔ ----- ہندوستان میں ان کا مقام حکمرانوں کا تھا اور تعداد میں کم ہونے کے باوجود وہ ایک بے حد وسیع اکثریت پر نوآبادیاتی انداز میں حکومت کرتے رہے تھے۔ ------ اقتدار سےمحرومی ہی ان کی بدقسمتی کا واحد سبب نہ تھی۔ ----- اسلام مسلمانوں پر غیروں کی حکومت کو کسی طرح گوارا نہیں کرتا تھا اور جب سے اسلام کا ورود ہوا تھا مسلمان شاذ و نادر ہی غیر مسلموں کی رعایا بنے تھے۔ ---- انیسویں صدی میں نہ صرف یہ ہوا کہ وہ حکمرانوں کی بجائے رعایا بن گئے بلکہ یہ بھی ہوا کہ ان کا اپنا شمار بھی ان میں ہونے لگا جو ماضی میں خود ان کی رعایا تھے۔ ان کا اور ہندوؤں کا مقام برابر ہوگیا۔ ------ اور ہندو مغربی تعلیم پا کر ان سے کم و بیش پچاس برس آگے نکل گئے۔ ------"

مسلمانوں کی جس نفسیاتی کیفیت کا ذکر اس اقتباس میں دکھائی دیتا ہے اس کی زد میں شعوری طور پر یوپی کے مسلمان تھے جن کی آنکھوں کے سامنے یہ دردناک صورت ظاہر ہوئی تھی۔ اس درد ناک صورت کو اس زمانے کا ادب مختلف ناموں سے پکارتا ہے۔ اسے زبوں حالی اور احساس زیاں بھی کہا گیا ہے۔ ----- سیاسی طور پر اس صورت حال سے عہدہ براٰ ہونے کے لیے نہ صرف نقطۂ نظر کی تشکیل ضروری تھی بلکہ یہ بھی از حد ضروری تھا کہ اس نقطۂ نظر کو دریافت کیا جائے جو مسلمانوں کےلیے ہر اعتبار سے سودمند ہو۔ سرسید نے نہ صرف اس نقطۂ نظر کو دریافت کیا بلکہ اس نقطۂ نظر کی علمی، تہذیبی اور سیاسی طور پر تشکیل بھی کی۔------- اور اگر ایسا نقطۂ نظر دستیاب نہ ہوتاتو اس برصغیر میں مسلم قومیت کا تصور بھی ظاہر نہیں ہوسکتا تھا۔

مغربی تعلیم نے ہندو تعلیم یافتہ طبقوں میں احیاء کی جس تحریک کو پیدا کیا تھا اس نے سب سے پہلے جس شعور کو رونما کیا وہ یہ تھا کہ اب وہ مسلمانوں

---

1. Nirad Chaudhri: The Continent of Circe.

کی رعایا نہیں ہیں اور یہ کہ مسلمانوں کا اقتدار دم توڑ چکا ہے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بنگال کے ہندوؤں کی نظر میں اس ملک کی جو تصویر بنتی تھی اس میں مسلمان دکھائی نہیں دیتے تھے۔ مسلمان ڈوبتے ہوئے ماضی میں گم ہو چکے تھے۔ اس رویے نے ایسے ناول تخلیق کیے جن میں مسلمانوں کے دور حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہوئی اور مسلمانوں کی حالیہ صورت حال سے ہندوؤں کی ہمدردیاں منقطع ہوگئیں۔ مسلمانوں کا عہد حکومت تمسخرکی علامت بن گیا اور ان کی تہذیب "خوجی کے کارنامے" بن کر متمول ہندوؤں کے لیے ٹھٹھے اور مخول کا موضوع بن گئی۔ ----- بنکم چندر چیٹر جی اور رتن ناتھ سرشار دونوں نے مسلمانوں کے زوال سے اپنا تخلیقی مواد اخذ کیا اور اس نفسیاتی کیفیت سے اپنی اجتماعی "انا" کی تسکین حاصل کی۔

مغربی تعلیم نے تاریخی طور پر ہندوؤں کے احیاء کی جن تحریکوں کو پیدا کیا تھا ان کے مراکز بنگال اور مہاراشٹر میں تھے۔ یوپی اور دوسرے صوبوں کے ہندو ان مراکز سےرہنمائی حاصل کرتے تھے۔ ان تحریکوں کے جائزے سے صرف پراچین بھارت دکھائی دیتا تھا اور پراچین بھارت کے حوالے سے برطانوی ہندوستان، ماتری بھومی اور بھارت ماتا ہی کی شکل میں پہچانا جاتا تھا۔ ایسی فکری آگہی نے ہندوؤں کو شعور دیا کہ یہ برصغیر صرف ہندوؤں اور ہندوؤں ہی کا وطن ہے۔ اس آگہی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ان پر کھلی تھی کہ ملک اکثریت کا ہوتا ہے اور اکثریت ہی اختیارات کےاستعمال کی حق دار ہے۔ انیسویں صدی کے دوران ان اصطلاحوں کی صورت علمی اور فکری تھی اور رومانی طرز احساس کے تحت ان اصطلاحوں کی کشش اور ان کا علمی نشہ بے پناہ تھا۔ کیوں کہ یہ باتیں تعلیم یافتہ ہندوؤں کے پھیلتے ہوئے شعور پر پہلی بار منکشف ہوئی تھیں اس لیے تعلیم یافتہ ہندوؤں کی وہ نسل جو سب سے پہلے اس ورلڈ پکچر سے روشناس ہوئی تھی اپنے احساس ذات ہی میں کھو چکی تھی اوراسے اپنے سوا کوئی اور (سوائے انگریزوں کے) دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے جب انیسویں صدی کے آخری برسوں کے دوران لوکل سیلف گورنمنٹ کا دور شروع ہوا اور ملازمتوں اور اختیارات کے عہدوں پر ہندو دکھائی دیے اور مسلمانوں کا وجود کمزور سے کمزور تر ہوتے نظر آیا تو یہ سوال پیدا ہوئے کہ یہ ملک کس کا ہے؟ اور اس وطن کے اصل حق دار کون ہیں؟ ان سوالوں کا ایک ہی جواب دیا گیا کہ یہ ملک مسلمانوں کا ملک نہیں ہے اور نہ ان کا وطن ہے۔ -------

اگر یہ سوال جس کا ذکر کیا گیا ہے پیدا نہ ہوتے (اور ان کا پیدا ہونا مغربی تعلیم اور رومانی طرز احساس کا منطقی نتیجہ تھا) تو آریہ سماج کے مناظر کسی

طرح رونما نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی لوکمانیہ تلک گئورکھشا اور سیوا جی کا پرچار کرنے کی ضرورت محسوس کرتا اور نہ مسجدوں کے سامنے باجہ بجانے پر ممانعت کے خلاف ہندوؤں کے احتجاج ہوتے۔ ایسے رویوں نے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت پیدا کی اور برصغیر میں پہلی بار ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے جو ۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۹ء تک برابر جاری رہے۔ ان مفادات کی بنا گئورکھشا پر تھی اور مسلمان ان کی زد میں اس لیے آ چکے تھے کہ مسلمان گائے کا گوشت کھانے میں پرہیز نہیں کرتے اور ہندوؤں کے مطابق ان کے وطن میں ایسا کرنے کی اجازت دینا ناممکن تھا۔ تاہم جس صورت حال کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے کہ ہندو مسلم فسادات انگریزوں کی حکمت عملی کا نتیجہ تھے تاکہ مسلمان اور ہندو لڑتے رہیں اور انگریز حکومت کرتے رہیں۔ لیکن یہ سوال بھی برابر غور طلب ہےکہ کیا یہ تصور کہ بھارت ورش ہندوؤں کا وطن ہے، انگریزوں ہی کا خود کاشتہ تصور تھا۔ اس عہد کے تاریخی حالات کے جائزے سے اور کم و بیش ایک سو برس کے فاصلے سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہےکہ اگر وطن کا وہ تصور ظاہر نہ ہوتا جس میں سے مسلمانوں کو منہا کیاجاتا تھا تو ہندو مسلم فسادات کسی طرح رونما نہیں ہو سکتے تھے۔

اس عہد کا جائزہ لیتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ قومیت کا جدید تصور سب سے پہلے ہندوؤں کی سیاست میں رونما ہوا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا کانگرس کا قیام اسی تصور کے اظہار کے لیے عمل میں آیا تھا۔ اس تنظیم کی بنیاد ایک ریٹائرڈ انگریز افسر ہیوم نے رکھی تھی۔ جو اس زمانے کے سیاسی خیالات کا قائل تھا اور چاہتا تھا کہ برطانوی ہندوستان کے لوگ بھی آزادی کے لیے جد و جہد کریں۔ اس نے اپنے ایک کھلے خط میں کلکتہ یونیورسٹی کے گریجوایٹوں سے اپیل کی کہ وہ اس تنظیم میں شریک ہوں۔ اس خط میں لفظ "نیشن" خاص طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ ہیوم نے نہ صرف اس تنظیم کی بنیاد رکھی تھی بلکہ اس کا ترانہ بھی لکھا تھا۔ جو انگریزی زبان میں تھا۔ اس ترانے[1] کے ایک بند کا ترجمہ یوں ہے:

"اے ہند کے بیٹو ......

تم کیوں بے کار بیٹھے ہو

---

1. "Sons of Ind ! —
   Why sit ye idle ....
   Waitnig for some Deva's aid—
   Let us all be up and doing
   Nations by themselves are made."

کہ دیوتا تمہاری مدد کو آئیں گے-----
آؤ --- ہم سب اٹھیں اور کچھ کرنے کے لیے جاگیں -----
کہ قوموں کو بنانے والے
خود اُن کے اپنے لوگ ہوتے ہیں ! "

ہیوم کی تجویز کو گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کی اس رائے کے تحت تھوڑا سا بدل دیا گیا تھا کہ اس تنظیم کا کردار کچھ ویسا ہونا چاہیے جو انگلستان میں حزبِ اختلاف کا ہوتا ہے۔ کانگرس کے قیام نے بنگالی ہندوؤں کو جغرافیائی قومیت کے احساس اور شعور سے روشناس کیا۔ اس تنظیم کا پہلا صدر کلکتہ کا مشہور بیرسٹر بنرجی تھا۔ اس دوران بنگال میں قومیت کا تصور برابر گہرا ہوتا گیا اور بنکم چندر چیٹر جی کے ناول "آنند مٹھ" کا گیت "بندے ماترم" بھی مقبول ہوتا گیا۔ جس نے تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) کے زمانے میں سیاسی مفہوم اختیار کیا اور نئی قومیت کو بندےماترم کے معانی میں قبول کرنے کی روش عام ہوئی۔ بندے ماترم بنگالی زبان کا گیت تھا اور اس کا مطلب تھا۔ "ماں ! تیری پوجا کرتا ہوں۔" اس گیت کے چند بندوں کا ترجمہ یوں ہے :

"ماں ! میں تیری پوجا کرتا ہوں -----
ماں ! میں تیرے چرنوں کو چومتا ہوں ----
کس نے کہا ہے کہ تو اپنے دیس میں کمزور ہے؟
جب لاکھوں ہاتھ ایسے ہیں جن کے پاس چمکتی ہوئی تلواریں ہیں ----
جب لاکھوں صدائیں گرج سکتی ہیں اور گرجتی ہیں ---
اور تیرا نام ساحل سے ساحل تک گونج سکتا ہے -----
اے ماں ! میں تجھے پکارتا ہوں ----
میری دیوی ماں ! میری مالک ماں !
تُو گیان ہے،
تُو آرتھ ہے،
تو دل ہے، ہماری آتما ہے، ہماری سانس ہے
تو ہماری لگن ہے، پریم ہے،
تیری پریت سے ہم موت کو گھائل کر سکتے ہیں ---
اے ماں ! تو دُرگا ہے
تو لکشمی ہے ----
تیری رنگت سانولی ہے----

تیری مُسکان دھرتی کے ہر انگ سے پیاری ہے
اے ماں ! میری ماں
میں تیری پوجا کرتا ہوں ----۔؟

انیسویں صدی کے آخری دنوں کے دور میں ہندوؤں کے اجتماعی شعور نے قومیت کے جس تصور کو اپنی جد وجہد کی بنیاد بنایا تھا اس میں جغرافیہ اور ہندوؤں کا قدیم مذہبی کلچر مرکزی اہمیت کے حامل تھے۔ ان اجزا سے اس عہد کا نظریہ وطن پیدا ہوا تھا۔ "بندے ماترم" کے حوالے سے وطن پرستی کے رویے قدیم ہندو مسلک کے ساتھ اپنی پہچان ظاہر کرتے تھے اور دُرگا اور لکشمی ان کی شناخت کے اساطری اور مذہبی استعارے تھے۔ تاہم اس دور کا جائزہ لیتے ہوئے عموماً کہا جاتا ہے کہ کانگرس کا قیام آزادی کی طرف ایک تاریخ ساز قدم تھا۔ اس امر سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ سوال بھی اسی قدر اہم ہے کہ اس آزادی سے کون سی آزادی مراد تھی ؟ اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے یہ سوال واقعی بے حد اہم تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نہ صرف ہیوم اور لارڈ ڈفرن کی توجہ سے کانگرس کا قیام عمل میں آیا تھا بلکہ ہندو تمدن نے اپنے طور پر نئے اداروں اور تحریکوں کو بھی پیدا کیا تھا جن کے تحت ہندو قوم کے احیاء کی کوششیں شروع ہوئی تھیں۔ آریہ سماج کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ لوکمانیہ تلک (۱۸۵۶ء - ۱۹۲۰ء) پہلا ہندو رہنما تھا جس نے ۱۸۹۸ء میں سوراج کا مطالبہ کیا تھا۔ اس زمانے میں تلک کے پائے کا کوئی اور ہندو رہنما موجود نہ تھا۔ سارے ہندو سماج میں تلک مہاراج کی جے اور چترپتی تلک مہاراج کی جے گونجتی تھی۔ بمبئی میں تلک کے نام کا ایک تمغہ بھی بنایا گیا تھا جس کے ایک طرف تلک کی شبیہ تھی اور دوسری طرف سیوا جی کی تصویر تھی۔ ہندو ذہن میں تلک اور سیواجی ایک ہی روپ تھے۔ اس نے گاؤ رکھشا سوسائٹی قائم کی اور گائے کے تقدس کےلیے بلیدان ضروری قرار دیا۔ ہندوؤں کو قوت کا شعور دینے کے لیے لاٹھی کلب قائم کیے گئے۔ اس زمانے میں ہندوؤں کا اعتقاد تھا کہ تلک ہی وہ مہا پرش ہے جو ملک سے انگریز کو نکال سکتا ہے اور ملک کو آزادی دلوا سکتا ہے۔ تلک نہ صرف انگریزوں کا دشمن تھا بلکہ ماضی کے حکمران (مسلمان) بھی اس کی نظر میں کھٹکتے تھے۔ اس نے گن پتی تہوار کی ابتدا کی جس میں گنیش کی پوجا کی جاتی تھی جسے طاقت اور گیان کا دیوتا خیال کیا جاتا تھا۔ اس تہوار میں مسلمانوں کے خلاف جذبات کا اظہار کیا جاتاتھا اور خاص طور پر ماضی میں ان کے عہد اقتدار کو بُرا بھلا کہا جاتا تھا۔ افضل خاں کےقتل کے بارے میں تلک کی رائے تھی کہ سیوا جی نے افضل خاں کو ہندو دھرم کی خاطر قتل کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر چور گھر میں گھس آئے تو

کیا اسے زندہ چھوڑنا درست ہے؟ ایسے چور کو تو زندہ جلا دینا بہتر ہے۔ ......

جس زمانےمیں برصغیر میں حالات کی صورت ایسی تھی انھی دنوں آئرلینڈ میں ہوم رول اور آزادی کی تحریک بھی زوروں پر تھی۔ آئرلینڈ بھی اپنے تشخص کی تلاش میں تھا اور اس سلسلےمیں اس نے اپنا لوک ماضی دریافت کیا تھا اور اپنی زبان (گیلک) کو اپنی شناخت اور اپنے کلچر کا مظہر قرار دیا تھا۔ ۱۸۹۳ء میں جب آل انڈیا کانگرس کا سالانہ جلسہ لاہور میں منعقد ہوا تھا اور جس کی صدارت دادا بھائی ناروجی نے کی تھی، اس جلسے میں آئرلینڈ کی ہوم رول تحریک کے قائدین کا پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ آئرلینڈ کے لوگ ہندوستان کے کاز کی زبردست حمایت کرتے ہیں۔ --- اس وسیع تر بین الاقوامی رابطے نے بنگال کی قومیت کو مزید قوت فراہم کی تھی اور لوکمانیہ تلک کے سوراج اور آئرلینڈ کے ہوم رول نے ہندو قومیت کے تصور وطن کو ماتری بھومی، بھارت ماتا اور ہندوؤں کے وطن کا مفہوم دیا جس میں مسلمانوں کے وجود کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ سیاسی رویوں کے ایسے ماحول میں لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کا قدم اٹھایا جس سے ہندو سماج میں شدید رد عمل پیدا ہوا۔ اس اقدام سے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی معاشی بہتری کے مواقع پیدا ہوئے تھے۔ موجم دار کی رائے ہے کہ لارڈ کرزن نے بنگال کی تقسیم اسی لیے کی تھی کہ مسلمان بھی ترقی کر سکیں اور ان کی حالت بھی سدھر جائے لیکن ہندو قوم پرستوں کے نزدیک لارڈ کرزن کا اقدام ہندو تصور قومیت کو پارہ پارہ کرنا تھا۔ اس لیے تقسیم بنگال کی تنسیخ کے لیے ایجی ٹیشن شروع ہوئے ۔ اس دوران ۱۹۱۱ء میں شاہ جارج پنجم نے تقسیم کو منسوخ کر دیا۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جب لارڈ کرزن کی قبل از وقت وفات ہوئی تو بنگال کے ہندو پریس کی رائے تھی کہ کرزن کی قبل از وقت موت دیوتاؤں کی بددعا کے سبب ہوئی ہے کیوں کہ اس نے بھارت ماتا کو ٹکڑے ٹکڑے کرنےکا پاپ کیا تھا۔

حالات اور سیاسی رویوں کے اس مجموعے نے جن کا ذکر کیا گیا ہے اردو ہندی مسئلے کو ایک بدلی ہوئی کیفیت سے دو چار کیا اور ارد کے مقابلےمیں ہندی کے فروغ کے امکانات نمایاں ہوگئے۔ جس تصور قومیت کے تحت برصغیر کی سیاسی فضا نئے رویوں کو مرتب کرتی تھی اس میں مسلمان اس خطۂ زمین کے باشندے نہ تھے۔ اس لیے ان کی زبان کا بھی اس تصور قومیت میں کوئی مقام نہ تھا۔ یہ صورت حال زبان اور خطۂ زمین کے رشتےکی نشاندہی کرتی ہے کیوں کہ وطن کے بغیر زبان ظاہر نہیں ہو سکتی اور نہ زبان کے بارے میں کسی قسم کا حق مانگا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے ۱۸٦۷ء سے ہندی کے حق میں جو رائے عامہ

تیار ہوئی تھی اس کا منطقی نتیجہ ہی یہی تھا کہ مسلمانوں کو برصغیر میں اجنبی قرار دیا جائے اور ان کے زمینی رشتے کی واضح انداز میں نفی کی جائے۔ ۱۹۰۰ء میں اردو کے مقابلے میں ہندی کو یوپی میں رائج کرکے ایسے ہی منطقی سلسلے کی تائید کی گئی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کے سامنے دو سوال ظاہر ہوئے کہ ان کی زبان کا کیا منصب ہے؟ اور کیا برصغیر کا خطۂ زمین ان کا وطن بھی ہے؟ ہندو قومیت نہ تو ان کی زبان (اردو) کو تسلیم کرتی تھی اور نہ برصغیر میں ان کے باشندہ ہونےکے حق ہی کو مانتی تھی۔ اسی کیفیت کے پیش نظر ۱۹۰۸ء میں سرعلی امام کا کہنا تھا:

"ہم تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دل میں بھی اس ملک کے ساتھ ویسی محبت ہے جو دوسری قوموں کے دل میں ہے۔ ہندوستان نہ صرف اس لیے ہمارا وطن ہے کہ ہم یہاں پیدا ہوئے ہیں بلکہ ہماری صدیوں کی یادداشتیں بھی اس ملک کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہم اس وطن کے احترام اور اس کی محبت میں کسی دوسرے سے کم نہیں ہیں۔ مگر جب ہم پڑھے لکھے ہندوؤں کو بندے ماترم گاتے سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انہوں نے سیواجی کو قومی ہیرو بنا رکھا ہے تو ہمارا دل مایوسی اور بے اطمینانی سے بھر جاتا ہے۔ ------"

حالات کی تشویشناکی نے مسلمانوں کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جن اقدامات کو بروئے کار لانا پڑا اس کی تفصیل سے سب واقف ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور مسلمانوں کی جداگانہ نیابت کا اصول بھی تسلیم کیا گیا۔ حکومت ہند کی سطح پر ایسے تحفظات یقیناً دیے گئے تھے لیکن ہندو اکثریت ایسے تحفظات کو غیر ضروری سمجھتی تھی اور اس کی نظر میں مسلمان اسی پس منظر ہی کا حصہ تھے جسے ہندو ذہن رفتہ رفتہ نمایاں کر رہا تھا اور وہ پس منظر یہی تھا کہ ملک اکثریت کا ہے اور فیصلہ کرنے کا حق بھی اکثریت ہی کو حاصل ہے۔ ایسی ہی کیفیت کے دوران پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور عالم اسلام پر نئی مصیبتوں کا سلسلہ وارد ہوا۔ جنگ بلقان اور طرابلس کے بعد خلافت عثمانیہ کے اصل ابتلاء کی ابتدا ہوئی اور مسلمانوں کے ملّی وجود کو نئے خطرے درپیش ہوئے۔ ---- پہلی جنگ عظیم اس ضمن میں بھی توجہ طلب ہے کہ اس جنگ میں ہندوؤں نے حکومت کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔ لوکمانیہ تلک نے بھی انگریزوں کی حمایت کی، اور مہاتماگاندھی نے بھی والنٹیر بھیجنے کی پیشکش کی۔ چکبست نے اس جنگ میں ہندو سپاہیوں کو ارجن اور بھیم یاد دلائے کہ کس طرح وہ جنگوں میں لڑا کرتے تھے اور کچھ اسی طرح ہندو فوجیوں کا اس جنگ

میں بھی لڑنا ضروری ہے۔ ----- اس جنگ کے دوران ہندو قوم پرستوں کو پورا یقین تھا کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی ان کو ہوم رول مل جائے گا۔ -----

تاہم اس سارے عرصے کے دوران ہندو اپنے قومی عزائم سے غافل نہ تھے۔ زبان کا مسئلہ بدستور قائم رہا اور رسم الخط کو ہندو تشخص کی علامت قرار دیا گیا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ناگری پر چارنی سبھا بنائی گئی جو ملک بھر میں ناگری رسم الخط کا پرچار کرتی تھی۔ جہاں تک برصغیر میں زبانوں کا تعلق تھا سرکاری زبان انگریزی تھی اور اسکولوں اور کالجوں میں بھی اس کا مقام لازمی زبان اور ذریعۂ تعلیم کا تھا۔ ہندو قوم پرست انگریزی کی مخالفت نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے لازمی ہونے اور ذریعۂ تعلیم ہونے ہی کے مخالف تھے۔ انہوں نے انگریزی کو ۱۸۳۵ء سے برابر تسلیم کر رکھا تھا۔ زبانوں کے اعتبار سے مسلمانوں کا رویہ مختلف تھا اور مختلف رہا تھا۔ انہوں نے انگریزی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا اور اس زبان کو اپنے تہذیبی اور ملّی وقار کے منافی قرار دیا تھا۔ ایسے رویے کے تحت انہیں بہت بڑی قیمت بھی ادا کرنا پڑی تھی اور وہ نئے حالات کے ادراک کی جدوجہد میں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ایسی تباہ کن صورت حال سے انہیں سرسید نے رہائی دلائی تھی۔ ان حالات میں رسم الخط کا مسئلہ انگریزی زبان سے کسی طرح متصادم نہیں تھا اور ناگری پرچارنی سبھا بھی انگریزی کی مخالف نہیں تھی۔ اس لیے رسم الخط کے مسئلے کی اصل زد اردو زبان پر پڑتی تھی۔ اکثریتی قوم کے رسم الخط کی بناء پر اردو زبان کا نہ تو کوئی استحقاق بنتا تھا اور نہ اس کی ہندو قومیت کے دائرہ کار میں کوئی اہمیت تھی۔ ہندو اکثریت اپنے قومی تشخص کو صرف ہندی ہی میں شناخت کرتی تھی۔ ایسے تہذیبی اور سیاسی پس منظر میں لوکمانیہ تلک پہلا کانگرسی لیڈر تھا جس نے ہندی کے لیے دیوناگری رسم الخط کو ہر اعتبار سے لازمی قرار دیا۔ ۱۹۱۵ء میں ناگری پرچارنی سبھا کی کانفرنس میں تلک نے واضح طور پر اعلان کیا کہ ملک کی آئندہ قومی زبان ہندی اور صرف ہندی ہوگی اور اس کا رسم الخط دیوناگری ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ جنگ کے خاتمے پر ہندو قوم پرستوں کو پورا یقین تھا کہ انہیں ہوم رول مل جائے گا اور حکومت ہندو اکثریت کے پاس آجائے گی۔

۸۔ اردو ہندی مسئلہ ---- قومی رویے

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) تک برصغیر کی صورت حال بنیادی طور پر تہذیبی اور سیاسی تھی اور تشخص اور شناخت کے اصولوں کے تحت تہذیبی اور سیاسی زندگی کے خدوخال تراشےگئے تھے۔ اگر اس دور کا سرسری جائزہ لیا جائے تو مسلم سیاست کے نقطۂ نظر سے وہ دور مسلمانوں کے تشخص اور ان کی شناخت کے تحفظ کا دور تھا کیوں کہ مغربی اثرات اور ہندو احیاء دونوں کی موجودگی میں مسلمانوں کا تہذیبی تحفظ ہی ان کے سیاسی وجود کی ضمانت دےسکتا تھا۔ ہندو سیاست اپنے احیاء اور نئے سیاسی امکانات کی بناء پر جو جمہوریت اور عددی اکثریت کے باعث رونما ہوسکتے تھے، جارحانہ صورت اختیار کر رہی تھی اور اس کے اکثر مظاہر واقعی جارحانہ بھی تھے۔ اس لیے پہلی جنگ عظیم کے دوران ہندو سیاست کی توقعات کئی گنا بڑھ گئی تھیں۔ ہندوؤں کی تعلیم یافتہ قیادت کا حجم زیادہ تھا، اقتصادی ذرائع ان کے قبضے میں تھے، ملازمتوں میں ان کا تناسب نمایاں تھا اور کئی اعتبار سے تعلیمی اور فکری قیادت بھی ان کے پاس تھی۔ سب سے بڑھ کر اور بے حد تشویش ناک صورت یہ تھی کہ انڈین نیشنلزم کا فلسفہ ان کی رہنمائی میں مرتب ہوا تھا اور سیکولر قومیت کو زمانے کی فضا جدید اور بہتر رویے کےطور پر قبول کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس زمانےکی سیاست اصل میں مراعات اور تحفظات کی سیاست تھی جسے علم سیاسیات میں مائیکرو پالٹیکس (چھوٹے درجے کی سیاست) کہا جاتاہے۔ تاہم آئرلینڈ کی ہوم رول تحریک کے زیر اثر برصغیر میں بھی سیلف[1] گورنمنٹ کے مطالبے کی ابتدا ہوئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۱۳ء میں اس مطالبےکو اپنی سیاسی جدوجہد میں شامل کیا تھا۔ جنگ کے دوران مسز اینی بسنت اور لوکمانیہ تلک نے ہوم رول لیگ قائم کرکے اس توقع کو تیز تر کیا کہ جنگ کےبعد ملک کو یقیناً ہوم رول مل جائے گا۔ ۱۹۱۷ء میں برطانوی کابینہ واقعی ہوم رول کے بارے میں شاہی فرمان کے مسودے پر غور وخوض کے لیے تیار تھی۔ لیکن اسی دوران روس میں انقلاب آگیا جس نے برصغیر کے اردگرد سیاسی جغرافیے کی صورت بدل دی مگر جن واقعات نے انڈین ایمپائر کے بارے میں برطانوی کابینہ کو شش و پنج میں ڈال دیا تھا وہ عراق عرب میں ترکوں کے ہاتھوں انگریز فوجوں کی شکست تھی۔ اس

1. Self-Government

لیے برطانوی حکومت نے برصغیر کے بارے میں آئینی مقاصد کی صورت بدل دی اور طے کیا کہ برصغیر کو سیلف گورنمنٹ کی بجائے[1] ذمہ دارانہ حکومت کی جانب بتدریج تربیت دی جائے گی تاکہ وقت آنے پر ایسی حکومت کی ذمہ داریوں کو بخوبی پورا کرنا ممکن ہوسکے۔ برطانوی حکومت کے اس فیصلے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۱۹ء) کا نفاذ ہوا اور مانٹیگو چمسفورڈ ریفارمز کے لیے اقدام کی ابتدا ہوئی۔ عام زبان میں اس ایکٹ کا مفہوم یہی تھا کہ انگریز اقتدار چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور ایک لمبے عرصے کے لیے حکومت کرنے پر بضد تھے۔

حکومت برطانیہ کے اس فیصلے نے جنگ کے دوران پیدا کی گئی امیدوں کو خاک میں ملا دیا اور ہوم رول کی تحریک نے ایجی ٹیشن اور احتجاج کی شکل میں سیاسی فضا کو تصادم اور محاذ آرائی میں بدل دیا جس کے نتیجے میں رولٹ ایکٹ اور جلیانوالہ باغ کا سانحہ رونما ہوئے۔ خلافت عثمانیہ اور ترکوں کے ساتھ جس بے انصافی کا سلوک انگریزوں اور لائیڈ جارج کی حکومت نے کیا تھا اس کے خلاف برصغیر کے مسلمانوں کا شدید ردعمل ہوا اور وہ عظیم الشان تحریک ابھری جسے تحریک خلافت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس دوران کانگرس کی پرانی قیادت ختم ہوچکی تھی۔ گوکھلے وفات پا چکے تھے اور لوکمانیہ تلک کا انتقال (۱۹۲۰ء) بھی ہو چکا تھا۔ نئی قیادت مہاتما گاندھی کے ہاتھ تھی۔ اس لیے جب تحریک خلافت ابھری جس کی قیادت مولانا محمدعلی جوہر اور مولانا شوکت علی کے پاس تھی، مہاتما گاندھی نے عدم تعاون کی کانگرسی تحریک کو بھی اس تحریک میں شامل کیا اور دونوں تحریکیں ناکام ہو گئیں۔ ان تحریکوں کی ناکامی نے مسلم سیاست کا شیرازہ بکھیر دیا لیکن کانگرس اپنے سیاسی وجود کو بحال کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اسی دوران میں مسلمانوں کو ہندو بنانے (شدھی) کی تحریک شروع ہوئی۔ ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ مسلمان انڈین نیشنلزم کے تحت پریشان ہوتے رہے اور انہیں اپنے سیاسی مستقبل کا ادراک بھی حاصل نہ ہوا۔ لیکن کانگرس مسلمانوں کے عین برعکس، کسی ایسے ذہنی اور فکری سانحے سے پریشان نہ تھی۔ اس کے پاس وطن کا معروضی اور جغرافیائی تصور تھا، جمہوریت کے اصولوں کے تحت زودیا بدیر اسے اقتدار ملنا لازمی تھا اور ہندو سیاست اپنے قومی شعور سے بھی بے بہرہ نہ تھی۔

---

1. Responsible-Government

اس لیے ۱۹۲۹ء میں کانگرس نے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا جس سے مجبور ہو کر برطانوی حکومت نے ہندوستان کے آئینی مسئلے کو حل کرنے کے لیے تین گول میز کانفرنسیں بلائیں جن کے نتیجے میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵ء) نافذ ہوا اور صوبائی خودمختاری کے ساتھ کانگرس ۱۹۳۷ء میں برسر اقتدار آگئی۔ اسے یہ اقتدار ہندو اکثریت کے سات صوبوں میں حاصل ہوا تھا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اس وسیع تر سیاسی نقشے میں ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے الہ آباد میں مسلمانوں کے لیے الگ وطن کی تجویز پیش کی۔ ...... یہ تجویز آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں پیش ہوئی تھی جس نے مسلم سیاست کے آئندہ لائحہ عمل کو یکسر بدل دیا تھا۔ برصغیر کے دستوری اور آئینی ارتقا میں ۱۹۳۰ء کے بعد مسلم سیاست میں قومی رویوں کی تشکیل ممکن ہوئی۔ ....

جہاں تک اردو ہندی مسئلے کا تعلق ہے پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک اس مسئلے کی نوعیت تہذیبی تھی۔ رسم الخط ان زبانوں کو تہذیبی تشخص دیتا تھا۔ لوکمانیہ تلک کے اعلان کے ساتھ اردو اور ہندی کے تہذیبی راستے ہمیشہ کے لیے بٹ گئے تھے۔ اس ضمن میں یہ کہنا کہ لکھنؤ پیکٹ کے بعد ہندو مسلم اتحاد ظاہر ہوا تھا اور انڈین نیشنلزم نے ہمہ گیر تصور کے طور پر برصغیر کی ساری آبادی کو متحد کر دیا تھا غلط دکھائی دیتا ہے کیوں کہ لسانی مسئلے ہی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان علیحدگی کی لکیر کھینچ رکھی تھی اور اس کی تاریخ ۱۸۶۷ء ہی سے شروع ہوئی تھی۔ لسانی مسئلے نے تہذیبی تشخص کو ایک اثباتی صداقت کے طور پر نمایاں کیا تھا۔ تاہم اس سارے عرصے کے دوران لسانی مسئلہ صرف تعلیمی اور تہذیبی تقاضوں ہی کو ظاہر کرتا تھا کیوں کہ برصغیر میں سیاسی اعتبار سے قومی تصور ناپید تھا اور اصل اقتدار انگریزوں کے پاس تھا۔ انڈین ایمپائر کی قومی زبان انگریزی تھی جس میں برصغیر بین الاقوامی طور پر اپنی پالیسی اور لائحہ عمل مرتب کرتا تھا۔ انگریزی زبان کی سرکاری اور نوآبادیاتی حیثیت نے قومی زبان کے تصور کو غصب کر رکھا تھا۔ اس لیے آزادی کی تحریک ہی میں قوم اور تہذیب کے تاریخی اجزا مضمر تھے۔ آزادی کی تحریک ہی میں قومیت کا تصور پنہاں تھا اوراسی میں مسلمانوں کی تہذیبی اکائی بھی موجود تھی اس زمانے کے سیاسی منظر میں آزادی کی تحریک ہی کی صداقتوں سے قومیت اور تہذیب اور قومی زبان کی سچائیاں ظاہر ہوتی تھیں۔ صرف آزادی کی تحریک ہی کے کامیاب ہونے سے مسلمان قوم بن سکتے تھے؛

ان کی تہذیب نمایاں اور برقرار رہ سکتی تھی اور مسلمانوں کی اپنی زبان(اردو) قومی زبان کے طور پر ظاہر ہو سکتی تھی۔ اگر آزادی کی تحریک پر کوئی حادثہ گزر جاتا تو مسلمان اقلیت ہی کا مقام حاصل کرتے، ان کی تہذیب اقلیتی افراد کی تہذیب کہلاتی اور اردو اقلیتی گروہ کی زبان قرار پاتی۔ محض اردو میں افسانے لکھنے سے اور شعر کہنے سے اردو کو قومی زبان کا درجہ ملنا ممکن نہیں تھا۔

تاہم سوال یہ نہیں ہے کہ کیا اردو زبان قومی زبان بن سکتی تھی۔ .... اصل میں اس عہد کا لسانی سوال یہ تھا کہ مسلمان آل انڈیا سطح پر کس زبان کو استعمال کرتے ہیں ؟ اور وہ زبان کون سی ہے جو ان کے شعور کی رہنمائی کرتی ہے؟ اور کیا زبان کے مسئلے پر آل انڈیا سیاست کے دونوں مرکزی دھارے الگ الگ تو نہیں ہیں اور کیا اردو زبان کی رہبری میں مسلمانوں کے پنڈال میں پہنچنا ممکن ہے اور کیا یہ زبان واقعی مسلمانوں کے ملّی ارادوں کی عکاسی بھی کرتی ہے؟ یہ سوال اس لیے بھی توجہ طلب ہے کہ آل انڈیا سیاست میں ایسی بے شمار تنظیمیں بھی کام کرتی تھیں جو اردو زبان استعمال کرتی تھیں لیکن کانگرس کے لائحہ عمل کی قائل تھیں۔ مسلمانوں کی آزادی کی تحریک کے لیے ایسے رویے مسلمانوں کو ان کی قومیت سے محروم کرتے تھے۔ .... اور مسلمانوں کے تشخص کے لیے ضرررساں تھے۔ اردو زبان کا ایسا استعمال قومیت کی تشکیل نہیں کرتا تھا بلکہ قومیت کی نفی کرتا تھا۔ اس اعتبار سے زبان کے مسئلے کو مسلمانوں کے ملّی شعور کے ساتھ وابستہ کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ ملّی شعور کے بغیر نہ تو زبان اپنے اجتماعی ضمیر کی نمائندگی کر سکتی ہے اور نہ ان ذمہ داریوں کو نبھا سکتی ہے جو تاریخی اعتبار سے زبان پر عائد ہوتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک مسلمانوں کے ملّی وجود کے استحکام کے لیے اردو زبان نے تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی فرائض انجام دیے تھے۔ رسم الخط کے سوال نے اسے ملّی تشخص کا مظہر قرار دیا تھا۔ ان مختلف صورتوں میں اردو مسلمانوں کے ملّی وجود کی تشکیل کرتی تھی اور ان کے ملّی شعور کی نشرواشاعت کا بااعتماد ذریعہ تھی۔ اس سلسلے میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر تحریک خلافت کا ابھرنا ایک اہم واقعہ ہے۔

تحریک خلافت (۱۹۲۱ء) اس اعتبار سے ایک یادگار تحریک تھی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانان برصغیر برٹش ایمپائر کی عسکری قوتوں کے خلاف نبردآزما ہوئے تھے۔ اس تحریک نے برصغیر کے طول و عرض

میں مسلمانوں کو ایک واحد تاثر میں شریک کرتے ہوئے انہیں متحد کردیا تھا۔ کئی تاریخ نگار اس تحریک کے بارے میں عموماً اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تحریک برصغیر کے سیاسی مسائل سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی کیوں کہ اس کے مقاصد سلطان ترکی اور قسطنطنیہ سے متعلق تھے۔ یہ سوال صرف سلطان ترکی، خلافت عثمانیہ اور قسطنطنیہ ہی کا نہیں تھا۔ حقیقت میں اس حوالے سے عالم اسلام کا وہ باوقار اور خود مختار مقام مراد تھا جو تاریخ میں خلافت عثمانیہ کے ذریعے آشکار ہوتا رہا تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اس وقار کا مجروح ہونا ناقابل برداشت تھا۔ اور ۱۸۵۷ء کے بعد وہ ذہنی طورپر ایسے کسی سانحےکو برپا ہوتے نہیں دیکھ سکتےتھے۔ مولانا محمد علی جوہر ایسے ہی تاریخی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تحریک خلافت نے اس اعتبار سے مسلمانوں کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتے ہوئے ان کےشعور میں ملّی وجود کو مستحکم کیا اور عالم اسلام کے حوالے سے اس ملّی وجود کی تمام تر توانائی آشکار ہوئی۔ سیاسی عمل کے طور پر تحریک خلافت نے برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے تشخص سے آشنا کیا کہ وہ ملّی وجود کے بغیر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے۔ اس تحریک کےذریعے برصغیر کے مسلمان پہلی بار اپنی سیاسی جد و جہد اور اپنے سیاسی عمل کو رونما کرتے ہیں۔ پروفیسر اسمتھ نے غالباً اسی لیے اس تحریک کو عظیم الشان تحریک کہہ کر پکارا ہے۔ پہلی محبت کی طرح یہ تحریک برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی شعور کا پہلا موثر اور نہایت توانا اظہار تھی۔ -------- عربی شاعری کی طرح اس تحریک میں رجز بھی تھا اور کاروان شوق کی حدی خوانی بھی تھی۔ ----- اس تحریک نے اس امر کی نشاندہی کی کہ مسلمان اس آشوب سے باہر آچکے ہیں جو ان پر ۱۸۵۷ء میں وارد ہوا تھا اور وہ ایک نئے دور کا آغاز کر رہے ہیں[1]

تحریک خلافت نے جہاں انور پاشا، رؤف پاشا، عصمت پاشا اور مصطفیٰ کمال پاشا کے ناموں کو برصغیر کے مسلم گھرانوں میں عام کر دیا اور جہاں اس زمانے میں کئی بچوں کے نام ترک رہنماؤں کے ناموں ہی پر رکھے گئے، وہیں اس تحریک نے اس زمانے کے ادب، صحافت اور فن خطابت کو بھی بڑی شدت کے ساتھ متاثر کیا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ تحریک خلافت کی نشر و اشاعت میں اردو زبان کا کردار بے حد اہم تھا۔ یہ زبان مسجد و منبر پر مسلمانوں سے خطاب کرتی تھی۔ اخباروں میں خلافت کے بارے میں مسلمانوں کے دکھ درد کو بیان کرتی تھی اور

1. C.V. Smith : Modern Islam in India: 1945.

جلسے گاہوں میں اس زبان کو شعلہ بیان مقرر استعمال کرتے تھے۔ تحریک خلافت نے اردو زبان کو مسلمانوں کے قلب و نظر کی زبان بنا دیا تھا۔ تاہم اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تحریک خلافت ہی کے دنوں میں غالباً پہلی بار اردو اور علاقائی زبانوں کا باہمی رشتہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ تحریک بڑے شہروں سے ہوتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قصبوں تک پہنچ چکی تھی۔ اس لیے خلافت کے بارے میں معلومات اردو زبان کے ذریعے چھوٹے قصبوں تک پہنچتی تھیں اور وہاں سے علاقائی زبانوں کے ذریعے دور دراز کے دیہاتوں تک پہنچتی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں مسلم برصغیر کے دیہات کا فرد اپنی علاقائی زبان کے ذریعے اردو زبان کی معلومات حاصل کرتاتھا اور اس طرح دیہات قصبوں کے ساتھ، قصبے چھوٹے شہروں کے ساتھ، چھوٹے شہر بڑے شہروں کے ساتھ اور بڑے شہر خلافت کی مرکزی قیادت کے ساتھ رابطہ قائم کرتے تھے۔ خلافت کے دنوں میں جہاں یہ گیت نمایاں ہوا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے "بولی اماں محمد علی کی/جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔" وہیں پنجاب کے مسلم گھرانوں میں یہ گیت بھی مشہور تھا۔ "غازی انور پاشا، کمال وے/تیریاں دور بلائیں۔ کرلے وضو تے پڑھ لے نماز وے/تیریاں دور بلائیں ----" اسی گیت میں یہ مصرعہ بھی خاص طور پر قابل ذکر تھا کہ "روندے سعرنا دے بال وے/تیریاں دور بلائیں/ ------ پنجاب میں انور پاشا اور کمال پاشا کو یک جان و دو قالب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے انور پاشا اور کمال پاشا کو ایک ہی مصرعے میں اکٹھا کرنا مستحسن گردانا گیا تھا۔ تحریک خلافت نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک مشترکہ قلبی واردات میں شامل کیا تھا جو اس تحریک کی سب سے بڑی کامیابی تھی اور اس مشترکہ قلبی واردات نے اردو اور علاقائی زبانوں کے درمیان مشترکہ ملّی شعور کے رویے مستحکم کیے تھے۔ کشمیری میں اسی مشترکہ قلبی واردات کی نشاندہی وہ گیت کرتا تھا جس کا ایک مصرعہ یہ ہے "باغ نشاط کے گلو/ناز کران کران ولو !-----" باغ نشاط کے خوش رنگ پھولو ! ناز کرتے ہوئے آؤ، چلے آؤ !

تحریک خلافت اور برصغیر کی مسلم سیاست پر جو کچھ گزرا وہ ایک بےحد دردناک اور تکلیف دہ روداد ہے۔ اس روداد کی نشاندہی وہ بارہ پندرہ برس کرتے ہیں جو ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۵ء کے درمیانی عرصے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مسلم سیاست کی مرکزیت کمزور ہوگئی اور انڈین نیشنلزم اپنی پوری طاقت کے ساتھ گاندھی ارون سمجھوتے میں آشکار ہوا۔ برصغیر کی لیڈر شپ کانگرس کے قبضۂ قدرت میں آگئی تاہم اس عرصےکے دوران ہندو مسلم کشیدگی بڑھ گئی۔ لسانی اعتبار سے ناگری پرچارنی سبھا اور ہندی ساہتیہ سمیلن کے رویے تیز تر ہوگئے۔ اردو زبان،

مسلمانوں کی قومی زبان کا تشخص اختیار کر گئی۔ اس زمانے کے ہندو ادیب اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے رہے لیکن کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جس نے ہندی کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہو۔ اسی زمانے میں "ہندو۔ ہندی۔ ہندوستان" کا نعرہ گونجنے لگا تھا۔ اگرچہ سیاسی اعتبار سے وہ زمانہ مخدوش اور بے حد تشویش ناک تھا لیکن جہاں تک لسانی تشخص کا سوال ہے مسلمانوں نے اردو ہی کو اپنی شناخت قرار دے رکھا تھا اور یہ شناخت برابر پختہ، ہمہ گیر اور مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ اس زبان میں اقبال کا نظریہ احیائے اسلام برصغیر کے مسلمانوں کے لیے خضرراہ کا کام کرتا تھا اور اسی زبان میں مسلمانوں کے ملّی اندیشے اور ملّی عزائم ظاہر ہوتے تھے۔ قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں یہ زمانہ بے حد اہم ہے کیوں کہ جہاں اس عرصے میں کانگرس نے (۱۹۲۹ء) برصغیر کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا تھا اور مسلم لیگ نے اپنے الہ آباد کے اجلاس میں (۱۹۳۰ء) مسلمانوں کے لیے الگ وطن کی تجویز پیش کی تھی وہیں لندن میں گول میز کانفرنسیں بھی منعقد ہوئی تھیں جن کا مقصد برصغیر کے آئینی بحران کو رفع کرنا تھا۔ کانفرنسوں کے اختتام پر ۱۹۳۵ء کا آئین نافذ ہوا اور برصغیر کی سیاست پر کانگرس چھا گئی ------ اس صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے قائداعظم کا کہنا ہے :-

"گول میز کانفرنسوں نے مجھے سب سے شدید صدمہ پہنچایا اور جو کچھ ان کانفرنسوں کی متعدد نشستوں کے دوران ہوا اس سے مجھے پکا یقین ہوگیا کہ ہندوؤں کے جذبات، ان کا ذہن اور ان کے رویے ایسا رخ اختیار کر چکے ہیں کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا مل کر رہنا دشوار ہو گیا ہے۔ اپنے ملک کے بارے میں میرے خیالات بدل چکےتھے اور میں بڑی حد تک مایوس ہو چکا تھا۔ واقعی یہ کیفیت بڑی بدقسمتی کی علامت تھی۔ مسلمان کہیں کے نہ رہے تھے۔ ------ میں نے لندن میں قیام کرنے کو ترجیح دی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے اپنے ملک کے ساتھ محبت نہ تھی۔ ------ مگر میں بے بس تھا۔ اس کے باوجود میں ہر بات پر نظر رکھے ہوئےتھا۔ چار برسوں کےدوران میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمان ایک بے حد خطرناک صورت حال میں گرنے کو ہیں۔ یہ دیکھ کر میں لندن چھوڑ کے واپس آگیا۔ کیوں کہ لندن میں بیٹھ کر میں مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ------ اور چونکہ میں کسی کا نمائندہ بھی نہیں تھا اس لیےمیری حالت گداگر کی سی تھی اور

واقعی مجھے گداگر ہی جانا گیا تھا......"

[صدارتی خطبہ - مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس - لکھنئو ۱۹۳۷ء]

اس اقتباس میں قائد اعظم کا اشارا ۱۹۳۲ء کی صورت حال کی طرف ہے۔

اس زمانے کے مسلمانوں کو ہندو تاریخ نگار عموماً پس ماندہ تصور کرتے ہیں۔[1] اور یہ ترکیب لسانی اور قومی اعتبار سے محل نظر ہے - ہندو نہ صرف مسلمانوں کو اقتصادی طور پر پسماندہ قرار دیتے تھے بلکہ تہذیبی اور نسلی اعتبار سے بھی ان کی یہی رائے تھی۔ جوش نے ایسے ہی رویے کا ذکر سردار ولبھ بھائی پٹیل کے ضمن میں کیا ہے۔ جوش[2] ۱۹۴۷ء کے بعد سردار پٹیل سے ملنے گئے تو انہوں نے سردار پٹیل سے جو ہندوستان کے ڈپٹی پرائم منسٹر تھے پوچھا کہ وہ مسلمانوں سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہیں۔ سردار پٹیل نے جواب میں کہا کہ جہاں تک افغانوں، عربوں، ترکوں اور ایرانیوں کا تعلق ہے وہ فاتح کی حیثیت سے اس ملک میں آئے تھے۔ ان کی میں عزت کرتا ہوں۔ لیکن میں نفرت کرتا ہوں ان سےجو ہندو تھے اور جنھوں نے اسلام قبول کر لیاتھا۔ ایسے رویوں کی موجودگی میں اردو ہندی کے مسئلے میں اردو کے مقام کو کسی قسم کی اہمیت ملنا ناممکن تھا۔ لیکن ایسےہی منفی رویوں نے مسلمانوں کے تشخص کو مضبوط کیاتھا اور ایسے ہی منفی رویوں کی موجودگی میں مسلمانوں نے اردو کو اپنی شناخت کا مظہر قرار دیا تھا۔

تاہم اس زمانے میں برصغیر کا آئینی اور دستوری عمل جن نئی جہتوں اور امکانات کو نمایاں کر رہا تھا ان کے نتیجے میں زود یابدیر برصغیر کو درجہ نوآبادیات تفویض ہونا منطقی اور لازمی نظر آتا تھا۔ حقیقت میں درجہ نوآبادیات ہی پوری سوراج کا اصل مفہوم تھا۔ اس آئینی اور دستوری عمل کے مضمرات قومی نوعیت کے تھے - کانگرسی نقطہ نظر سے "انڈین نیشن" قومی اعتبار سے وجود میں آنے کو تھی اور ایک بااختیار ہندو قومیت کے رونما ہونے کےآثار ظاہر ہو رہے تھے - اس لیے اس دوران ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کا شدت کے ساتھ پرچار شروع ہوا اور اسےبرصغیر کی اکثریت کی زبان قرار دیتے ہوئے قومی زبان کے مقام کا اہل گردانا گیا۔ ان حالات کے پیش نظر اور برصغیر کے مسلم تشخص کے تحفظ اور مسلم تمدن کی شناخت کےاظہار کے لیے مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء کے اجلاس لکھنئو میں اردو کی حمایت میں ریزولیوشن منظور کیا - اس ریزولیوشن نے اردو

---

1. N.V.Rajkumar : Indian Political Parties.

۲۔ جوش ملیح آبادی : یادوں کی برات

زبان کو مسلمانوں کی قومی زبان قرار دے کر اس کی ترویج و ترقی اور اس کے تحفظ کی ضرورت پر زور دیا۔ مسلم لیگ کے اس فیصلے اور اس ریزولیوشن نے اردو ہندی مسئلے کو سیاسی اعتبار سے حل کر دیا اور اردو مسلمانوں کے فکر و عمل، ان کی جدوجہد اور ان کی تحریک آزادی کی علامت بن گئی۔ اس لحاظ سے ۱۹۳۷ء کا اردو کےبارے میں ریزولیوشن سرسید کی اس رائے کی تائید اور تصدیق کرتا تھا جو انھوں نے بنارس کے ہندوؤں کے لسانی رویے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ۱۸٦۷ء میں دی تھی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد جولائی ۱۹۳۷ء میں برصغیر کے سات صوبوں میں کانگرس کی وزارتیں قائم ہوگئیں۔ ان صوبوں میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ وزارتیں سنبھالنے سےکچھ پہلے کانگرس نے گاندھی جی کے ایماپر تعلیمی پالیسی کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس نے واردھا اسکیم تیار کی۔ اس اسکیم کو واردھا ودیا مندر اسکیم کہا جاتا ہے۔ جولائی ۱۹۳۷ء کے بعد تعلیمی درس گاہوں میں ودیا مندر اسکیم کے تحت تعلیمی پالیسی کو نافذ کیا گیا۔ ان حالات میں مسلم لیگ نے قائد اعظم کی صدارت میں اپنے اجلاس لکھنؤ میں لسانی مسئلے کے بارےمیں ایک اہم قرارداد منظور کی۔ یہ اجلاس اکتوبر ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس قرار داد کے متن کا ترجمہ یہ ہے:

> "چوں کہ ابتدا میں اردو زبان ہندوستان ہی کی زبان تھی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تمدنی رابطے کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی اور اس ملک کے وسیع تر اور بیشتر علاقے میں بولی جاتی تھی اس لیے اس زبان کی وساطت سے دونوں قوموں کے اتحاد کی امید ممکن تھی۔ ---- تاہم اس ضمن میں ہر وہ اقدام، جو اردو کے بجائے، جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے، ہندی کو ویسی ہی حیثیت دلائے جو اردو کی رہی ہے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین ہم آہنگی کی فضا کو مکدر کر سکتا ہے------
>
> اس لیے آل انڈیا مسلم لیگ تمام اردو بولنے والوں سے امید کرتی ہے کہ وہ اپنی زبان کے مفادات کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے تاکہ صوبائی اور مرکزی سطح پر اس زبان کا استعمال برابر جاری رہے۔ ----- اور جہاں اردو علاقے کی زبان بھی ہے وہاں اس کی ترویج اور نشو ونما برابر ہوتی رہے اور جہاں اردو، ایک زبان کے طور پر غالب حیثیت کی حامل نہیں ہے وہاں اس زبان کی تعلیم و تدریس کے لیے اور اسے اضافی مضمون کے طور پر پڑھانے کے انتظامات کیے جائیں

اور حکومت کے دفتروں، عدالتوں، قانون ساز اسمبلیوں، ریلوے اور ڈاک و تار کے محکموں میں اردو زبان کے استعمال کے لیے باقاعدہ انتظام کیا جائے اور اس پر باضابطہ عمل درآمد کیا جائے۔ -------

آل انڈیا مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس (۱۹۳۷ء) کے بعد سندھ صوبائی مسلم لیگ نے اکتوبر ۱۹۳۸ء میں اپنی سالانہ کانفرنس میں مسلمانوں کے لیے الگ اور خود مختار مملکت کے حق میں قرار داد منظور کی جس میں کہا گیا تھا کہ متحدہ ہندوستانی (انڈین) قومیت کا تصور ناقابل عمل ثابت ہوا ہے اس لیے ضروری ہو چکا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے خود اختیاری کے اصول کے تحت ایک الگ مملکت قائم کی جائے۔ اس قرار داد کی حمایت میں جو دلائل دیے گئے تھے۔ ان میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔[۱]

۱۔ کانگرس نے ودیا مندر اسکیم نافذ کرکے مسلمانوں پر نہ صرف بندے ماترم کا گیت زبردستی مسلط کیا ہے بلکہ ہندی کو برصغیر کی زبان کے طور پر رائج بھی کیا ہے۔ ----- اس اسکیم کے تحت اردو اسکول بند کر دیے گئے ہیں اور اردو کی تعلیم و تدریس کی راہ میں رکاوٹیں ڈال دی گئی ہیں۔

۲۔ کانگرس نے ہندو ذات پات کے نظام کو بدستور جاری رکھا ہے، جو فی الحقیقت قومیت کے نظریے، انسانی مساوات اور جمہوری اقدار کے منافی ہے۔

۳۔ اور یوں، ان تضادات کے باوجود برصغیر میں ایک متحدہ قوم کا نعرہ بلند کر رکھا ہے حالانکہ برصغیر کی دونوں بڑی قوموں کا مذہب جدا ہے، ان کی زبان جدا ہے، ان کا رسم الخط جدا ہے۔ ان کی تاریخ ، تمدن، معاشرتی اصول اور نظریۂ حیات مختلف ہیں۔ -----

آل انڈیا مسلم لیگ کے پٹنہ اجلاس (مئی ۱۹۳۸ء) میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے کانگرس کے انھی رویوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کانگرس کا اگر کوئی واضح مقصد ہے تو یہی ہے کہ وہ برصغیر میں ہندو راج کو قائم کرنا چاہتی ہے۔ اسی دوران ڈاکٹر عبدالحق سیکرٹری، انجمن ترقیٔ اردو (ہند) نے مہاتما گاندھی کو ایک کھلے خط میں، ودیا مندر اسکیم کے بارے میں تحریر کیا ۔ ----

" انڈین نیشنل کانگرس اقلیتوں کے تمدن اور ان کی زبان کے تحفظ کا بڑے زور و شور سے دعوی کرتی رہی ہے تاہم آپ کو یہ جان کر یقیناً صدمہ ہوگا کہ انجمن ترقیٔ اردو کے ایک نمائندے نے اپنے ہی گاؤں (پندھیرنا ضلع چی واڑہ) کے ایک اسکول میں جو کچھ دیکھا ہے وہ اس

دعوی کی کھلی مذمت ہے۔ صبح سویرے گاؤں کےمسلمان بچوں کو سرسوتی دیوی کے بت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پراتھنا میں شریک ہونا پڑتا ہے اور نمستے اور رام جی کی جے کہنا پڑتا ہے۔ ...... کیا ہمارے تمدن اور زبان کی حفاظت کے لیے یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے؟

آل انڈیا مسلم لیگ نے دسمبر ۱۹۳۸ء میں ودیا مندر اسکیم کے بارے میں رپورٹ تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی نے جولائی ۱۹۳۹ء میں اپنی رپورٹ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کو پیش کی جس میں واردھا ودیا مندر اسکیم کو یکسر رد کیا گیا تھا۔ رپورٹ کےدلائل کی بنیاد جن حقائق پر تھی وہ یوں ہیں:

۱۔ ودّیا مندر اسکیم کو تیار کرتے وقت پوری طرح اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ مسلم تہذیب و تمدن کو بتدریج لیکن یقینی طور پر ختم کر دیا جائے اور ہندو تہذیب و تمدن کو ہر طرح مسلط اور غالب کیا جائے۔ ....

۲۔ یہ اسکیم کانگرس کے سیاسی اور تہذیبی نظریات کو مسلط کرتی ہے۔

۳۔ اس اسکیم کا مقصد بچوں کے ذہنوں میں کانگرس کے سیاسی نظریوں اور پروگراموں کو راسخ کرنا ہے۔ اس اعتبار سے ایسا مقصد محض ایک سیاسی جماعت ہی کے لائحہ عمل کی پیروی کرتا ہے۔

۴۔ اس اسکیم کے دائرہ کار میں دینی تعلیمات کے اداروں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس اسکیم نے اسی ضمن میں سنگین غفلت برتی ہے۔

۵۔ "ہندوستانی زبان" کے پردے میں اس اسکیم کا مقصد ہے کہ سنسکرت زدہ ہندی زبان کو فروغ دیا جائے اور اردو زبان کو مٹایا جائے حالانکہ اردو زبان اس زمانے میں سارے برصغیر کی لنگوافرینکا بن چکی ہے۔

۶۔ بعض کانگرسی صوبائی حکومتوں نےایسی کتابوں کو شامل نصاب کر رکھا ہے اور انہیں باقاعدہ طور پر پڑھایا بھی جاتا ہے جن میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے مطابق قابل اعتراض مواد موجود ہے۔ یہ مواد نہ صرف مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرتا ہے بلکہ ایسے مواد کے ذریعے صرف ہندو دھرم، ہندو فلسفے اور ہندوؤں کے مشاہیر ہی کی فضیلتوں کا پرچار ہوتا ہے اور اسلام نے دنیا کی تاریخ میں جو کردار ادا کیا ہےاور خاص طور پر اس برصغیر میں اسلام کے حوالے سے جو قابل فخر خدمات سرانجام دی گئی ہیں ان کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ اس طرح اس اسکیم کے نظام تعلیم میں مسلمانوں کے تمدن، ان کی تہذیب، تاریخ

اور ان کے مشاہیر کا کوئی مقام دکھائی نہیں دیتا اور اگر کہیں ان کا ذکر آیا بھی ہے تو حقارت ہی کا رویہ نمایاں ہوا ہے۔[1]

ودیا مندر اسکیم مہاتما گاندھی کے ایماء پر برصغیر کی صرف ایک سیاسی جماعت (کانگرس) نے تیار کی تھی اور اس سیاسی جماعت کا دعوی تھا کہ وہ برصغیرکی واحد نمائندہ سیاسی جماعت ہے۔ ۱۹۳۶ء میں کانگرس کے لیڈروں کی سیاسی بصیرت اپنی بینائی کی بناء پر اتنی کم نظر تھی کہ اسےسوائے ہندو کلچر پرا چین بھارت اور ہندو مشاہیر کے کوئی اور تہذیبی تناظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پرانے اور نئے ہندوستان کاذکر کرتے ہوئے پنڈت نہرو[2] نے انڈین نیشنلزم کی وضاحت کے ضمن میں لکھا ہے؛

" اٹلی اور ہندوستان کے درمیان کئی باتیں مشترک بھی ہیں۔ دونوں ملک قدیم زمانے سے موجود ہیں اور دونوں کا تمدن بھی بے حد قدیم ہے۔ تاہم روم کے مانند بنارس کا ویسا مقام تاریخ میں دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن روم کے برعکس بنارس نےکبھی دوسرے ملکوں کو فتح کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ تاہم ہندوستانی تمدن سارےبرصغیر کا تمدن رہا ہے اور ہر شہر کو اس تمدن کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ راس کماری سے لے کر ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیوں میں امر ناتھ اور بدری ناتھ تک، اور دوارکا سے پوری تک ایک ہی نوع کے تصورات گردش کرتے رہے ہیں۔ برصغیر ایک وسیع و عریض خطۂ زمین ہے جو صرف بھارت ماتا کی شکل میں اپنا انسانی چہرا آشکار کرتا ہے۔ بھارت ماتا جو ایک خوبصورت دیوی کی صورت میںجلوہ گر ہے امر ہے کہ سدا سندر اور پیاری ہے۔ لیکن اسے غیروں نے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہے۔ اس لیے اس کی آنکھوں میں گہری اداسی بھی ہے اور وہ اپنے بچوں سے برابر آشا کرتی ہے کہ وہ اس کی حفاظت کریں اور سدا حفاظت کرتے رہیں۔ ----"

اس ضمن میں سوال یہ نہیں ہے کہ کانگرس اور ہندو لیڈر برصغیر کو اپنے تہذیبی تناظر کےمطابق کیا صورت دیتے تھے اور اسے کس استعارے میں پہچانتے تھے بلکہ یہ ہے کہ ایسے تناظر میں مسلمانوں کی تاریخی موجودگی کو کیوں نظرانداز کیا گیا تھا؟ پنڈت نہرو کے جس اقتباس کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں پنڈت نہرو کی رومانی سیاست کے تہذیبی رویے کی بخوبی نشاندہی ہوتی ہے۔ ایسی صورتحال

---

1. M.S.Toosy: The Muslim League & Pakistan Movement p: 136. 137.
2. Hans Kohn: Nationalism p:179.

میں یہ سوال بھی برابر اہم ہے کہ اگر راس کماری سے امرناتھ تک ایک ہی کلچر برابر موجود رہا ہے تو اس کلچر میں مسلمانوں کے تاریخی وجود کے عکس کو شریک کرنے سے کیوں گریز کیا گیا تھا؟ اور کیا پنڈت نہرو نے بھارت ماتا پر ظلم و ستم روا رکھنے والوں میں جن غیروں کا ذکر کیا ہےان میں مسلمانوں کو تو شامل نہیں کیا گیا تھا؟ اور اس سلسلے میں یہ امر بھی غورطلب ہے کہ برصغیر میں خود آریا حملہ آوروں کی شکل میں وارد ہوئے تھے اور ہڑپہ کے آثار برابر اس ظلم اور تشدد کی گواہی دیتے رہے ہیں جو آریاؤں نےمقامی باشندوں پر روا رکھے تھے۔ ایسے رویوں کی موجودگی میں، جو تہذیبی شعور کو قومی وجود میں منتقل کرنا چاہتے تھے، واردھا ودیا مندر اسکیم مسلمانوں کی حیات نو اور ان کے ملّی وجود کےلیے نہ صرف ضرر رساں تھی بلکہ تباہ کن بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

اس زمانے (۱۹۳۷ء - ۱۹۳۹ء) کے سیاسی، لسانی اور تعلیمی پس منظر میں جس نوع کا قومی شعور مرتب ہو رہا تھا اور جسے کانگرس نافذ کر رہی تھی اس کے مظاہر تین تھے۔ کانگرس کا پرچم، بندے ماترم اور ہندی زبان۔ بندے ماترم کے گیت کا قبل ازیں ذکر کیا گیا ہےاور اس کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے تاکہ اس گیت کےتہذیبی مضمرات کا بخوبی علم بھی ممکن ہوسکے۔ زمانے کے اس لمبے عرصےکے مقام نظر سے جو اس کے دوران نمایاں ہوچکا ہے یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ کانگرس کا سارا لائحہ عمل یک طرفہ تھا۔ بندے ماترم اور سرسوتی دیوی کی پوجا، ہندی زبان اور سنسکرت زدہ ذخیرۂ الفاظ اور کانگرس کا پرچم صرف ایک ہی ماضی کو نمایاں کرتے تھے، روایات کے صرف ایک ہی دھارے کی نشاندہی کرتے تھے اور تہذیبی طور پر صرف ہندوؤں ہی کی حیات نو کو ظاہر کرتے تھے۔ تاہم اگر صورت حال کے اس خاکےکو بغور دیکھا جائے تو واضح ہوگاکہ اردو ہندی کے لسانی مسئلے نے قومی شکل اختیار کرتے ہوئے ہندی کو نئی قومیت کا مظہر قرار دیا تھا اور اردو زبان اور اردو کے رسم الخط کو ایسی قومیت کے تصور کے منافی گردانا تھا۔ زبان کے مسئلے پر ایسی واضح تقسیم نے زبان کو تشخص کی علامت قرار دیتے ہوئے جس حقیقت کو آشکار کیا وہ یہ تھی کہ ہندو قومیت نے سب سے پہلے اردو کو رد کیا حالانکہ اردو اس برصغیر کے باہمی تمدنی رابطوں کا مظہر تھی اور اسے تہذیبی محور کے طور پر ہندو اور مسلمان دونوں برابر استعمال کرتے رہے تھے ۔ اردو کے رد کر دینے سے جہاں مسلمانوں کا لسانی تشخص ایک الگ اکائی کے طور پر ظاہر ہوا وہیں ودیا مندر اسکیم نے ہندی کو لازمی قرار دے کر ہندوؤں کے تہذیبی وجود کو مسلمانوں کے تہذیبی وجود سے الگ ایک جداگانہ اکائی کے طور پر نمایاں کیا۔ یوں زبان برصغیر کے سیاسی عمل کو دو الگ الگ راستوں پر

گامزن کرتے دکھائی دیتی ہے۔ اس اعتبار سے اردو مسلمانوں کی قومیت کے واضح مظہر کے طور پر اپنا تہذیبی، لسانی، سیاسی اور قومی کردار ادا کرتی ہے اور مسلمانوں کے ملّی شعور اور ملّی وجود کو آشکار کرتی ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے کانگرسی حکومتوں کی مسلم آزار پالیسیوں اور پروگراموں کے بارے میں راجہ سید محمد مہدی آف پیرپور کی زیر صدارت تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جس نے اپنی رپورٹ میں مسلم آزار رویوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس رپورٹ کو "پیرپور رپورٹ" کہا جاتاہے۔ اس رپورٹ میں زبان کے مسئلے کو اہم قومی مسئلہ قرار دیا گیا اور کہا گیا ہے کہ ہندی کے لازمی نفاذ کے ذریعے مسلمانوں کے حقوق کو نظر انداز کرکے کانگرس نے فسطائی انداز حکومت اختیار کیا ہے اور اردو کو مٹانے کی روش اختیار کی ہے تاکہ ہندی کو ہر قیمت پر رائج کیا جائے اور اسے فروغ حاصل ہو۔ اس دوران ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں نے اردو کے حق میں مظاہرے کیے اور ودّیا مندر اسکیم کی زبردست مخالفت کی۔ کیوں کہ اس اسکیم کے دور رس نتائج مسلمانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔

تاہم اگر اس زمانے کے سیاسی منظر کے محرکات، عوامل اور رویوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۳۳ فی صدی تھا اور جن کا اپنا ملّی اور تہذیبی تشخص ایک مسلمہ سچائی کے طور پر برابر موجود تھا وہاں ودیا مندر اسکیم کے نفاذ کا جواز کیاتھا؟ اور جہاں تک زبان کے مسئلے کا تعلق ہے، اردو کو بے دخل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور رسم الخط کو ناگری ہی کی شکل دینا کس اعتبار سے لازم تھا؟ عہد حاضر کے ہندو تاریخ نگار اس مسئلے کو مسلمانوں کی فرقہ واریت سے منسوب کرتے ہیں اور اس غلط فہمی کی بناء پر اپنے معروضی مقام نظر کو مشکوک بنا دیتے ہیں۔ کیا ودّیا مندر اسکیم جس کے کچھ پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہندی زبان کی وساطت سے مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب کرنے کی کوشش دکھائی نہیں دیتی اور کیا کسی جمہوری نظام فکر کے تحت تہذیبی طور پر گروہوں کو نابود کرنا کسی اعتبار سے جرم نہیں ہے؟ اور کیا اردو کو مٹانے کی روش سے مسلمانوں کے تہذیبی شعور اور ان کے ملّی وجود کو نقصان پہنچانا منظور نہ تھا؟ اور اگر یہ ساری باتیں درست ہیں تو مسلم دشمنی کے رویے کہاں پیدا ہوتے دکھائی دیتے ہیں؟ اور اس اعتبار سے مسلمانوں کے قومی وجود کو تاریخی حقیقت تسلیم نہ کرنا کہاں تک درست ہے؟

تاہم برصغیر کے سیاسی عمل کے اس مقام پر زبان کے مسئلے نے ایک نئی

شکل اختیار کر لی تھی۔ اردو ہندی کے مسئلے پر کانگرس نے واضح طور پر ہندی کو اپنی قومی شناخت بنا کر ہندی کے فروغ کو اہمیت دی اور دیوناگری کو فارسی رسم الخط پر ترجیح دیتے ہوئے اردو کو یکسر رد کر دیا۔ اس ضمن میں اس امر کی باقاعدہ نشر و اشاعت کی گئی کہ اردو قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے اس لیے یہ رسم الخط، بھارت ورش کا رسم الخط نہیں بن سکتا اور اردو کو قومی زبان کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ سیاست کے اس نمایاں رجحان نے رسم الخط کے موضوع اور مسئلے پر دو الگ تہذیبوں اور دو الگ قوموں کی حقیقت کو آشکار کیا تھا۔ ...... جس میں اردو، مسلمانوں کا ملّی وجود اور مسلم قومیت کا تصور ایک الگ سچائی کے طور پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس موقع پر اور برصغیر کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں اور رسم الخط کے مسئلے کو فوکس سے ہٹانے کےلیے کانگرس اور برصغیر کے ہندوؤں نے ہندوستانی زبان کےتصور کو فروغ دیا اور اس امر کی نشاندہی کی کہ آزاد برصغیر کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ اس نئی اصطلاح (ہندوستانی) نے مروجہ اصطلاح (اردو بمعنی ہندوستانی) کو بدل کر اسے ہندی زبان ہی کا مفہوم دیا اور ایسے مسائل پر بحث مباحثہ کی ابتدا ہوئی کہ آزاد برصغیر کی ہندوستانی زبان کیا ہوگی؟

۹۔ ہندوستانی زبان کا تصور

برصغیر کی سیاست کے جس وسیع تر پس منظر کا ذکر کیا گیا ہے اور جس سے ہم بخوبی آشنا بھی ہیں اس میں زبان کا مسئلہ مرکزی اہمیت رکھتاتھا اور زبان ہی کے معاملے میں برصغیر کا تہذیبی تشخص فوری طور پر دو تہذیبی اور عمرانی اکائیوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ غالباً کسی اور مسئلے پر برصغیر کا آریائی اور ہندووانہ ذہن اس قدر کھل کر آشکار نہیں ہوا تھا جس طرح اردو ہندی کے سوال پر سامنےآیا تھا۔ زبان کا مسئلہ اس زمانے کے ہندو ذہن اور ہندووانہ ارادوں کی بخوبی نشاندہی کرتا ہے۔ مسلمانوں کی قومیت کی تشکیل میں اس اعتبار سے زبان کا مسئلہ مسلمانوں کے الگ تہذیبی اور تاریخی تشخص کا ایک بین ثبوت تھا۔ گول میز کانفرنسوں کے مذاکرات کے تحت جہاں برصغیر کی سیاسی تاریخ کانگرس کے ارادوں کی تائید میں رونما ہوئی تھی وہیں کانگرس اور ہندو اکابرین نے اس امر کو ایک طے شدہ حیقیت قرار دیا تھا کہ رسم الخط بہرصورت ناگری رہے گا اور اردو کے قرآنی حروف کاانڈین نیشنلزم کے حوالے سے نہ تو کوئی جواز ہے اور نہ اس زبان کےفارسی رسم الخط کا نئے ہندوستان کے تہذیبی منظر نامے ہی میں کوئی مقام ہے۔ اس کیفیت کے پیش نظر یہ امر برابر تسلیم کیا گیاتھا کہ برصغیر میں یقیناً ایک ایسی واحد زبان ضرور موجود ہے جو ہر جگہ سمجھی جاتی ہے اور جسے گفتگو اور بول چال کے ضمن میں رابطے کی زبان کا درجہ بھی حاصل ہے۔ مسلمان اس زبان کو اردو سے منسوب کرتےتھے اور کانگرس اسے ہندی کہنے پر مُصر تھی۔ تاہم بول چال اور گفتگو کے اعتبار سے یہ زبان مشترک تھی اور ظاہر ہے کہ بولتے وقت رسم الخط اور حروف کا مسئلہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ کانگرس نے اس مشترک زبان کو جو گفتگو کی زبان تھی ہندوستانی زبان کا نام دیا اور لسانی مسئلے کو صوتی مسئلےکے ساتھ منسلک کرکے رسم الخط کے سوال کو خارج ازبحث قرار دے دیا ۔ اس رویے نے ایک نئے مسئلے کو پیدا کیا جو زبانوں کی لفظیات (ذخیرۂ الفاظ) سے تعلق رکھتا ہے۔

اگر برصغیر کی لسانی تہذیب کا جائزہ لیا جائے تو جہاں زبانوں کے مختلف گھرانے نمایاں ہوتے ہیں۔ وہیں اس امر کا احساس بھی ہوتا ہے کہ برصغیر کا لسانی ماضی تین زبانوں سے تعلق رکھتا تھا اور یہ تین زبانیں سنسکرت، عربی اور فارسی زبانیں تھیں۔ دسویں صدی عیسوی میں جب برصغیر اسلامی ہندوستان کی صورت میں ظاہر ہوا اس وقت سنسکرت بول چال کی زبان نہ تھی بلکہ مقامی بولیوں میں

ہٹ چکی تھی اور اس زبان کی تاریخ کچھ ویسی تھی جو رومنوں کے زمانے میں لاطینی کی تھی جو زمانے کے ساتھ رومانس کی زبانوں میں بدل چکی تھی اور اس کی جگہ فرانسیسی، اسپینی اور اطالوی زبانیں پیدا ہوچکی تھیں۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے وقت سنسکرت بھی لاطینی کی طرح متروک ہو چکی تھی، اس لیے اسلامی ہندوستان میں جو نئی اور نوعمر زبانیں ظاہر ہوئیں ان کی اساس پراکرتی تھی لیکن ان کی لفظیات پر عربی، فارسی اور ترکی کا اثر نمایاں تھا۔ اسلامی ہندوستان کے تہذیبی عمل کے دوران اس لفظیات نے عام فہم صورت اختیار کرلی تھی اور ایک مشترک نظام تعلیم اور کاروبار مملکت کے پیش نظر اس لفظیات کے بارے میں کسی قسم کا اجنبی پن موجود نہ تھا۔ تاہم اگر کبھی کسی قسم کا اجنبی پن دکھائی دیتا تھا تو وہ اس وقت نظر آتا تھا جب کوئی سادھو یا رشی یا پنڈت باتیں کرتا تھا۔ لیکن ان باتوں کو سمجھنے میں بھی دشواری حائل ہوتی تھی کیوں کہ جو لفظیات اس طرح نمایاں ہوتی تھی اس کا دائرہ فہم محدود تھا اور اس اعتبار سے وہ لفظیات رابطے کا کام کرنے سے قاصر بھی تھی۔ اگر اس کیفیت کو ملحوظ رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سادھو، رشی اور پنڈت کی لفظیات جس حلقے سے تعلق رکھتی تھی اس کی تعداد بے حد کم تھی اور اس طرح جس زبان سے ایسی لفظیات برآمد ہوتی تھی وہ زبان حصار بند ہو چکی تھی اور اس کا عام لوگوں کے ساتھ فہم و ادراک کا رشتہ منقطع ہو چکا تھا۔ لفظیات کے اعتبار سے بول چال کی زبان نئے زمانے کی ضرورتوں کے پیش نظر نئے الفاظ کے تابع تھی، جبکہ سنسکرت کی لفظیات میں زمانے کے ان تقاضوں کی کوئی صورت موجود نہ تھی۔ بول چال کی اس عام فہم زبان کی لفظیات میں مسلمانوں کے تہذیبی اثرات کا عمل دخل نمایاں تھا اور اسے اردو اور بسا اوقات ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک اس معاملے میں اختلاف بہت کم تھا۔

تاہم ۱۹۳۰ء کے بعد زبان کے معاملے میں جو رویہ پیدا ہوا اس نے عام فہم زبان کو ہندوستانی زبان کا نام دیا اور اس زبان کے فروغ کے دوران اردو زبان کی لسانی اور تہذیبی اصطلاح کو یکسر موقوف کردیا۔ ایسا رویہ کانگرس کا باضابطہ رویہ تھا جو برصغیر کی نمائندہ زبان کو اردو کے بجائے ہندوستانی کہنے پر اصرار کرتا تھا اور اس امر کی نشرو اشاعت کرتا تھا کہ برصغیر کی زبان ہندوستانی ہے اور جسے اب ہندی کا نام دیا گیا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس زمانے میں ہندوستانی زبان کے فروغ کا سلسلہ شروع ہوا اسی زمانے میں آل انڈیا ریڈیو کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء - ۱۹۴۵ء) کے دوران نازی جرمنی کے ریڈیو برلن سے جو خبریں نشر ہوتی تھیں ان کے لیے بھی ہندوستانی

زبان ہی کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی خبریں ہندوستانی ہی میں نشر ہوتی تھیں۔ اردو کا نام رفتہ رفتہ محو ہو رہا تھا۔ اس صورت حال کی کیفیت کچھ یوں تھی:

۱۔ برصغیر کی نمائندہ زبان ہندوستانی ہے۔
۲۔ جس کا رسم الخط ناگری ہے۔
۳۔ اور جس کی لفظیات ہندوستان کے قدیم لسانی ذخائر سے اخذ کی گئی ہے۔

ایسے نقشے میں مسئلہ محض اردو کے حذف ہونے ہی کا نہیں تھا بلکہ اردو جن سچائیوں کی نشاندہی کرتی تھی ان کے قائم رہنے کی امید بھی بے حد مخدوش تھی۔ اس اعتبار سے ہندوستانی زبان دراصل مسلمانوں کے تہذیبی وجود کو نظر انداز اور بے دخل کرنے سے ظاہر ہوئی تھی۔ ------ اور اس واقعے کا پہلا شکار اردو زبان تھی۔ ------

انیسویں صدی کے دوران میں یورپ نے نیشنلزم کے جس تصور کو فروغ دیا تھا وہ جغرافیائی اور نسلی نظریہ' قومیت کو نمایاں کرتا تھا۔ کانگریس کا نظریہ' قومیت بھی یورپی نیشنلزم ہی کا عکس تھا۔ اس نیشنلزم کا ایک اہم پہلو زبان کے مسئلے سے تعلق رکھتا تھا اور چونکہ یورپ کی بیشتر قومیں پرانی سلطنتوں کے تسلط سے آزادی پانے کی جدو جہد میں مصروف تھیں اس لیے ان کی قومیت کا تصور زبان کے معاملے میں بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ یونان میں خلافت عثمانیہ کے تہذیبی اثرات کے خلاف تحریک جاری ہوئی۔ مازینی نے اٹلی کے اتحاد اور آزادی کے سلسلے میں اطالوی زبان کو اٹلی کے کلاسیکی ماضی کے قریب تر لانے کی کوششیں کیں۔ روسی نسل کی اقوام نے فرانسیسی کے تہذیبی اثرات سے آزاد ہونے کے لیے اپنی اپنی زبانوں کو زیادہ سے زیادہ قومی بنانے کی جد وجہد کی۔ یورپی نیشنلزم نے عالم اسلام پر بھی منفی اثرات مرتب کیے اور جدید ترکی زبان اور پہلوی بادشاہت کے زمانے کی فارسی زبان کے لسانی رویے ظاہر ہوئے۔ ------ قومیت کے یورپی نظریے نے زبان کے معاملے میں غیر ملکی تہذیبی اور لسانی اثرات کو حذف کرنے کے رویے کو پیدا کیا تھا، کیوں کہ اس نظریے کے مطابق غیر ملکی (اور غیر قومی) تہذیبی اور لسانی اثرات کی زبان میں موجودگی تحریک آزادی کے مقاصد کے منافی تھی اور تسلط غیر اور محکومی کی یاد دلاتی تھی۔ اس رویے کا براہ راست تعلق زبان کی لفظیات کے ساتھ تھا۔ اس اعتبار سے ایسا لسانی رویہ بنیادی طور پر سیاسی رویہ تھا اور لفظیات کا رد و قبول سیاسی مقاصد ہی کی پیروی کرتا تھا۔

برصغیر میں بھی ہندوستانی زبان کا تصور ایسے ہی رویوں کی نشاندہی کرتا

تھا۔ اس لیے جب ہندوستانی زبان کو برصغیر کی نمائندہ زبان کا درجہ حاصل ہوا اور بول چال کی زبان کے طور پر اسے مشترکہ زبان قرار دیا گیا تو زبان کے جس پہلو کو شدید تنقید کا ہدف بنایا گیا وہ اس مشترکہ زبان کی لفظیات تھی۔ اس زمانے کے شدید سیاسی کانگرسی رویوں نے اس لفظیات کو اپنے قومی مقاصد کے منافی قرار دیا اور اس طرح مشترکہ زبان (ہندوستانی) کی لفظیات کو شدھ کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ اس لسانی رویے نے عربی اور فارسی کے الفاظ کو غیر ملکی اور غیر قومی لفظیات کے زمرے میں شمار کیا لیکن عربی فارسی الفاظ کے مقابلے میں سنسکرت کے الفاظ کو ہندوستانی زبان کی لفظیات میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شامل کیا گیا۔ اس رویے کا پہلا واضح اور افسوس ناک اظہار آل انڈیا ریڈیو کے نیوز بلیٹن میں ہوا جہاں "خبروں" کی جگہ "سماچار" کا استعمال ہوا اور خبروں کے ہندوستانی متن میں زیادہ سے زیادہ سنسکرت آمیز الفاظ شامل کیے گئے۔ الفاظ کو اس طرح رد کرنے سے جہاں عربی اور فارسی کے الفاظ کو مشترکہ زبان کے سلسلے میں متروک قرار دیا گیا۔ وہیں ایسے لسانی رویے کے سیاسی مضمرات بھی کھل کر سامنے آگئے کہ لفظیات کو شدھ کرنے سے مسلمانوں کے ملّی وجود کو ختم کرنے کے رجحانات ظاہر ہوئے ہیں اور لسانی دائرہ کار میں مسلمانوں کے تاریخی اور تہذیبی تشخص کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ کانگرس کے لائحہ عمل میں زبان کا مسئلہ دراصل سیاسی مقاصد ہی کا ایک رویہ تھا۔ جو ہندوستانی زبان کو عربی فارسی الفاظ سے پاک کرتے ہوئے اس زبان کو پراچین بھارت کی بھاشا میں بدلنے کے لیے سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق تھا تاکہ آزاد ہندوستان، ہندو احیاء کے مطابق اپنی پہچان رونما کر سکے!

جس ہندوستانی زبان کے تصور کے بارے میں لفظیات کا ذکر کیا گیا ہے اس کے ضمن میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ لسانی طور پر رسم الخط کے معاملے میں بھی کوئی شک باقی نہ تھا کہ رسم الخط بہر صورت دیوناگری ہوگا۔ اس طرح لفظیات اور رسم الخط دونوں کا تعلق سیاسی عزائم سے تھا۔ جہاں کانگرس کے لائحہ عمل کے مطابق ان عزائم سے ہندو احیاء کے اغراض و مقاصد کی پیروی کرنا مقصود تھا وہیں یہ مقاصد برصغیر کے مسلمانوں کے لیے تشویش پیدا کرتے تھے۔ ایسی صورت حال میں اردو مسلمانوں کی پہچان تھی، ان کے تاریخی تشخص کی نشاندہی کرتی تھی اور ان کے ملّی وجود کے استحکام کی علامت تھی۔ برصغیر کے جس لسانی عمل کا ذکر کیا گیا ہے جس کی رہنمائی کانگرس کرتی تھی، اس کے منطقی رجحانات کے نتیجے میں اردو کا وجود برابر نظر انداز کیا گیا تھا۔ دراصل اردو نظر انداز نہیں ہوئی تھی بلکہ مسلمانوں کے ملّی وجود کو نظر انداز کیا گیا

تھا۔ ان حالات میں اردو کے ساتھ مسلمانوں کا ملّی رشتہ مسلمانوں کی قومیت کو نمایاں کرتا ہے اور اردو اس قومیت کا واضح اظہار بن کر سامنے آتی ہے۔

قوموں کی تاریخ میں اور قومیت کی تشکیل میں الفاظ کی اہمیت ہمیشہ مرکزی رہی ہے۔ زبانوں کی نشوونما کے دوران میں الفاظ آتے جاتے رہتے ہیں، انھیں متروک قرار دیا جاتا رہا ہے اور دوسری زبانوں سے الفاظ بھی مستعار لیے گئے ہیں۔ زبانوں کی لفظیات اس اعتبار سے ایک متحرک شے ہے اور اس کے ساتھ زبانوں کی صلاحیت اظہار کے امکانات بھی ظاہر ہوتے ہیں لیکن زبانوں کی ایسی نشوونما عموماً آزاد ماحول میں ہوتی ہے۔ وہ کسی جبریت کے تحت اپنے نشوونما کے عمل کو قبول نہیں کرتیں۔ لیکن جہاں زبانیں متحارب لسانی اور تہذیبی گروہوں کے درمیان موجود ہوں اور ہر گروہ اپنے تہذیبی حوالوں سے اپنے عمرانی اور سیاسی عمل کو نمایاں کرتا ہو وہاں زبانوں کا مسئلہ آزاد ماحول کی شرط سے محروم ہوتا ہے۔ کچھ یہی کیفیت برصغیر میں اردو ہندی اور ہندوستانی کی تھی۔ کانگرس کا لائحہ عمل اردو کو اس کے تاریخی حق سے محروم کرتا تھا اور زبانوں کے معاملے میں مسلمان آزاد ماحول کی شرط سے بھی محروم تھے۔ لسانی فیصلے کانگرس کی مرضی کے تابع تھے۔

اس امر سے بہت کم اختلاف ممکن ہے کہ لفظ کوئی بے جان شے نہیں ہے۔ لفظ جہاں ایک خارجی پیکر کے طور پر موجود رہتا ہے وہیں اس کے ذریعے انسان کے کردار کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے لفظ اور انسان کا رشتہ بنیادی نوعیت کا ہے۔ ہر زبان کی لفظیات اس زبان کے تہذیبی اور تاریخی پس منظر سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح ہر لفظ اس پس منظر کی نشاندہی کرتا ہے۔ لفظ ہی واحد ذریعہ ہے جو کسی فرد کا رشتہ اس کے تہذیبی اور تاریخی پس منظر کے ساتھ قائم کرتا ہے۔ تاہم زبان محض گفتگو ہی کی زبان نہیں ہوتی۔ معاشرے کے ساتھ اس کے رشتے نہایت جامع نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس لیے الفاظ کے بدلنے سے رشتے بدلے جا سکتے ہیں اور فرد کے ذہن کو ایک تہذیبی پس منظر سے کسی دوسرے تہذیبی پس منظر میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں شعری زبان کا ذکر قابل غور ہے۔ اردو زبان الفاظ کے ساتھ ساتھ محاکات کی زبان بھی ہے۔ اس زمانے میں جس کا ذکر کیا جا رہا ہے عموماً کہا جاتا تھا کہ اردو شاعری ہندوستان کے بجائے بیرونی ملکوں کا تذکرہ کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص بہادر ہے تو وہ صرف رستم ہے کوئی شخص اگر سخی ہے تو وہ حاتم طائی ہے اور اگر محبت کی کوئی عظیم الشان کہانی ہے تو وہ یا تو شیریں فرہاد کی ہے یا لیلیٰ مجنوں ہی کی ہے۔ درخت ہے تو سرو کا، پھول ہیں تو لالہ و نسترن ہیں، اور پرندہ ہے تو وہ بلبل ہے۔ --------- اس

زمانے میں کہا جاتا تھا کہ کیا ہندوستان میں ارجن اور بھشیم نہیں ہیں۔ کیا رام چندر کو مثالی کردار نہیں بنایا جا سکتا اور کیا نل اور دمینتی کی کہانی لیلی مجنوں اور شیریں فرہاد سے بہتر نہیں ہے۔ کیا ہمارے درخت ایران کے سرو سے بہتر نہیں ہیں؟ اور کیا ہماری کوئل ایرانی بلبل سے زیادہ اچھی نہیں ہے؟ ان باتوں سے ایک ہی نتیجہ نکلتا تھا کہ اردو شاعری کی زبان، اپنے وطن اور اپنی سرزمین کے بجائے ایران اور عرب کے ساتھ لگاؤ پیدا کرتی ہے۔ ایسے رد عمل کا اظہار چکبست کی نظموں میں بخوبی دکھائی دیتا ہے۔

یہی رد عمل اس زمانے کے شدید سیاسی اور تہذیبی رویوں کی نشاندہی کرتے ہوئے جہاں اردو زبان کی لفظیات کو رد کرتا تھا اور ہندوستانی زبان کی لفظیات میں پراچین بھارت کے تہذیبی پس منظر کو شامل کرتا تھا وہیں مسلمانوں کے لیے اپنی قومیت کی تشکیل کو اور زیادہ ضروری بناتا تھا۔ ایسے منفی رویے مسلمانوں کے تہذیبی مستقبل کو مخدوش اور تشویش ناک صورت دیتے تھے۔

برصغیر میں مسلمانوں کی قومیت کے تصور اور اس کی تشکیل کے عمل کو جہاں متعدد دوسرے محرکات کی روشنی میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے وہاں زبان کا مسئلہ ایک ایسا واضح نشان راہ ہے جہاں برصغیر کے تہذیبی حالات اپنی ساری سنگینی کے ساتھ واضح ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زبانیں انسانوں کے میل ملاپ سے پیدا ہوتی ہیں اور میل ملاپ ہی سے نشوونما پاتی ہیں۔ اردو زبان ایسے ہی رشتے کی نشاندہی کرتی تھی اور برصغیر کے تہذیبی اور تعلیم یافتہ طبقوں میں اس زبان کا نمایاں عمل دخل تھا۔ تاہم ایسی زبان کو بے دخل کرنے کی تحریک کو محض لسانی رویہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خیال کرنا کہ غالباً ہندوؤں کو ہندی سے زیادہ لگاؤ تھا اس لیے وہ اردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کے خواہاں تھے۔ بہت حد تک درست دکھائی نہیں دیتا۔ برصغیر میں ہندوؤں کی اکثریت اوران کے کلچر میں دوسرے تہذیبی گروہوں کو ان کی شناخت سے محروم کرنے کے رویے ایسے مستقل مضمرات تھے جن کی موجودگی میں زبان کا مسئلہ محض لسانی سوال تک ہی محدود نہیں رہتا تھا بلکہ یہ سوال جہاں انڈین نیشنلزم کے پردے میں ہندو احیاء کو نمایاں کرتا تھا وہیں برصغیر کے مسلمانوں کی شناخت اور پہچان کو تلف کرنے کی روش کو ظاہر بھی کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ہندوستانی زبان کی لفظیات کا پس منظر قابل توجہ ہے۔ لفظیات کے بدلتے ہوئے پس منظر کو نمایاں کرتے ہوئے ہندوستانی زبان مسلمانوں کے تہذیبی وجود کو یکسر فراموش کرتی تھی۔ ایسے رویے کو دانستہ طور پر اپنایا گیا تھا۔

تاہم جس زمانے میں ہندوستانی زبان کا تصور اور عام فہم زبان کے پردے

میں سنسکرت کے الفاظ کو استعمال کرنے کی تحریک کا شدّ و مدّ کے ساتھ چرچا ہوا اسی زمانے میں اردو زبان اور ادب میں بے حد فروغ ہوا۔ اردو کو علمی زبان کے طور پر آزمانے کے لیے نظام دکن کے حکم سے حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی جہاں اعلیٰ تعلیمی مدارج میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایاگیا۔ مسلمانوں کی درس گاہوں میں اردو کے فروغ کے لیے انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) قائم ہوئی اور تالیف اور ترجمہ کے کاموں پر زیادہ توجہ دی گئی۔ یہ زمانہ اردو صحافت کا نہایت قابل ذکر زمانہ بھی تھا۔ اردو زبان میں چھپنے والی کتابوں میں بھی کئی گنا زیادہ اضافہ ہوا۔ اردو کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں منشی پریم چند کی شہرت اردو میں کہانیاں لکھنے سے ہوئی تھی۔ انہوں نے ہندی میں اپنی کتابوں کے ترجمے بعد ازاں کیے تھے۔ اسی زمانے میں حلقۂ ارباب ذوق (لاہور) قائم ہوا۔ اس انجمن کے اجلاس منعقدہ ۵ نومبر ۱۹۳۹ء میں حلقے کے اغراض و مقاصد پڑھ کر سنائے گئے تھے جن کا ذکر بھی کم اہم نہیں ہے۔ ان اغراض و مقاصد کو بڑی سوچ بچار اور غور و خوض کے بعد مرتب کیا گیا تھا۔ اغراض و مقاصد یہ تھے؛

۱۔ اردو کی ترویج واشاعت

۲۔ نوجوان لکھنے والوں کی تعلیم و تفریح

۳۔ اردو لکھنے والوں کے حقوق کی حفاظت

۴۔ تنقیدی ادب میں خلوص و بے تکلفی پیدا کرنا

۵۔ اردو ادب اور صحافت کے ناساز گار ماحول کو صاف کرنا......

زبان کے مسئلے کی موجودگی میں حلقۂ ارباب ذوق (لاہور) کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس انجمن کے قیام سے قبل انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آچکا تھا اور ۱۹۳۶ء کے اجلاس اور اس اجلاس میں منظور کردہ منشور کے بعد ترقی پسند تحریک کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیاتھا۔ ترقی پسند تحریک کا مزاج کانگرس کے علمی اور عقلی رویوں سے بے حد متاثر تھا۔ وہ برصغیر کے لوگوں کو "عوام" کے عمومی القاب سےموسوم کرتی تھی اور زبانوں کےمسئلے پر اردو زبان کو برصغیر کی دوسری زبانوں کے برابر تصور کرتی تھی۔ اس اعتبار سے یہ تحریک مسلمانوں کی قومیت کے تصور کو یکسر نظرانداز کرتی تھی۔ اس کے دائرہ کار میں نہ تو لفظ "مسلمان" اہم تھا اور نہ زبان کے حوالے سے "اردو" کا کوئی نمایاں تشخص تھا۔ اس تحریک کے مطابق "اردو" محض وسیلۂ اظہار تھی اور اس زبان کا اس کے تہذیبی مافی الضمیر سے غالباً کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ تحریک ایک مبہم اور غیر واضح نئے ہندوستان کے مستقبل کی طرف اشارا کرتی تھی اور ماضی

کے بارے میں تشکیک کے رویے پیدا کرتی تھی۔ ترقی پسند تحریک کو اس بات سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی کہ اردو زبان ہند اسلامی کلچر کا ایک شاندار کارنامہ ہے!

۱۹۳۰ء کے عشرے کے دوران، جب برصغیر کی لسانی اور سیاسی فضا، ہندوستانی زبان، ناگری رسم الخط اور کانگرس کے تصور قومیت سے بے حد متاثر تھی، مسلم برصغیر مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے تصور کی جدوجہد میں سرگرم عمل تھا۔ اس جدوجہد کی ایک واضح صورت اردو زبان کے تحفظ اور اس کی اشاعت و ترویج سے متعلق تھی۔ حلقہ ارباب ذوق (لاہور) نے اردو زبان کو اپنے اغراض و مقاصد میں اولیت دے کر مسلم قومیت کے لسانی اور تہذیبی شعور کی تصدیق کی تھی۔ تاہم اس ضمن میں یہ کہنا کہ حلقے کے بانیوں کی نگاہ میں کوئی سیاسی مقصد نہ تھا اس لیے بھی ناقابل قبول ہے کہ حلقے کے بانیوں میں سے بیشتر کا تعلق اسلامیہ کالج لاہور سے تھا اور وہ کالج کے مجلے "کریسنٹ" کے ایڈیٹر اور مضموں نگار بھی تھے۔ اس سلسلے میں قابل غور یہ بھی ہے کہ انہی دنوں اسلامیہ کالج لاہور کے میگزین "کریسنٹ" کا پاکستان نمبر بھی شائع ہوا تھا۔ تعلیم یافتہ طبقوں میں اردو مسلمانوں کی ملّی زبان کا مقام رکھتی تھی۔ اس لیے جب حلقہ ارباب ذوق کا قیام عمل میں آیا اس وقت اردو ہی کے فروغ کا مقصد ان بالغ نظر نوجوانوں کے پیش نظر تھا جنھوں نے اس انجمن کو قائم کیا تھا۔[1]

تاہم اگرچہ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے بارے میں رویوں کا اختلاف کارفرما تھا، یہ بات واقعی قابل تعریف تھی کہ تخلیقی ادب کے ان دونوں مرکزوں نے اس عہد کے نئے ذہن کو اپنی جانب راغب کرتے ہوئے اردو ادب میں قابل رشک اضافہ کیا تھا اور تخلیقی امکانات کی بے پناہ گنجائش پیدا کی تھی۔ دونوں نے نئے علوم کو ادب کا موضوع بنا کر اردو زبان کے دامن کو کشادہ کیا اور اردو کے وقار میں اضافہ کیا۔ اردو کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ اس زبان میں لکھنے والے برصغیر کے تمدن کی علامت بن گئے۔ جرائد و رسائل کے ذریعے اردو زبان ایک نئی شان و شوکت کے ساتھ (اور جنگ کے دوران) برٹش انڈین ایمپائر کے طول و عرض میں نئے طرز احساس اور قابل اعتماد صلاحیت اظہار کی

۱۔ ۱۹۳۰ء میں جب میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا میری تابش صدیقی سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے حلقے کے بارے میں تابش صدیقی سے کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ انھوں نے اردو زبان کے بارے میں ایسے احساسات ہی کا ذکر کیا تھا جن کو بیان کیا گیا ہے۔

نشاندہی کرنے لگی۔ اسی زمانے میں برصغیر کے مسلم علاقوں میں "اردو بولو" تحریک کا آغاز بھی ہوا۔ لاہور میں "ادبی دنیا" نے اس تحریک کے نقیب کے طور پر فرائض انجام دیئے۔ مولانا صلاح الدین احمد کا نام اس ضمن میں قابل ذکر ہے۔ انھوں نے اردو پڑھو، اردو لکھو اور اردو بولو کے تہذیبی رویوں کو علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول کیا۔ برصغیر کی مسلم سیاست میں یہی وہ زمانہ تھا جب آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے وقت ہدایت کی کہ مسلمان اپنی زبان کے خانے میں اردو زبان درج کرائیں۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری اس اعتبار سے مسلمانوں کے ملّی وجود کے اثبات کی جانب ایک اہم قدم تھا اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے، اردو زبان اس وجود کا اثبات بن کر رونما ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں اردو قومی وحدت کی علامت بن چکی تھی۔

اس زمانے کے لسانی نقشے کو دیکھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ زبان کے معاملے میں دو رویے واضح طور پر رونما ہوچکے تھے۔ ایک رویہ ہندو احیاء کا رویہ تھا جو ناگری رسم الخط ہندی / ہندوستانی زبان اور ہندو آرتھک لفظیات کے حوالے سے نمایاں ہوتا تھا اور دوسرا رویہ ہند اسلامی کلچر کا رویہ تھا جو فارسی رسم الخط، اردو زبان اور اسلامی تہذیبی لفظیات سے پیدا ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان کے مسئلے پر برصغیر سیاسی تقسیم سے بہت پہلے دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور ان دو منطقوں کو ناگری رسم الخط تقسیم کرتا تھا۔ اسلامی برصغیر کا تشخص اردو تھا اور ہندو آرتھک جاتی کی پہچان ہندی اور ہندوستانی تھی۔ دونوں قومیں پہچان کی ان دو علامتوں کے گرد متحد ہوچکی تھیں۔ مسلمان اردو کے ذریعے پہچانے جاتےتھے اور ہندو(کانگرسی اور غیر کانگرسی) ہندی کے ذریعے جانے جاتے تھے۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد اردو ہی میں لکھتی تھی اور ہندو پریس میں اردو صحافت کا بہت غلبہ بھی تھا۔ لیکن شناخت کے اعتبار سے اردو مسلمانوں کی پہچان بن چکی تھی اور ہندی سےمسلمانوں کا تشخص پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اردو لکھنے والوں میں ہندو بھی کافی تعداد میں شامل تھے لیکن ہندی لکھنے والوں میں مسلمان دکھائی نہیں دیتے تھے۔ تہذیبی اعتبار سے مسلمانوں نے اردو ہی کو اپنا تشخص قرار دیا تھا خواہ سیاسی طور پر ان کے رویے کتنے ہی اختلافی کیوں نہ تھے۔ اردو زبان نے مسلمانوں کو تہذیبی وحدت، ملّی وجود اور سیاسی تشخص فراہم کیا تھا۔ برصغیر کے وسیع و عریض علاقوں میں اس زبان کے ذریعے مسلمانوں کی اجتماعی وحدت، تہذیبی شخصیت ملّی وجود اور سیاسی قومیت کی نشاندہی ممکن ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی تحریک آزادی میں اردو زبان کا ایسا کردار ہر اعتبار سے منفرد ہے۔

۱۰۔ قومیت کی تشکیل

برصغیر کی تاریخ میں مسلم قومیت کی تشکیل ایک منفرد واقعہ ہے۔ دنیا کی تاریخ میں بھی ایسی مثال بہت کم ملتی ہے۔ قومیت کے جس تصور سے عہد حاضر کا انسان عموماً آشنا ہوا ہے وہ جغرافیائی وطن سے قومیت کو اخذ کرتا ہے۔ جغرافیائی وطن کا ہر صورت میں پہلے سے موجود ہونا ضروری ہے۔ برصغیر کی سیاسی تاریخ میں جغرافیائی وطن اس اعتبار سےموجود نہ تھا کہ کانگریس اور ہندو مہاسبھا اور دوسری تنظیمیں جغرافیائی وطن کو آریاورت قرار دیتی تھیں اور اس نقطۂ نظر کی موجودگی میں برصغیر کو صرف آریائی آریہ نژاد ہندوؤں اور ہندو دھرم کا وطن گردانتی تھیں۔ ایسے استدلال سے یہ بات بھی واضح ہوتی تھی کہ آریہ ورت مسلمانوں کا وطن نہیں ہے۔ ہندو احیاء کی تحریک بھی ایسے ہی وطن اور ایسی ہی ماتری بھومی کی تائید کرتی تھی۔ اس سے صرف دو باتیں نمایاں ہوتی تھیں یعنی کہ جغرافیائی وطن دراصل آریہ ورت ہے اور اس پر حکومت کرنے کا حق صرف ہندوؤں کو ہے۔ ایسے رویے کی موجودگی میں ہندو مسلم تناسب اور مراعات و تحفظات پر برابر ڈیڈلاک پیدا ہوتا رہا تھا۔ کانگریس کی قیادت مسلمانوں کو برابری کی بنیاد پر قبول کرنے سے منکر تھی اور اپنے وطن کو اپنے آدرشوں کی روشنی میں نہ صرف حاصل کرنےکی خواہشمند تھی بلکہ مستقبل کے خدوخال بھی انہی آدرشوں کی موجودگی ہی میں تراشنے کی آرزو کرتی تھی۔ ایسے رویوں کی موجودگی میں مسلمانوں کی قومیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کو صرف اقلیت ہی کے طور پر قبول کیا جا سکتا تھا۔

تاہم حقیقت یہ تھی کہ برصغیر میں مسلمان ایک ہزار برس سے برابر موجود تھے جن میں کم ازکم نوسو برس کی مدت ایسی تھی جب وہ صاحب اقتدار تھے اور برصغیر پر ان کی حکمرانی رہی تھی۔ علاوہ ازیں برصغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق کےعلاقوں میں ان کی اکثریت بھی تھی۔ یہ دونوں صداقتیں تاریخی تھیں اور تاریخ کے حوالے سے مسلمانوں کا وجود، ان کی حکومت اور ان کا اقتدار ثابت ہوتا تھا۔ اسی تاریخ نے برصغیر میں ہند اسلامی کلچر پیدا کیا تھا اور اسی تاریخ کے ساتھ برصغیر میں ان کا ماضی وابستہ تھا۔ اس اعتبار سےجب عظمت رفتہ کا موضوع ابھرتا تھا تو ان کے سارے رشتے برصغیر کے ماضی ہی کو بیان کرتے تھے۔ اس طرح برصغیر میں مسلمانوں کا زمانۂ ماضی ان کی اپنی پہچان بھی تھا۔ تاریخ کے اس پھیلے ہوئے منظر میں مسلمانوں کی تہذیب سانس لیتی تھی۔ زمانۂ

ماضی میں مسلمانوں کی تاریخ اور ان کی تہذیب موجود تھی لیکن عہد حاضر میں ان کا سامنا جن مخالف قوتوں سے تھا وہ تاریخ اور تہذیب دونوں کو قبول کرنے سے انکاری تھیں۔ اسی عہد حاضر سے برصغیر میں ان کے مستقبل کو رونما ہونا تھا۔ مستقبل کا انحصار عہد حاضر کے حالات پر تھا۔ عہد حاضر نہ تو ارض ورت کو ان کا وطن قرار دیتا تھا اور نہ ان کے تاریخ اور تہذیبی ہی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتاتھا۔ اس لیے ایک ہی سوال سامنے آتا تھا کہ اگر انگریز برصغیر سے چلے گئے تو کیا ہوگا؟

برصغیر میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کو زمانے کے وسیع تر پس منظر میں دیکھتے ہوئے دو باتیں بخوبی واضح ہوتی ہیں۔ ایک کا تعلق مسلمانوں کے ملی وجود سے ہے اور دوسری مسلمانوں کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی قومیت کا تصور بھی انھی دونوں حوالوں سے مرتب ہوا تھا۔ تاہم ملی وجود اور تاریخ دونوں جغرافیائی قومیت کے دائرے سے باہر تھے۔ کیوں کہ برصغیر کی جغرافیائی قومیت ہندو ماتری بھومی کی نشاندہی کرتی تھی۔ بیسویں صدی کے دوران (اور انڈین ایمپائر کے زمانے میں) برصغیر کا سیاسی عمل، مغربی جمہوریت اور اکثریت کے اصول کی مطابقت میں کار فرما تھا اس لیے، ملی وجود اور مسلمانوں کی تاریخ، دونوں اس سیاسی عمل کو زد میں تھے۔ اس سیاسی عمل کی قیادت کانگرس کرتی تھی۔ ----- ان حالات میں مسلم سیاست اور ہندو سیاست میں ایک بنیادی فرق رونما ہوا تھا۔ کانگرس اور ہندو خالصتاً سیاسی عوامل کے تحت جدوجہد میں مصروف تھے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ تہذیبی تھا اور اس مسئلے میں ان کا ملی وجود بھی شامل تھا اور ان کی تاریخ بھی شامل تھی اس مسئلے کی سنگینی یہ تھی کہ اگر مسلمانوں کا ملی وجود ہی باقی نہ رہا تو سیاسی جدوجہد کا کچھ بھی مطلب نہ ہوگا۔ درحقیقت اس زمانے میں مسلم سیاست اپنی اعلیٰ ترین جہتوں میں مسلمانوں کی بقا ہی کے لیے جدوجہد تھی۔ اس اعتبار سے ملی وجود کا تحفظ اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا شعور، دونوں کے لیے ایک ہی فکری استعارہ استعمال ہوا جسے مسلمانوں کے تہذیبی وجود اور مسلمانوں کی تہذیب سے موسوم کیا گیا تھا۔

جغرافیائی قومیت اور مسلمانوں کے ملی (تہذیبی اور تاریخی) وجود کے مسئلے کو علامہ اقبال بڑی بصیرت کے ساتھ زیربحث لائے اور اس کا حل دریافت کیا تھا۔ قومیت کا مغربی تصور جو جغرافیائی قومیت کو اساس بناتا ہے حالات کے ایک متحرک نقشے میں پیدا ہوا تھا۔ یورپ کی پرانی سلطنتوں کے خاتمے کے نتیجے میں نئی قومیں معرض وجود میں آئی تھیں اور نئے خطۂ زمیں کے ساتھ جغرافیائی

قومیت رونما ہوئی تھی۔ ۱۹۳۵ء سے پہلے برما ہندوستان کا حصہ تھا اور برما کے باشندے انڈین کہلاتے تھے لیکن ۱۹۳۵ء کے بعد جب برما کو ایک علیحدہ ملک بنایا گیا تو برمی قومیت آشکار ہوئی تھی۔ اسی طرح آئرلینڈ کے لوگ آئرش ضرور تھے لیکن ان کا آئرش ہونا تاریخی، تہذیبی اور مذہبی حقیقتوں کی بناء پر تھا۔ سیاسی طور پر ان کی قومیت انگلش تھی۔ لیکن آئرلینڈ کی آزادی کے بعد آئرش قومیت ظاہر ہوئی۔ ان دونوں مثالوں میں جغرافیہ اور تاریخ ہم آہنگ تھے اور قومیت جغرافیے اور تاریخ کے باہمی رابطے سے پیدا ہوئی تھی۔ تاہم اس ضمن میں جو نظیر ظاہر ہوئی تھی یہ تھی کہ دستوری اور آئینی طور پر نیا ملک تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ قائداعظم نے آئرلینڈ ہی کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۹۴۱ء میں کہا تھا کہ نقشے پر ایک لکیر ہی کے کھینچنے سے نیا ملک تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی لمبے بندوبست کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نقشے پر اسی طرح نئی لکیروں کے ذریعے عرب ممالک نمودار ہوئے تھے اور بلقان کے علاقے میں نئی قومیں ظاہر ہوئی تھیں۔ تاہم نئی قوموں کے ظہور کا ایسا منظر اس اعتبار سے قابل ذکر تھا کہ اس میں قومیت کے ساتھ مملکت بھی تخلیق ہوئی تھی۔ لیکن برصغیر میں ایسے عمل کے امکانات مسلمانوں کے لیے بے حد تشویش ناک تھے۔

اقبال کے سیاسی فکر کے مطابق جہاں وطن اور قوم کی وحدت موجود ہو وہاں قومیت کا تصور سیاسی طور پر مملکت کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ جس طرح مصر میں اہل مصر اور شام میں اہل شام موجود تھے اس لیے مصر اور شام ظاہر ہوئے تھے۔ ایران کی قومیت میں بھی اسی طرح تاریخ اور جغرافیے کا باہمی رابطہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن برصغیر میں قومیت کا ایسا تصور قابل عمل نہیں ہے کیوں کہ غیر مسلم اکثریت کے اندر بسنے والی مسلم اقلیت، ایسے تصور کے تحت ناپید ہوسکتی ہے۔ اس ضمن میں یہ اقتباس قابل غور ہے۔ نیشنلزم کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کا کہنا ہے۔

> "نیشنلزم مسلمانوں کے لیے اس وقت ایک سنگین مسئلہ بنتا ہے جب ان کی حیثیت کسی ملک میں اقلیت کی ہو۔ ان حالات میں نیشنلزم کا ایک ہی تقاضہ ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے تشخص سے کلی طور پر دستبردار ہو جائیں۔ ------ اور اپنے آپ کو نیشنلزم کی ضرورتوں کے تحت پوری طرح ناپید کر دیں - ------"

اس اعتبار سے قومیت کا مغربی تصور مسلمانوں کے لیےنقصان دہ تھا۔ --- علامہ اقبال نے نیشنلزم کو خطۂ زمین کے حوالے سے ناقابل قبول قرار دیا اور اس امر کی طرف اشارا کیا کہ خطۂ زمین بسا اوقات پائیدار اصول بھی نہیں ہے۔

نیشنلزم دراصل خطۂ زمیں پر بسنے والے لوگوں کے عقائد اور اصولوں کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس ہم آہنگی میں جغرافیہ بھی کسی قسم کا مؤثر کردار ادا نہیں کرتا۔ جغرافیہ اصولوں اور عقائد کی ہم آہنگی کے لیے مکانی وسیلے کے سوا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس اعتبار سے نیشنلزم ایک زمانی تصور ہے جو عقائد اصولوں اور روایات کی وساطت سے صورت پذیر ہوتا ہے۔ تاریخ اور تہذیب، نیشنلزم کے زمانی تصور کی نمایاں صورتیں ہیں۔ ----- علامہ اقبال کے سیاسی فکر نے اس استدلال کے ذریعے برصغیر کے سیاسی نقشے سے وطن اور خطۂ زمین کے اجزا کو منہا کر دیا اور اس طرح ہندو ذہن کے اس تعصب کو زائل کیا کہ آریہ ورت مسلمانوں کا وطن نہیں ہے۔ کیوں کہ مسلمان اس سرزمین میں باہر سے آئے ہیں۔ تاہم خواہ مسلمانوں کا برصغیر کے خطۂ زمین سے کوئی تعلق تھا یا نہیں تھا، یہ حقیقت برابر طے تھی کہ اصولوں اور عقائد اور روایات کی بناء پر انکا اپنا ایک تشخص ضرور ہے اور وہ اس تشخص کو کانگرس کے بتائے اور بنائے ہوئے نیشنلزم میں نابود اور ناپید کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوسکتے۔ علامہ اقبال اس تشخص کو ملت اور قوم کی اصطلاح کے ذریعے بیان کرتے ہیں اور عموماً قوم سے مسلمانوں کا ملّی وجود مراد ہوتا ہے۔ اس ضمن میں پنڈت نہرو کے سوشلزم اور اقتصادی مسئلے کی طرف اشارا کرتے ہوئے علامہ اقبال کا کہنا ہے؛

> " اس موقع پر لازم ہو چکا ہے کہ ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر دنیا کو یہ بات کھل کر بتا دی جائے کہ صرف اقتصادی مسئلہ ہی اس ملک کا واحد مسئلہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کا تہذیبی مسئلہ ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ کم ازکم اقتصادی مسئلہ اس مسئلے کے مقابلےمیں اس قدر اہم نہیں ہے۔ -----" ۱

اسی ضمن میں مولانا حسین احمد مدنی کے اس نظریے کا ذکر کرتے ہوئے کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں۔ علامہ اقبال کا کہنا ہے؛

> " مولانا کی اس رائے سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں کی قومیت اس خطۂ زمین کے حوالے سے پیدا ہوتی ہے جہاں وہ آباد ہوتے ہیں اور رہتے بستے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ قدیم زمانے سے لوگ اپنے علاقے سے پہچانے جاتے رہے ہیں اور علاقے اپنی قوموں سے جانے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم سب ہندوستان کے رہنے والے ہیں اور انڈین ہیں کیوں کہ ہم دنیا کے اس علاقے میں رہتے ہیں جسے ہندوستان (انڈیا) کہا

۱۔ اقتباس از Ideological Foundations of Pakistan: Dr. Waheed Qureshi.

جاتا ہے۔ ایسے پس منظر میں "ملک" کی تمام تر اہمیت جغرافیائی ہے اور ملک کا تصور بھی اسلام سے کسی طرح متصادم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ملک کی سرحدیں وقت کے ساتھ عموماً بدلتی رہتی ہیں۔ ملک کے ایسے تصور کے ساتھ لگاؤ انسان کی فطرت میں ہے۔ ------ لیکن عہد حاضر میں اور خاص طور پر اس زمانے کے سیاسی نظریات کے مطابق قوم اور قومیت کاتصور کلیتاً جغرافیائی نہیں ہے بلکہ یہ تصور (قومیت) انسانی معاشرے کا ایک بنیادی اصول بن چکا ہے اور یوں یہ تصور ایک سیاسی تصور کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ چونکہ اسلام بھی انسانی معاشرتی زندگی کے لیے قانون وضع کرتا ہے۔ اس لیے جب "وطن" یا "ملک" کو جدید سیاسی معانی میں استعمال کیا جاتا ہے تو ایسا سیاسی تصور فوری طور پر اسلام کے ساتھ متصادم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ اسلام اپنے قوانین کی موجودگی میں کسی دوسرے قانون کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اسلام کی نظر میں ایسا قانون ادھورا اور نامکمل ہے اور اسے کسی طرح قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ------"

اسی موضوع کے بارے میں علامہ اقبال، قائد اعظم کے نام اپنے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔ ------

"جہاں تک جواہر لال کے سوشلزم کا تعلق ہے اس کے بارے میں میری رائے ہے کہ مسلمانوں پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوگا۔ تاہم یہ سوال اہم ہے کہ مسلمانوں کی معاشی تنگدستی اور غربت و افلاس کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی قوانین کے نفاذ میں دکھائی دیتا ہے۔ جنہیں عہد حاضر کے خیالات کی روشنی میں آئندہ کے لیے ساز گار بنایا جاسکتا ہے۔ اسلامی فقہ اور شریعت پر طویل غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اسلامی شریعت کو درست اور صحیح طور پر سمجھا جائے اور اس کا درست طریق کار کے مطابق نفاذ کیا جائے تو کوئی شخص زندگی کی عام ضروریات سےمحروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن شریعت کو کسی آزاد خطۂ زمین کے حصول کے بغیر نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ ------ تاہم مسلمانوں کے مسائل اس وقت تک حل نہیں ہوسکتے جب تک کہ ملک (برصغیر) کی سرحدوں میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جاتااور ایک یا ایک سے زائد آزاد مسلم مملکت کا قیام عمل میں نہیں آتا۔ ------- جواہر لال کے سوشلزم کا یہی ایک بہترین جواب ہے۔ -----" [علامہ اقبال کا خط ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء]۔

گزشتہ دو سو برس کے عرصے میں بیشتر قوموں کی آزادی کی تحریکیں تہذیبی عوامل کے نتیجےمیں ظاہر ہوئی ہیں۔ خلافت عثمانیہ کے یورپی مقبوضات میں جزیرہ نمائے بلقان کی متعدد قوموں کو مسیحی تشخص کی بناء پر ترکوں سے الگ عمرانی اور تہذیبی اکائیاں قرار دیا گیا تھا اور زار روس کی حکومت ان اقوام کے مسیحی تشخص کو ایک بنیادی اصول گردانتی تھی۔ کچھ اسی طرح آئرلینڈ میں آئرش تشخص رومن کیتھولک ہونے سے پیدا ہوتاتھا ان دونوں صورتوں میں دین مسیح اور رومن کیتھولک کے مذہبی تلازمے تہذیبی انفرادیت کی نشاندہی کرتے تھے مذہبی تفاوت کے سیاسی مضمرات بے حد نمایاں تھے۔ اس لیے آئرلینڈ کو رومن کیتھولک مملکت اور شمالی آئرلینڈ کے پروٹسٹنٹ صوبے میں تقسیم کر دیا گیا تھا تاہم ان کے باہمی تنازعات بدستور سیاسی بے چینی پیدا کرتے رہے ہیں۔ برصغیر میں ہر چند کہ ہندو ذات پات کے نظام کے تحت لوگوں کو گروہوں کے حوالے سے پہچاننے کی رسم عام تھی۔ پھر بھی ایک وسیع تر جائزے میں ان کا تشخص مذہب اور دھرم ہی سے رونما ہوتا تھا۔ اس تشخص نے ان کی آبادیوں کو ایک دوسرے سے الگ کر رکھا تھا اور شہروں میں ان کے محلے بھی الگ الگ تھے۔ مذہبی اعتبار سے ان کی مخلوط آبادی بحالت مجبوری دکھائی دیتی تھی اور وہاں بھی مذہبی تشخص، گھروں کی دیواروں کے یکساں ہونے کے باوجود، مسافت مکانی کا سبب بنتا تھا۔ ایک ہزار برس کی رفاقت کے بعد ایسا ہونا بعیداز فہم ضرور ہے تاہم یہ تسلیم کرنا زیادہ مناسب ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان رفاقت غالباً سرے ہی سے موجود نہیں تھی۔ اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو (اور اس کا مطالعہ بے حد ضروری بھی ہے) تاہم حقیقت یہی ہےکہ برصغیر میں مسلمان اور ہندو الگ الگ تشخص رکھتے تھے اور ان کاتہذیبی وجود بھی منفرد اور الگ تھا۔

مذہبی تشخص کی اس اجتماعی نفسیات کے پیش نظر جس کی اصل وجہ ہندو معاشرے کا نظام ذات پات تھا، جہاں انسانوں کے مابین انسانی قدروں کا اشتراک ممکن نہ تھا اور جہاں ہندوؤں کے نظریۂ اخلاقیات کے مطابق مسلمانوں سے چھوت چھات روا تھی اور مسلمان کو "ملیچھ" گردانا جاتا تھا، کسی قسم کا جمہوری عمل مسلمانوں کے لیے سود مند ثابت نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسی اکثریت کی موجودگی میں جو تعصب اور غیر انسانی رویوں کو انسانی رویے قرار دینے کی عادی تھی، مسلمانوں کا اقلیت بن کر جینا دراصل ان کے نیست و نابود ہونے کے مترادف تھا۔ ان حقیقی خدشات کی روشنی میں فکر اقبال کی وہ جہتیں رونما ہوئی تھیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

فکر اقبال کے مطابق برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخی موجودگی سے

مسلمانوں کا ملّی وجود برآمد ہوتا تھا لیکن اپنے تشخص، اور شعور کے بغیر اس ملّی وجود سے سیاسی قومی تصور رونما نہیں ہو سکتا تھا۔ فکر اقبال میں استحکام خودی کا تصور ملّی وجود کے تشخص اور شعور سے پیدا ہوتا ہے۔ تاہم استحکام خودی، تحفظ خودی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے مسلمانوں کے الگ تہذیبی وجود کو ان کے الگ مستقبل کو اور ان کے لیے الگ آزاد مملکت کے قیام کو ضروری قرار دیا گیا تاکہ مسلمانوں کے ملّی وجود کو استحکام حاصل ہو اور خودی کی نشو ونما کا عمل اپنا آغاز کر سکے۔ تحفظ خودی کی ذیل میں مذہبی تشخص کا اثبات، اسلام کی رہنمائی میں اجتماعی زندگی کی نشوونما اور شریعت کے مطابق معاشرتی اصولوں کا نفاذ اور ان سے متعلقہ دوسرے معاملات آتے ہیں۔ تاہم فکر اقبال تحفظ اور استحکام خودی کی منزل کو ابتدائی مقام قرار دیتا ہے اور اس کے بعد تعمیر خودی کی منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔ جہاں فرد اور معاشرہ اپنے وجود کو اسلام کے دائمی اصولوں کی روشنی میں اپنے فکر اور تجربے میں جذب کرتے ہوئے عہد حاضر میں ایک نئے مقام نظر کی خبر دیتے ہیں اور ایسی ذمہ داری کو پوری سنجیدگی کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ اس مقام کے بعد کشود خودی کی منزل ہے جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو ظاہر کرتی ہے اور بنی نوع انسان کو ایک بہتر دنیا کی خوش خبری دیتی ہے۔ فکر اقبال کے مطابق خودی کا فلسفہ جس سیاسی عمل کو پیدا کرتا ہے وہ آزاد مسلم مملکت کو برصغیر کی سیاسی زندگی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے تیار کرتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کا ایسا تصور نہ صرف مسلم مملکت کی ذمہ داری بنتا ہے بلکہ معاشرے اور فرد کے لیے بھی اس وژن میں شرکت کو بے حد ضروری گردانتا ہے۔ اس اعتبار سے فکر اقبال قومیت کے جس تصور کی تشکیل کرتا ہے وہ مستقبل کی تعمیر کا تصور بھی ہے اور اس لحاظ سے ایک بامقصد، بامعنی اور متحرک تصور ہے۔ اس کیفیت کی موجودگی میں یہ کہنا مناسب ہے کہ فکر اقبال کے بغیر برصغیر میں مسلمانوں کی قومیت اور اس کی تشکیل ممکن نہ تھی۔ اقبال کے فلسفے نے مسلمانوں کے ملّی وجود کو قومیت کے تصور میں بدل کر جہاں اسے سیاسی عمل کا محور بنایا وہیں اس سیاسی عمل کو نظریاتی جہت فراہم کرکے مستقبل کے ساتھ وابستہ بھی کیا ہے۔ اس اعتبار سے مسلم قومیت کا تصور نظریاتی تصور ہے۔

برصغیر میں مسلم قومیت کی فکری اور تہذیبی تشکیل کو آزاد مسلم مملکت کے مطالبے اور قیام میں منتقل کرنے کی عظیم الشان روداد قائداعظم کی قیادت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس عظیم الشان جدوجہد کے بڑے بڑے خدوخال کا تذکرہ ہمارے عہد کی زندہ یادداشت اور روایت ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم قومیت کے

تصوراتی امکانات کو معروضی صورت اسی عہد میں حاصل ہوئی تھی جس کی قیادت قائداعظم نے کی تھی۔ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کے ضمن میں ۱۹۴۲ء کی ایک تقریر کا اقتباس قابل غور ہے۔ قائداعظم کاکہنا ہے:

"اس برصغیر میں ہم ایک قوم ہیں اور ہماری ثقافت اور تہذیب ہماری اپنی ہے۔ ہماری اپنی زبان ہے۔ ہمارا اپنا ادب ہے، ہمارا اپنا فن ہے اور ہم اپنے فن تعمیر پر ناز کرتے ہیں۔ ہمارے نام اور نام رکھنے کے اصول ہمارے اپنے ہیں۔ ہماری اقدار اور ان کے ساتھ نسبتوں کا تصور ہمارا اپنا ہے۔ ہمارا اپنا قانون اور ہمارا اپنا نظام اخلاق ہے۔ ہماری رسومات اور کیلنڈر، تاریخ اور روایات اور امنگیں صرف ہم ہی سے ماخوذ ہیں اور زندگی کو جانچنے اور سمجھنے کا انداز اور زندگی کو تابع کرنےکے مسائل اور رویے بھی ہمارے اپنے ہیں۔ ----- ہمارا مذہبی فلسفہ، ہماری معاشرتی تقریبات اور ہمارے تخلیقی اظہار کے طریقے مختلف ہیں۔ ----- ہماری تہذیب الگ، منفرد اور ممتاز ہے۔ -----"

قائد اعظم کی اس تقریر اور اس زمانے کی دوسری تقریروں سے جہاں برصغیر کی سیاسیات میں مسلم قومیت کے تصور کا اثباتی رویہ ظاہر ہوتا تھا وہیں اس رویے سے سیاسی عمل کی توانائی بھی آشکار ہوتی تھی۔ مسلم قومیت کا تصور ایک زندہ سیاسی تحریک بن کر ظاہر ہوا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں اسی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"پچھلے برس جب میں علی گڑھ آیا تھااس وقت ابھی قرار داد لاہور جسے "قرارداد پاکستان" بھی کہا جاتا ہے منظور نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے آپ کے دلوں میں ایک اضطراب محسوس کیا تھا۔ ایک نصب العین کے لیے اضطراب ------ اور یہ اضطراب اس نصب العین کے لیے تھا جسے اب "قرارداد لاہور" میں سمویا گیا ہے۔ اس برصغیر کے دوسرے حصوں میں بھی یہی اضطراب تھا۔ ----- میں نے صرف یہی کہا ہے کہ جو مسلمان محسوس کرتے تھے اور جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اسے واشگاف لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ --------"

اسی ضمن میں یہ اقتباس بھی غور طلب ہے:

"ہم جس جدوجہد سے گزر رہے ہیں اس سے بلاشبہ مادی فائدے بھی وابستہ ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ قیمتی وہ شے ہے جسے مسلمانوں کی روح کہا جاتا ہے اور جس کے بغیر ان کی ہستی باقی نہیں رہتی۔ ------- اسی لیے میں نے کئی بار کہا ہے کہ ہماری جدوجہد درحقیقت مسلمانوں

کے لیے زندگی اور موت کی سی اہمیت رکھتی ہے۔ ہماری جدوجہد کسی قسم کی سودے بازی نہیں ہے اور مسلمانوں کو اس کا پورا پورا احساس ہے۔ اگر ہم اس معرکے میں ہار گئے تو ہمارا سب کچھ لٹ جائے گا۔ ------"

[لاہور - ۲ مارچ ۱۹۴۱ء]

ایک اور اقتباس یہ:

"مسلمانوں سے میرا یہ کہنا ہے کہ ان چند برسوں میں ہم نے کتنے ہی نشیب و فراز دیکھے ہیں اور اب ہم اس مقام تک آ پہنچے ہیں جہاں یہ بخوبی کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر کے سبھی مسلمان ہمارے ساتھ ہیں۔ ------ مجھے یہ سارا منظر موت کے بعد دوبارہ جاگنے کا منظر دکھائی دیتا ہے اور مجھے مسلمان اپنی تباہی کی خاکستر سے از سرنو زندہ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں اور وہ زبردست تباہی جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ان پر اتری تھی اب ان کی حیات نو میں بدلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ --------- کیا یہ سب کچھ ایک معجزہ نہیں ہے؟"

[دہلی ۲۴ اپریل ۱۹۴۲ء]

اس ضمن میں ایک اور اقتباس بھی قابل ذکر ہے:

" اس برصغیر میں ہم ایک بڑی قوم ہیں اور ہمارا شاندار ماضی ہے اور ہماری تاریخ عظیم الشان ہے لیکن اسے ثابت کرنا باقی ہے تاکہ اسلام کا دوبارہ عروج ہو، اس کی عظمت ظاہر ہو اور اس کی شوکت دنیا پر آشکار ہو۔ ------"

[بمبئی - ۳۰ ستمبر ۱۹۴۳ء]

انہی صداقتوں کی وضاحت ایک دوسری تقریر میں بہت واضح ہے۔ اس تقریر کا یہ اقتباس خیال انگیز ہے:

" میں خاص طور پر مسلمان طالب علموں اور دانشوروں سے کہوں گا کہ وہ اپنے فرض کو پہچانیں اور تیار ہو جائیں۔ قوموں کی ترقی اور خوش بختی کا انحصار ان کے دانشوروں پر ہے اور مسلمان قوم اس وقت کے انتظار میں ہے کہ اس کے پڑھے لکھے بیٹے اٹھیں اور رہنمائی کریں اور تاریخ میں لکھی ہوئی کامیابیوں اور روائتوں کی گواہی دیں۔ اسلام ہر مسلمان سے اس فرض کی ادائیگی کا حق مانگتا ہے اور اگر ہم اس عہد کو پورا کریں تو وہ وقت بہت جلد آ جائے گا جب ہم خود کو اپنے شان دار ماضی کی وراثت کا اہل ثابت کر سکیں گے۔ -------"

[بمبئی - ۲۴ دسمبر ۱۹۴۵ء]

مسلم قومیت کی تشکیل، آزاد مملکت کے قیام کی جد وجہد اور پاکستان کے قیام کے بعد قائداعظم کی تقریر کا یہ اقتباس خاص طور پر قابل ذکر ہے

"لفظوں کو پڑھ لینا علم حاصل کرنا نہیں ہے-------- ہمارے لیے اصل علم وہ ہے جو ہماری آنے والی نسلوں کے لیے ایک اعلیٰ کردار پیش کرتا ہے اور اعلی کردار کیا ہے؟ عزت و ناموس کا احساس، بے داغ احساس ذات، اور کسی انعام کے بغیر اپنے ارد گرد بسنے والے انسانوں کی خدمت اور اپنے آپ کو اپنی نظر میں ذمہ داریوں کا اہل سمجھنا ------- ان باتوں سے دل برداشتہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں - تاریخ میں ایسی قوموں کی بے شمار مثالیں ہیں جو اپنے ارادے اور کردار کی قوت سے زمانے پر چھائی ہیں- تم میں خود ایک اعلیٰ قوم کی نشانیاں ہیں اور تم دنیا میں کسی دوسری قوم سے کم تر نہیں ہو- تو پھر تم کیسے کامیاب نہ ہو سکو گے؟ اور کیسے اپنے بزرگوں کے مانند عروج پر نہ پہنچو گے! اپنی تاریخ کے سائے میں سانس لیتے رہو اور عظمت کے ایک نئے دور کا آغاز کرو---------"

[لاہور - ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء]

قومیت کی تشکیل کے ضمن میں جن نمایاں خدوخال کا ذکر کیا گیا ہے ان کی صحیح پہچان کے لیے یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے کہ اجتماعی شعور کا ایسا منظر انڈین ایمپائر کے دستوری اور جمہوری نظام میں رونما ہوا تھا اور برصغیر کے بارے میں دائمی فیصلہ کرنے کی قوت برطانوی پارلیمنٹ کے پاس تھی- اس لیے خواہ برصغیر میں سیاسی مسائل اور نظم و نسق کے مسائل کا دباؤ کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہوتا (جیسا ۱۹۴۲ء میں کانگرس کی تحریک میں نمایاں ہوا تھا) برصغیر کے بارے میں برطانوی پارلیمنٹ اپنی پسندیدہ روایات ہی کے مطابق فیصلے کرنے کی مجاز تھی- اس لیے ۱۹۴۶ء میں انتخابات منعقد ہوئے جن کا درحقیقت برصغیر کے مسلمانوں کے مطالبے کی تصدیق یا تردید کے لیے انعقاد کیا گیا تھا- --------- مسلم قومیت کی تشکیل کے بارے میں ان انتخابات کی اہمیت پر بہت کم غور کیا گیا ہے- عموماً قیام پاکستان کے ضمن میں انڈیا آفس کی فائلوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو محض دفتری نوعیت کی خط وکتابت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں- ان باتوں کی تفصیل سے قطع نظر یہ کہنا بہر طور ضروری ہے کہ ان انتخابات نے (۱۹۴۶ء) مسلم قومیت کے جمہوری اور معروضی اظہار کی نشاندہی کی تھی اور برصغیر کے اجتماعی ملّی شعور کو معروضی اور جمہوری حقائق کے مطابق آشکار کیا تھا- تاہم مسلم قومیت کی آئینی اور دستوری تشکیل صرف ۱۹۴۶ء کے انتخابات

ہی کے ذریعے نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی مزید تصدیق کے لیے سلہٹ اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ریفرنڈم بھی ہوا۔ بہرکیف ۱۹۴۶ء کے انتخابات اور بعد ازاں ریفرنڈم کو دیکھتے ہوئے ان باتوں کی نشاندہی ضروری ہے کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات آل انڈیا الیکشن تھے جن میں وہ تمام صوبے شامل تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریت بھی تھی اور جہاں وہ اقلیت میں بھی تھے۔ لیکن ریفرنڈم ایسے علاقوں میں ہوا جہاں ایک بار پہلے بھی الیکشن ہوا تھا اور جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ تاہم ۱۹۴۶ء کے انتخابات اس سوال سے متعلق تھے کہ کیا آل انڈیا مسلم لیگ کو برصغیر کے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے؟ دوسرے لفظوں میں ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دینا اس امر کی نشاندہی کرتا تھا کہ مسلمان مسلم لیگ پر اعتماد کرتے ہیں اور مسلم لیگ کے مطالبے کی تائید کرتے ہیں۔ مطالبہ مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے قیام کا تھا۔ اس موقع پر دو باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ مسلم لیگ کی قرار داد ۱۹۴۶ء میں انتخابات کے ذریعے سارے برصغیر کے مسلمانوں کی تصدیق اور توثیق کے لیے ووٹ کی صورت میں سامنے آئی تھی اور دوسری یہ کہ ان انتخابات نے مسلم لیگ کے حق میں فیصلہ دے کر اس امر کی تائید کی تھی کہ قیام وطن کا مطالبہ سارے مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے! ایسے معروضی ثبوت کے لیے واہموں کو فریق بنانا درست دکھائی نہیں دیتا ...... اس اعتبار سے قیام وطن (پاکستان) کا مطالبہ مسلم قومیت کے مملکتی وجود کا مطالبہ تھا اور اسے برصغیر کے سارے مسلمانوں کا اعتماد حاصل تھا۔ ان انتخابات کے بعد ریفرنڈم جن علاقوں میں ہوا ان سے استفسار کیا گیا تھا کہ کیا وہ مجوزہ مملکت (پاکستان) میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟ یعنی کیا وہ اپنے اس فیصلے کی ایک بار پھر تصدیق کرتے ہیں کہ وہ برصغیر کے ملّی وجود کا برابر ایک حصہ ہیں؟ اس لحاظ سے جس دستوری عمل کے تحت الیکشن (۱۹۴۶ء) اور ریفرنڈم ہوئے تھے وہ مسلم قومیت کی معروضی تصدیق کرتے ہیں۔ ان دونوں مراحل میں برصغیر کی مسلم قومیت ایک اکائی کے طور پر ظاہر ہوئی تھی جسے اجزا میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ قوموں کی تاریخ میں ان کے فیصلوں سے جو کومٹمنٹ پیدا ہوتی رہی ہے اس سے بہت کم انحراف ممکن ہوا ہے کیوں کہ کومٹمنٹ ہر چند کہ سیاسی چناؤ کو نمایاں کرتی ہے اصولی طور پر اخلاقی ہوتی ہے۔ اس قومیت کی تشکیل اور اس کے معروضی اظہار اور ثبوت کے بعد اجزا کا تذکرہ کومٹمنٹ کے بنیادی حوالے کے بغیر کسی طرح زیربحث نہیں آ سکتا۔ زبان کے ضمن میں بھی ایسے ہی رویے کو ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔

۱۱۔ مسلم قومیت ..

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا تاریخ ساز کارنامہ

اس امر سے بہت کم اختلاف ممکن ہے کہ برصغیر اپنی تاریخ کی طویل صدیوں کے دوران کثرتوں کی سرزمیں رہا ہے اور کثرتیں اس وسیع و عریض خطہ زمیں کے معاشرتی اور سیاسی رویے مرتب کرتی رہی ہیں۔ کثرتوں کے ایسے ہی انسانی نقشے میں آریاؤں کا نظام ذات پات معرض وجود میں آیا تھا جس نے جہاں آریاؤں کی نسلی وحدت کو مستحکم کیا وہاں ایسی وحدت کے باہر موجود انسانوں کو اپنے معاشرتی ماحول سے بے دخل کیا، اور اس طرح غیر آریائی کثرتوں کے ماحول میںآریاؤں کی نسلی وحدت کے نظام کو بحال رکھنے کی کوشش کی۔ تاہم یہ امر الگ ہے کہ جس نسلی وحدت کو انہوں نے اپنے نظام کے استحکام کے لیے اختیار کیا وہ بھی وحدت کے بجائے اختلاف خون و نسب پر قائم تھا۔ اس اعتبار سے یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ آریاؤں کے معاشرتی ادارے کثرتوں کے سوال کو حل کرنے میں شاید کامیاب نہیں ہوئے تھے، کیوں کہ کثرتوں کے سلسلے ان کے اپنے آرتھک اتہاس میں اختلاف خون و نسب ہی پر برابر قائم رہے۔ برصغیر کی تاریخ میں انسانوں کے مابین غیریت کے رویے ایسی نسلی ثنویت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جس نے برصغیر کےلوگوں کی نفسیات کو قدامت کے آسیب میں گرفتار کر رکھا تھا!

برصغیر میں مسلم اقتدار کے خاتمے کے وقت برصغیر کے مسلمان کثرتوں ہی کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے اور اسی دنیا ہی میں آباد تھے۔ علاقے ان کی شناخت کرتے تھے اور وہ اپنے علاقوں کے اندر اپنے مخصوص نسلی امتیاز اور لقب سے پہچانے جاتے تھے، جو ذات پات کے نظام ہی کی روش کا نتیجہ تھے۔ اس طرح علاقے کی کثرتوں کے اندر مسلم آبادی کثرتوں کی مزید کثرت کو نمایاں کرتی تھی۔ اس طرح جو صورت پیدا ہوتی تھی اسے عصر حاضر کی اصطلاح میں تضادات کی صورت بھی کہا جا سکتا ہے۔ تضادات کی کثرت نسلی گروہ بندی علاقائی عصبیت اور اقتصادی بدحالی کے ہمہ گیر ماحول میں اور زیادہ سبرآزما تھی۔ غیر ملکی اقتدار ایسی صورت حال کی بہتری سے بہت کم دلچسپی رکھتا تھا اور بسا اوقات

مسلمانوں کے اپنے مذہبی مسالک بھی تضادات کا سبب بنتے تھے۔ جن سے غیر ملکی حکمران اور اکثر اوقات مسلم دشمن رویے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ۔۔۔۔۔۔۔ ایسے عمرانی اور تہذیبی ماحول میں برصغیر کی مسلمان آبادی برصغیر کے وسیع و عریض خطے میں بکھری ہوئی تھی اور صرف شمال مغرب اور شمال مشرق کے صوبے ایسے تھے جہاں ان کی اکثریت تھی۔ ۱۹۳۵ء تک سندھ کا مسلم اکثریتی علاقہ احاطۂ بمبئی کا حصہ تھا اور اس طرح غیر مسلم اکثریت کے علاقے میں شمار ہوتا تھا۔ یہ حالات محض جغرافیائی اور مقامی نوعیت ہی کے نہیں تھے اور کئی اعتبار سے صرف لسانی اور مقامی کلچرل مسافت ہی ایسی نہیں تھی جو فاصلے اور دوری کو رونما کرتی تھی بلکہ مسلم اقتدار کے خاتمے کے بعد برصغیر کی مسلم آبادی اجتماعی نفسیاتی بحران سے بھی دو چار تھی اور فلسفے کی زبان میں مسلمانوں کی "انا" یعنی ان کا احساس ذات بھی کم و بیش غیر محفوظ ہو چکا تھا۔ مسلمان تاریخ کی منفی قوتوں کی زد میں آچکے تھے جو عموماً نامساعد حالات میں قوموں کے لیے نابود ہو جانے کی تشویش کو پیدا کرتی رہی ہیں۔

اس سارے منظر کو دیکھتے ہوئے جو ایک سو برس کے زمانی تناظر میں پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے ان اثباتی نتائج کا جائزہ جو ان ایک سو برس کے دوران رونما ہوئے برصغیر کے مسلم شعور اور مسلم قیادت کی بصیرت کا ایک نہایت قابل قدر ثبوت ہیں۔ ایک سو برس قبل کے زمانے سے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گزرتے ہوئے عموماً جس نوع کے جملے سننے کا اتفاق ہوتاتھا وہ کچھ یوں تھے کہ مسلم معاشرہ حالت انتشار میں ہے۔ مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور ان کی زبوں حالی افسوس ناک ہے۔ ایسی کیفیت اس لیے بھی تشویش پیدا کرتی تھی کہ اس صورت حال میں مسلمانوں کے لیے کسی قسم کا قابل رشک مستقبل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسے انسانی، عمرانی، مقامی اور نفسیاتی اجزا کو (جن کی طرف کا اشارا کیا گیا ہے) باہم مربوط کرنا کسی طرح آسان نہ تھا اور پھر ایسے ارتباط سے سیاسی عمل اور سیاسی فیصلے اخذ کرنا بھی کسی طرح سہل نہ تھا۔ اس سارے منظر کو دیکھتے ہوئے برصغیر کی مسلم قیادت کے فیصلے اور مسلم قومیت کی تشکیل کاعمل دونوں حیرت انگیز نظر آتے ہیں۔

برصغیر کے اس بکھرتے ہوئے شیرازے میں جو اصول برابر برقرار تھا وہ مسلمانوں کے تشخص کا اصول تھا۔ برصغیر کے عمرانی نقشے میں ان کا مسلمان ہونا ہی ان کی پہچان تھا۔ اس کے بعد ان کا علاقہ ان کی شناخت کو نمایاں کرتا تھا۔ علاقے کی اہمیت بہرحال ثانوی تھی کیوں کہ اپنے علاقے میں بھی ان کی پہچان کا اصول ان کا مسلم تشخص تھا۔ مذہب کے حوالے سے پہچان اور تشخص صرف

برصغیر ہی سے متعلق نہ تھے۔ جزیرہ نمائے بلقان سے لے کر برما تک انسانوں کی بنیادی پہچان مذہب ہی کے حوالے سے ممکن ہوتی رہی تھی۔ یہودی، عیسائی، ہندو، بدھ اور مسلمان ----- تشخص کا اصول تھے۔ ایسا اصول درحقیقت آبادیوں کے مابین روایتوں اور رویوں کی شناخت کو قائم کرتا تھا۔ برصغیر کی سیاسی تاریخ میں مسلم تشخص علاقے میں بھی برابر کارفرما رہا اور علاقے کے ماوراء دوسرے علاقوں کے ساتھ بھی اس نے اپنا رابطہ پیدا کیا۔ یوں مسلم تشخص نے سیاسی اعتبار سے ماورائی رویوں کو نمایاں کیا اور علاقوں کے باہمی ربط اور رابطے سے مسلم تشخص نے ملّی تشخص اور ملّی وجود میں اپنی تکمیل پائی۔ اس طرح کثرتوں کی دنیا میں وحدت کا تصور آشکار ہوا اور علاقائی کثرتیں ملّی وحدت اور اجتماعی اکائی میں مدغم ہوتی گئیں۔ علامہ اقبال نے اسے قید مقام سے رہا ہونے کی صورت قرار دیا ہے۔

ملّی وجود کی اس اجتماعی وحدت سے برصغیر کی مسلم سیاست کی تشکیل ہوئی تھی۔ سرسید سے اقبال اور قائداعظم تک مسلم سیاست کے سارے نشیب و فراز، ملّی وجود کو سیاسی وجود میں اور سیاسی وجود کو مسلم قومیت میں بدلنے کی روداد کو برابر بیان کرتے ہیں۔ تحریک خلافت بھی ایسے ہی ماورائی رویوں کی نشاندہی کرتی تھی جو علاقے کے باہر اور پرے دیکھنے کی صلاحیت سے رونما ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں برصغیر کی مسلم سیاست کے مقاصد کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ --------- تاہم اگر ان مقاصد کو تحریک آزادی کے ان ایام کی روشنی میں دیکھا جائے جب برصغیر سے برطانوی راج رخصت ہو رہا تھا تو سب سے بڑا مقصد یقینی طور پر مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ کی بازیافت دکھائی دیتا ہے جس کی معروضی صورت آزاد مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ تھا۔ یہ بڑا مقصد مسلم قومیت کی تشکیل اور مسلم قومیت کے واضح اظہار کی نشاندہی کرتا تھا۔ لیکن اس بڑے مقصد کے ساتھ برصغیر کے مسلمانوں نے جس تاریخی کردار کو نمایاں کیا تھا اس کی مثال دنیا میں بہت کم دکھائی دی ہے۔ ان کے تاریخی کردار کی خصوصیت اس امر میں دکھائی دیتی ہے کہ انھوں نے اجتماعی شعور کو علاقائی شعور اور انفرادی مستقبل پر فوقیت دی۔ انھوں نے مسلم اقلیت کے صوبوں میں رہتے ہوئے مسلمانوں کی اس آزاد مملکت کےقیام کے لیے ووٹ دیے جس میں وہ کسی صورت قیام پذیر نہیں ہوسکتے تھے کیوں کہ جغرافیائی اعتبار سے مجوزہ مملکت ان کے اپنے صوبوں سے بہت دور قائم ہونا تھی۔ انھوں نے انفرادی مستقبل کو تاریخی شعور اور اجتماعی مستقبل کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا تھا اور اس طرح عہد حاضر میں مسلم تشخص اور ملّی وجود کے نام پر غالباً سب سے بڑی

قربانی پیش کی تھی۔ کثرتوں کی دنیا میں وحدت فکر کی ایسی انسانی مثال بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ ایسے تاریخ ساز اقدام کو یہ کہہ کر رد کرنا ممکن نہیں ہے کہ قیام وطن کے مطالبے نے اسلامیان برصغیر کو تقسیم کر دیا تھا۔ اس اقدام کی دائمی خصوصیت اس امر میں مضمر ہے کہ اسلامیان برصغیر کے ایک بہت بڑے حصے نے مسلمانوں کے آزاد وطن کے قیام کو اپنے آزادانہ چناؤ کے ذریعے ممکن بنایا تاکہ وہ ذہنی ، نفسیاتی اور تہذیبی طور پر اس فخر میں شریک اور شامل رہیں کہ صدیوں کے بعد برصغیر میں اقتدار اعلی ایک بار پھر مسلمانوں کے پاس واپس آیا ہے! مسلم اقلیت کے صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کی اس قربانی کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا! ایسے جذبے کو عہد حاضر کی عقل و خرد کی روشنی میں شاید بہت کم سمجھا گیا ہے اور غالباً یہی وہ قابل فخر جذبہ تھا جس نے اس زمانے کی ریاست کشمیر میں اس لوک گیت کو پیدا کیا جسے سری نگر میں قائداعظم کے اعزاز میں ہونے والی ایک تقریب میں ایک کشمیری طائفے نے گایا تھا:

سبز دستارس نبیؐ چھ راضی　　　پاکستانگ غازی آو

کہ نبی اکرمؐ سبز دستار سے راضی ہیں کیوں کہ وہ غازی آگیا ہے جو پاکستان کا ذکر کرتا ہے۔

مسلم قومیت کی تشکیل کے دوران اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں نے جہاں اپنی اجتماعی وحدت کو نمایاں کیا وہیں مسلم قومیت کے تشخص کو بھی ظاہر کیا تھا۔ یہ تشخص ایک مشترکہ تاریخ، ایک مشترکہ تہذیبی شعور، مشترکہ ورثے اور متفقہ قومی اداروں سے رونما ہوا تھا جس میں زبان کے بارے میں واضح طور پر مسلم قوم کے نقطۂ نظر کی وضاحت موجود تھی۔ اس طرح برصغیر کے مسلمان ایک قوم، ایک تاریخ،ایک زبان(اردو) اور ایک تہذیبی وجود کو آشکار کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ قیدمقام سے بلند تر ہونے اور مقامی ماحول سے ماوراء دیکھنے کی روایت قائم ہوئی تھی اور مستقبل کے بارے میں ایک متفقہ اور روشن رویہ نمایاں ہوا تھا۔ مسلم قومیت کی تشکیل کےمنظر کو دیکھتے ہوئے بخوبی علم ہوتا ہے کہ ایسے عمل کے ساتھ جہاں عظمت رفتہ کا تصور ظاہر ہوا اور قومی اور ملّی وجود کا شعور مستحکم ہوا وہیں بامقصد آزادی کے بنیادی رویے بھی مرتب ہوئے تھے۔ سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ قیام وطن کے ذریعے مستقبل میں اسلام کی عظمت ایک بار پھر ظاہر ہوگی۔ قیام وطن مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے راہیں ہموار کرےگا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بخوبی دکھائی دیتا ہے کہ مسلم قومیت کے تصور کا مرکزی استعارہ نشاۃ ثانیہ کا استعارہ ہے۔ اس مقصد کے مقابلے میں ہر دوسرا مقصد اضافی دکھائی دیتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کی

جدوجہد اس لحاظ سے تاریخ ساز ہے کہ اس جدوجہد نے جہاں مقام کے محدود ماحول کو ایک بڑے تناظر میں شامل کیا وہیں ماضی کو مستقبل کے ساتھ ہم آہنگ بھی کیا اور نشاۃ ثانیہ کے تاریخی استعارے میں اپنے خواب، اپنے ارادے اور اپنی امیدیں شامل کیں۔ --------- اس اعتبار سے برصغیر کے مسلمانوں کی قومیت کا تصور غیرمعمولی اور اہم ہے!

چوتھا حصہ

۱۲۔ قیام پاکستان اور لسانی صورت حال ------ مسائل کی نشاندہی

آزادئ برصغیر کے برطانوی ایکٹ (۱۹۴۷ء) کی رو سے برصغیر میں جو دو آزاد اور خود مختار مملکتیں معرض وجود میں آئیں ان میں ان کی جدا گانہ تحریک آزادی کے تمام تر اجزا اور مضمرات نے وجود پایا تھا جن کے لیے ایک طویل عرصے سے آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا کانگرس مصروف جد وجہد تھیں۔ ان اجزائے ترکیبی میں ایک اہم جزو قومی زبان تھی۔ اس لیے ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آنے والی دونوں مملکتوں نے اپنے لیے اپنی قومی زبان کو چن لیا تھا اور اردو ہندی کا لسانی مسئلہ جو تحریک آزادی کے دوران بارہا باعث نزاع رہا تھا ایک لحاظ سے طے پاچکا تھا۔ پاکستان کے قیام نے اردو کو اور بھارت نے ہندی کو قومی زبان کے طور پر اور بغیر کسی شرط کے چن لیا تھا کیوں کہ تحریک آزادی کے دوران یہ دونوں زبانیں جداگانہ قومی تشخص کی شناخت بن چکی تھیں۔ اس اعتبار سے ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے لیےقومی زبان ایک طے شدہ حقیقت تھی اور قومی زبان کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اس مسئلے کی متحارب زبان (ہندی) ایک مسلمہ مقام حاصل کر چکی تھی جس کا پاکستان کی حقیقتوں کے ساتھ ٹکرانے کا غالباً کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے جو دہلی میں منعقد ہوا تھا مولوی عبدالحق کے ایک مضمون کا اقتباس قابل غور ہے ------ یہ مضمون "المعارف" کے شمارے جون ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ------ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔ ------

"اس اجلاس میں سرفیروز خان نون نے اپنی تقریر انگریزی میں شروع کی تو ہر طرف سے شور و غل ہوا۔ اردو ! اردو ! اس سے مجبور ہو کر انہوں نے کچھ جملے اردو میں ارشاد فرمائے اور اس کے بعد انگریزی ہی میں بولنے لگے۔ اس پر پھر اردو ! اردو کا شور ہوا۔ تب آپ نے جل کر کہا کہ قائد اعظم بھی تو انگریزی میں تقریر کرتے ہیں۔ یہ سن کر قائد اعظم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور صریح اور صاف الفاظ میں فرمایا کہ فیروز خان نون نے میرے پیچھے پناہ لی ہے لہذا میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔ اس پر تمام حاضرین نے بڑے جوش سے تالیاں بجائیں۔ ------"

قیام پاکستان کے کچھ ہی ماہ بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں قائد اعظم کی تقریر کا یہ اقتباس بھی قابل ذکر ہے۔ اپنی تقریر کے دوران انہوں نے کہا :۔

" اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہو کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ میری ذاتی رائے میں اردو ہے اور صرف اردو ہے۔ ----"

قیام پاکستان کے وقت یہ امر کسی طور متنازعہ نہ تھا کہ پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان کیا ہے؟ اردو کے بارے میں کسی بھی سطح پر کسی قسم کا اختلاف موجود نہ تھا۔ قائد اعظم کی زبان سے اردو کے جملے سن کر لوگ خوشی سے بے خود ہو جاتے تھے۔ اردو کے ساتھ وابستگی کا یہ عالم تھا کہ کاروبار اور بازار میں ہر جگہ اردو دکھائی دینے لگی اور قیام پاکستان کے دو تین ماہ کے دوران انگریزی کی بجائے اردو میں سائن بورڈ لکھے گئے اور ہر جانب اردو کے سائن بورڈ دکھائی دینے لگے۔ یہ امر اس لیے بھی قابل توجہ ہے کہ قیام پاکستان محض ایک آئینی اور دستوری واقعہ ہی نہیں تھا بلکہ پاکستان کے باشندوں کے لیے ایک گہرا تجربہ بھی تھا۔ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جو آزادی کے بے پناہ تاثر کو نمایاں کرتی تھی۔ غالباً ایسی انسانی کیفیت صرف اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کوئی قوم ایک لمبے عرصے کے بعد اور آشوب و ابتلاء کی آزمائشوں کے بعد آزادی سے ہمکنار ہوتی ہے اوراپنی اس کیفیت کو معروضی طور پر پہچاننے کے لیے بے تاب ہوتی ہے۔ اس لیے قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے پرچم نے لوگوں کو ایک نئے جذبے سے آشنا کیا اور ہر شخص نے اس پرچم کو بڑی بے خودی کے ساتھ دیکھا۔ اس احساس میں خوشی تھی، حیرت تھی اور فخر کا انداز بھی تھا۔ جو قافلے سرزمین پاکستان میں وارد ہوئے انہوں نے سرزمین کو محض ایک بے جان خطۂ زمین کی بجائے اپنے نہایت زندہ جذبے کے ساتھ دیکھا اور اسے چومتے گئے۔ ------ اور غالباً ایسے ہی جذبات تھے جو اردو زبان میں لکھے ہوئے سائن بورڈوں کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ پرچم، سرزمین اور اردو ----- ان تین سچائیوں نے قیام پاکستان کے وقت لوگوں معروضی طور پر یہ اعتماد فراہم کیا کہ ان کی زندگی میں آزادی کا سورج طلوع ہوا ہے۔ ان کا آزاد وطن ایک حقیقت بن گیا ہے۔ اور اب ان کی زندگی کا نقشہ آزاد قوموں کے مقدر کی طرح آشکار ہوا ہے۔ ----- اردو زبان قیام پاکستان کے وقت اس مملکت کی شناخت بن کر ظاہر ہوئی اور ہر شخص نے اسے اپنا قومی تشخص قرار دیا۔ اس اعتبار سے اردو زبان نئی مملکت کی قومی زبان بن کر آشکار ہوئی۔ اس کا ایسا مقام تاریخی طور پر جائز اور ناقابل تردید تھا۔

لسانی اعتبار سے قیام پاکستان کے ساتھ ہی اردو زبان کا زبان کی حیثیت سے

قومی منصب ظاہر ہوا اور اس منصب اور تشخص کی ساری تاریخ مسلمانوں کی تحریک آزادی کا حصہ تھی اس طرح منطقی طور پر اس کی قومی حیثیت ایک طے شدہ حقیقت تھی۔ مجموعی طور پر اور لوگوں کے اجتماعی رویے کی روشنی میں اردو زبان کا منصب قومی زبان کے طورپر باقاعدہ تسلیم ہو چکا تھا۔ اس لیے جو نئے سوال ظاہر ہوئے وہ قومی زندگی میں قومی زبان کے استعمال ترویج و اشاعت اور ترقی سے متعلق تھے۔ ایسے سوال صرف اس وقت نمایاں ہوتے ہیں جب قومی زبان قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا عمل دخل روا رکھنے کی آرزو مند ہوتی ہے اور جب قوم اپنی زبان کے دائرہ عمل کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی خواہش کرتی ہے۔ مختلف زبانوں کی نشوونما میں بھی ایسے مقامات آتے رہے ہیں جب زبانوں نے قومی اور علمی زبانوں کا رتبہ پایا ہے۔ سولھویں صدی میں انگریزی زبان بھی ایسے مقامات سے گزری تھی۔

قیام پاکستان کے بعد اردو زبان کے بارے میں بعض بنیادی سوال ظاہر ہوئے جن پر پڑھے لکھے طبقوں نے غور و خوض کرنے کی ابتدا کی۔ اس عرصے میں حلقہ' ارباب ذوق (لاہور) کی نشستوں میں ان سوالوں پر عموماً بحث ہوتی رہی۔ ان مباحث کی تلخیص کا اقتباس قابل ذکر ہے۔ -----

> " ہند اسلامی کلچر کا سب سے بڑا کارنامہ اردو ہے------ تقسیم (۱۹۴۷ء) کے بعد اسے انڈیا سے دیس نکالا مل گیا ہے۔ اب اردو کو پاکستان میں اپنا گھر بنانا ہے۔ ----- اس کے لیے پاکستان کے نئے ادیبوں اور نقادوں کی ذہنی کاوشیں بھی درکار ہوں گی۔ ہمیں اردو کی روایات کو ہندوستان سے اکھاڑ کر پاکستان میں لانا ہوگا۔ ------"[۱]

اسی ضمن میں قیام پاکستان کے وقت (۲۱ ستمبر ۱۹۴۷ء) حلقہ ارباب ذوق میں جو پہلا مضمون پڑھا گیا[۲] وہ یوسف ظفر کا لکھا ہوا تھا اور جس کا عنوان تھا "پاکستان میں اردو اور حلقہ' ارباب ذوق" اس مضمون میں یوسف ظفر نے برصغیر کے بدلے ہوئے حالات میں اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں سوال اٹھائے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ بھارت میں ہندی کو سرکاری زبان کا مرتبہ ملنے سے اردو کا مستقبل اس مملکت میں مخدوش ہو چکاہے اس لیے اب ہر اعتبار سے اردو زبان پاکستان کے ساتھ منسوب ہو چکی ہے، اور اس کی ترویج و اشاعت کی ذمہ داری پاکستان کی ذمہ داری بن چکی ہے۔ یوسف ظفر نے ان باتوں کا ذکر کرنے کے

۱۔ حلقہ ارباب ذوق ، یونس جاوید(۱۹۸۳ء) ص ۸۵

۲۔ ایضاً ص ۸۲

بعد اردو زبان کے ضمن میں بعض تجاویز کا ذکر بھی کیا جن میں سے دو تجویزوں کا تذکرہ ضروری ہے، ایک تجویز یہ تھی کہ ملک (پاکستان) کے مقتدر ماہرین تعلیم کو اپنے ساتھ ملا کر حلقہ(ارباب ذوق) تعلیمی بورڈ قائم کرے جو نہ صرف درسی کتابوں کی سفارش کرے بلکہ اپنے اراکین یونیورسٹی کے اردو بورڈ میں بھی بھجوائے اور دوسری تجویز یہ تھی کہ حلقہ (ارباب ذوق) کی نشست کے پروگراموں میں کم از کم پندرہ منٹ ایسے الفاظ اور جملوں کی تحریری ترتیب کے لیے دیے جائیں جو لطافت، سلاست، حسن بیان، بلاغت سے متعلق ہوں تاکہ یو۔ پی والوں کے روزمرہ کو عام کیا جا سکے۔[۱] ---------- حلقہ ارباب ذوق کی ان نشستوں میں پاکستان، اردو زبان اور اردو زبان کے رسم الخط کے بارے میں مضامین پڑھے گئے اور ان پر بحث و تمحیص کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ ------ ایسے تمام مباحث میں پاکستان اور اردو زبان کا رشتہ برابر تاریخی رہا اور اس پر ہند (برصغیر) اسلامی کلچر کے حوالے ہی سے غور و خوض ہوتا رہا۔ ----- اردو زبان کے بارے میں بحث و تمحیص کا یہ پہلو خاص طور پر قابل توجہ ہے۔[۱]

تحریک پاکستان اور قیادت قائداعظم کے تاریخی جائزے سے جو بات ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے الگ وطن حاصل کرنے کا مطالبہ اسلامیان برصغیر کی اجتماعی تہذیبی وحدت کا مطالبہ تھا اور کسی ایک علاقے، صوبے یا مقامی کلچر کا مطالبہ نہیں تھا۔ اس لیے اس اجتماعی تہذیبی وحدت کی علامات بھی تاریخی اور مجموعی شعور سے متعلق تھیں۔ سرنگاپٹم، پلاسی، بکسر، لکھنؤ، دلّی، حیدرآباد، پشاور، لاہور، ملتان ----- ایسے تاریخی مظاہر تھے جن سے گزرتے ہوئے برصغیر کے مسلمانوں پر یکساں آشوب رونما ہوا تھا اور جن کی وحدت ہی سے ان کے دوبارہ جاگنے اور ان کی جدوجہد آزادی کا عمل پیدا ہوا تھا۔ اس عمل کی علامات اسلام، تاریخ، تہذیب اور زبان تھیں۔ اس اعتبار سے اردو زبان اس عمل کا غیر منقسم جزو تھی۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ برطانوی ہند میں یہ زبان (اردو) صرف صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں بولی جاتی تھی اور وہاں بھی یہ زبان عام بول چال کی بجائے ہند اسلامی کلچر کی زبان تھی اور اسے شرفاء بولتے تھے یعنی یہ زبان ایسے گھرانوں کی مادری زبان تھی جو ہند اسلامی کلچر کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس صوبے میں ہندی کو بھی برابر کامقام حاصل تھا۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یوپی میں بھی اردو زبان سارے صوبے کی زبان نہ

۱۔ حلقہ ارباب ذوق ، یونس جاوید(۱۹۸۴ء) ص ۸۴

تھی بلکہ گھرانوں کی زبان تھی اور صرف ایسے گھرانوں کی زبان تھی جن کی تہذیبی جڑیں ہند اسلامی کلچر میں پیوست تھیں۔ یوپی کے باہر اردو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان تھی۔ وہ اس زبان ہی کو اپنے تہذیبی وجود کی علامت قرار دیتے تھے۔ کشمیر میں اردو کی حیثیت لازمی زبان کی تھی۔ پنجاب میں اردو ہی کا دور دورہ تھا۔ بنگلور اور مدراس میں اردو کا یہی مقام تھا۔ بنگال میں اردو کی منزلت تھی۔ سندھ میں اردو کو اسی طرح کا رتبہ میسر تھا۔ صوبہ سرحد میں اردو ہی کی عزت تھی۔ اردو کی اس ہمہ گیر حیثیت نے اردو کے مادری زبان ہونے کو ثانوی صورت دی تھی۔ اس کی اصل اور بنیادی صورت تہذیبی اور صرف تہذیبی تھی۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اصولی طور پر تہذیبی جد وجہد تھی اوراس میں علاقے کی صورت بھی تہذیبی تھی۔ ------ اس لیے تہذیبی زبان کے طور پر اردو کا یوپی کے روزمرہ سے غالباً کوئی رشتہ نہ تھا اور نہ دہلی کا لہجہ ہی اس تہذیبی زبان کو کسی طرح محدود اور پابند کر سکتا تھا۔ قائد اعظم نے سلہٹ[1] میں جس اردو زبان میں جلسۂ عام کو خطاب کیا تھا وہ مستند لہجے کی اردو نہ تھی۔ ان کا یہ کہنا کہ میری اردو محاورۂ تانگے والوں کی اردو ہے دراصل عام فہم اردو کی جانب اشارا کرتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں عام فہم اردو، اپنے مقامی تغیر و تبدل کے ساتھ، برصغیر کے مسلمانوں کی زبان تھی اور اس کا مرتبہ تہذیبی زبان کا تھا۔ اس لیے جب پاکستان معرض وجود میں آیا، اردو زبان اپنے تہذیبی اور تاریخی وجود کے ساتھ اس نئے اور برصغیر کے مسلمانوں کی وحدت کے نمائندہ ملک میں وارد ہوئی۔ حلقۂ ارباب ذوق اردو کو اسی تہذیبی پس منظر میں اپنی نشستوں کے دوران زیربحث لایا تھا۔ اس لیے قیام پاکستان کے ساتھ جو لسانی رویے آشکار ہوئے یہی تھے کہ اردو کے تہذیبی وجود کو نئی قوم کی اجتماعی زندگی میں کیسے شامل کیا جائے تاکہ یہ زبان قومی زبان کا قابل فخر مقام پا سکے۔ قیام پاکستان کے بعد اردو زبان کے بارے میں جو مسائل بھی ظاہر ہوئے وہ تہذیبی زبان کو قومی زبان بنانے ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ عمل بیک وقت لسانی بھی تھا اور تشکیل قومیت سے بھی اس کا تعلق تھا۔

تاہم ایک زبان کے طور پر اور تحریک آزادی کے دنوں میں اردو زبان کے لسانی مراکز برصغیرکے مرکزی علاقے یوپی اور دہلی میں تھے۔ اسلامی ہندوستان کے ایک ہزار برس کے دوران بھی علاقے مسلمانوں کے اقتدار کا مرکز تھے اور ان

۱۔ قائداعظم اور اردو زبان ۔ مظفر عباس ص ۱۲

ساری صدیوں کے دوران مسلمان اسی مرکزی علاقے کی طرف رجوع کرتے تھے اور جب تک دہلی انگریزوں کے ہاتھوں فتح نہیں ہوئی اور دہلی کا بادشاہ، بہادر شاہ ظفر تخت و تاج سے محروم نہیں ہوا مسلمانوں کے اقتدار کا تصور بھی کسی طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ اس اعتبار سے برصغیر کے مسلمانوں کی مرکزیت کا تصور ان مرکزی علاقوں سےمنسوب ہوچکا تھا۔ اس لیے کچھ عجب نہ تھا کہ جب سکھوں کی شکست کے بعد ۱۸۴۶ء میں پنجاب انگریزی عملداری میں شامل ہوا تو پنجاب کے مسلمانوں نے گورمکھی کی بجائے اردو کو اس لیے قبول کیا کہ اردو کے ذریعے وہ مرکز کے مسلمانوں کا برابر حصہ رہیں گے۔ وجہ یہ تھی کہ اردو انہیں اس تاریخ میں شریک کرنے پر قادر تھی جو مسلم اقتدار کے حوالے سے نمایاں ہوتی تھی۔ انگریزی عملداری کے بدلے ہوئے حالات میں علاقائی زبان (گورمکھی) ان کو مرکز سے منقطع کرسکتی تھی۔ اردو کے بارے میں تہذیبی نفسیات کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

قیام پاکستان کے بعد اردو کی لسانی کیفیت کا پس منظر بنیادی طور پر بدل گیا اور اس کی وہ صورت نہ رہی جو گزشتہ ایک سو سال سے اسے حاصل تھی۔ اردو زبان کے لسانی مراکز ہندی زبان کی عملداری میں آگئے اور اردو ہندی کے پرانے سیاسی تنازع نے اردو کے لسانی مراکز سے اس زبان کو اور اس کے رسم الخط کو یکسر بے دخل کر دیا۔ دہلی باقی نہ رہی، لکھنؤ باقی نہ رہا اور نہ حیدر آباد (دکن) باقی رہا۔ اردو کے لسانی مرکزوں پر ہندی بھاشا کا راج قائم ہوگیا ہر طرف ناگری رسم الخط، ناگری سکول، ناگری سبھائیں، اور ناگری سائن بورڈ ظاہر ہوئے۔ اس دور کی بھارتی حکومت کی اردو دشمنی محاورہ بن گئی اور برابر بنتی گئی۔ -------- اس لیے جب قیام پاکستان کے ساتھ حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاس میں یوسف ظفر نے تجاویز پیش کیں تو ان سے اردو زبان کا نہ صرف تہذیبی وجود آشکار ہوا بلکہ یہ امر بھی واضح ہوا کہ اردو زبان کے لسانی مراکز بھی بدل گئے ہیں اور اردو زبان کے تہذیبی وجود کی نشوونما کے لیے ایک نیا ماحول سامنے آیا ہے جہاں اس زبان کے تہذیبی وجود سے اس کا قومی وجود وابستہ ہے اور جہاں اسے قومی زندگی کے رگ وپے میں منتقل ہونا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل سیاسی اعتبار سے نہ صرف اردو زبان کی حیثیت تہذیبی تھی بلکہ مسلم قومیت کا تصور بھی تہذیبی تھا۔ اس لیے مسلم قومیت کی تشکیل میں اردو زبان نے جو کردار ادا کیا تھا وہ بھی تہذیبی نوعیت کا تھا۔ قیام پاکستان کے ساتھ جہاں نہ صرف مملکت معرض وجود میں آئی بلکہ حکومت اور کاروبار مملکت کے متعدد پہلو بھی رونما ہوئے۔ مسلمانوں کے جداگانہ وطن کے

مطالبے نے بین الاقوامی اور جغرافیائی طور پر ایک ملک میں اپنی تکمیل پائی تھی اور یوں مملکت اور زبان کے سوال کو نمایاں کیا تھا۔ اس سوال نے مملکت کی زبان، قومیت اور تشکیل قومیت کے نئے مسائل کوظاہر کیا اور قیام پاکستان کے بعد تہذیبی اور تاریخی وجود کو قومی وجود تشخص اور شعور میں ڈھالنے کی ابتدا ہوئی۔ ...... اس ضمن میں زبان کے کردار کی اہمیت ایک بار پھر سامنے آئی۔

قوموں کی زندگی میں زبان کا مسئلہ ہمیشہ سنجیدہ نوعیت کا حامل رہا ہے۔ قوموں کی نشوونما اور ارتقا کی مختلف منزلوں پر زبان کا مسئلہ مختلف صورت اختیار کرتا رہا ہے۔ یورپی قوموں کی تاریخ میںایک زمانہ ایسا بھی تھا جب سرکاری سطح پر لاطینی کا دور دورہ تھا۔ قرون وسطی کے دوران انگلستان میں سرکاری زبان لاطینی تھی اور اسکولوں میں اُمراء کے بچے فرانسیسی پڑھتے تھے۔ اس دور کے آخری ایام میں انگریزی زبان ظاہر ہوئی جو لندن شہر کی مقامی بولی سے پیدا ہوئی تھی۔ تاہم سولھویں صدی میں (جو احیائے علوم اور نشاۃ ثانیہ کا زمانہ ہے) لاطینی ہی علمی اور سرکاری زبان تھی۔ بین الاقوامی طور پر لاطینی ہی کا استعمال ہوتا تھا اور یونیورسٹیوں میں بھی طلباء کو لاطینی میں گفتگو کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ تاہم یہ صدی یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی قومیت کے ظاہر ہونے کی صدی تھی۔ اس لیے انگلستان کے محب وطن اہل علم اپنی زبان انگریزی کے فروغ کے خواہاں تھے۔ لیکن لاطینی کے اثر و رسوخ کے پیش نظر ان کی ساری کوششیں بے کار ہوتے دکھائی دیتی تھیں۔ ان کا مسئلہ جہاں اپنی تہذیبی اور تاریخی زبان انگریزی کو علمی زبان بنانے سے متعلق تھا وہیں اسے سرکاری زبان بنانے سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس عہد کے انگریز، لاطینی کی بجائے انگریزی کو اپنے قومی تشخص کے لیے استعمال کرنے کی آرزو مند تھے اور گزشتہ تین سو برس کے دوران انگریزی کے بارے میں اس عہد کی ساری آرزوئیں پوری ہوئیں۔ ...... عہد حاضر میں سولھویں صدی کی وہی ناقابل اعتناء زبان بین الاقوامی زبان بن کر ظاہر ہوئی ہے۔

قیام پاکستان اور مملکت پاکستان کے معرض وجود میں آنےکے ساتھ زبان کے بارے میں جو مسئلہ پیدا ہوا اس کا تعلق انگریزی زبان سے تھا۔ ۱۸۳۵ء سے برصغیر کی سرکاری زبان انگریزی تھی اور علمی، تعلیمی اور انتظامی امور میں انگریزی ہی برابر بارسوخ اور مستعمل تھی۔ یہی روایت ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے حصے میں آئی اور یہ سوال ظاہر ہوا کہ پاکستان کی سرکاری زبان کون سی ہے؟ اس سوال کا واضح جواب صرف یہی تھا کہ انگریزی زبان ہی سرکاری زبان کی

ذمہ داریاں نبھا رہی ہے اس لیے مملکت کی سرکاری زبان انگریزی ہی ہے لیکن یہ جواب کئی اعتبار سے قابل قبول دکھائی نہ دیا کیوں کہ اصولی طور پر کسی مملکت کی سرکاری زبان وہی ہوتی ہے جو اس مملکت کی قومی زبان کہلاتی ہے۔ قومی زبان کی موجودگی میں کوئی اور زبان سرکاری زبان نہ تو بن سکتی ہے اور نہ اسے ایسا مرتبہ دیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ امر بھی اپنی جگہ قابل توجہ تھا کہ سرکاری زبان کے لیے علمی زبان ہونا ضروری ہے کیوں کہ زبان کی تعلیمی اور تدریسی تربیت و اہلیت کے بغیر اسے سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہوسکتا۔ اردو زبان کے بارے میں یہ بات ذکر کے قابل ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے ان علاقوں میں اعلیٰ تعلیمی مدارج میں اردو زبان کا کوئی مقام نہ تھا۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے جو اہم قدم اٹھایا گیا وہ یونیورسٹیوں میں اردو کے پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ کا اجراء تھا۔ اس طرح اردو زبان کو اس کے تہذیبی وجود کے ساتھ اعلیٰ تعلیمی تربیت کے عمل میں شامل کیا گیا لیکن اس اقدام کے باوجود سرکاری زبان کا مسئلہ برابر برقرار رہا۔

قیام پاکستان کے بعد لسانی صورت حال کا بنیادی مسئلہ سرکاری زبان کا مسئلہ تھا اس لیے کہ سرکاری زبان کے تصور ہی کو قومی زبان کا تصور گردانا جاتا ہے۔ اعلیٰ سطح کےمملکتی کاروبار کو نبھائے بغیر کوئی زبان نہ تو سرکاری زبان کہلا سکتی ہے اورنہ قومی زبان ہی کا مقام پاسکتی ہے۔ اس لیے جب قومی زبان کا سوال پیدا ہوا (اردو کا مقام تہذیبی اور تاریخی طور پر برقرار ضرور تھا) تو اس کا موازنہ انگریزی زبان سے کیا گیا جو سرکاری زبان گردانی جاتی تھی۔ اس موازنے کے نتیجے میں یہ کہا گیا کہ اردو زبان میں سرکاری امور کے اظہار کی صلاحیت مفقود ہے۔ اس کی لفظیات محدود ہے اور اسےسرکاری زبان کا درجہ دینا غیر مناسب ہے۔ سرکاری امور کی تمام تر اصطلاحات انگریزی میں ہیں اور دفاتر کا فائل ورک بھی انگریزی میں ہے اس لیے اردو زبان کو سرکاری زبان بنانے میں بے شمار دشواریاں حائل ہیں۔ اسی سلسلے میں اس امر کی طرف بھی اشارا کیا گیا کہ قومی اور سرکاری زبان کا مقام پانے سے قبل اردو زبان کی اظہاری صلاحیت کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے اردو زبان کو لازمی ذریعۂ تعلیم بنانے کی ضرورت پر اصرار ہوا تاکہ ذریعۂ تعلیم بننے کے ساتھ اردو کی اظہاری صلاحیت میں حسب توقع اضافہ ہو سکے۔ لیکن اس اقدام کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ سائنس کے مضامین کی تدریس کے لیے اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کرنا محال ہے، اور سائنس کے مضامین اور جدید علوم کے دیگر شعبوں کو اردو میں منتقل کیے بغیر ذریعۂ تعلیم کی افادیت ظاہر نہیں ہو

سکتی۔ اس طرح اردو زبان کے ضمن میں ذریعۂ تعلیم بننے کا امکان بھی ایک اہم مسئلے کی صورت اختیار کر گیا۔ اس دوران میں پاکستان کے معاشرے میں بھی متعدد تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

قیام پاکستان کے وقت انگلش میڈیم اسکولوں کی تعداد بہت کم تھی۔ تاہم جوں جوں مالی مواقع پھیلتے گئے اور تعلیم کے بارے میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی گئی انگلش میڈیم طرز تعلیم کے بارے میں لوگوں کا شوق بڑھنے لگا اور پاکستان کے معاشرے میں اردو زبان کا تہذیبی (اور تاریخی) وجود قومی زندگی کے کردار میں اپنا خاطر خواہ مقام حاصل نہ کرسکا۔ اس کا تہذیبی وجود برابر برقرار رہا لیکن سرکاری زبان کے طور پر کوئی اہم قدم نہ اٹھایا جا سکا اور نتیجہ یہ نکلا کہ قیام پاکستان کے بعد انگریزی کے وقار میں اضافہ ہونے لگا۔ تحریک آزادی کے اس اہم عنصر (قومی زبان) کو اس کا مرکزی مقام اور تاریخی حق نہ مل سکا۔ لسانی صورت حال کی ایسی کیفیت واقعی افسوس ناک تھی۔

جس صورت حال کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک بڑی اور مضبوط عمرانی صورت حال کا حصہ تھی۔ جسے کئی طرح بیان کیا جا سکتا ہے اور جس کے منفی رویوں کو نمایاں کیا جا سکتا ہے کہ تحریک آزادی کے ایک مرکزی عنصر (زبان) کو کیوں سرکاری زبان کا مقام نہیں مل سکا تھا۔ تاہم اس سلسلے میں یہ کہنا زیادہ مناسب اور معقول ہے کہ اردو کے بارے میں واقعی لوگ اور حکومت مخلص تھے اور اس کی تہذیبی منزلت سے بھی آگاہ تھے لیکن جس نوع کی دشواریاں حائل تھیں ان کو دور کیے بغیر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ابتدائی ادارے (ترجمہ و تصنیف) قائم کیے بغیر اردو زبان کو غالباً سرکاری زبان ذریعۂ تعلیم اور علمی زبان کا مقام تفویض نہیں کیا جاسکتا تھا تاہم اس دور کی حکومتوں نے ابتدائی ادارے (مثلاً مرکزی اردو بورڈ اور مجلس ترقیٔ ادب) قائم کیے اور انجمن ترقیٔ اردو (پاکستان) کو فعال بنانے کی جانب توجہ مبذول کی اور متعدد دشواریوں کے باوجود تحریک آزادی میں مضمر زبان کے مسئلے کو بڑی حد تک پیش نظر رکھا گیا۔

قیام پاکستان کے ساتھ اردو علاقائی زبانوں کے لسانی ماحول میں وارد ہوئی۔ تاہم اس ضمن میں اہم بات یہ بھی ہے کہ تحریک آزادی کے دوران انہی علاقائی زبانوں کے لسانی ماحول میں بسنے والے مسلمانوں نے اردو کو مسلم تشخص کی علامت قرار دیا تھا اس بنیادی رویے پر تحریک آزادی کے دوران میں کبھی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان کی تحریک کے دنوں میں اردو زبان ملّی اور قومی وحدت کی نشانی کے طور پر برابر موجود رہی تھی اور اس زبان کے

ذریعے برصغیر کے مسلمانوں کی قومیت وقوع پذیر ہوتی تھی۔ تاہم قیام پاکستان کے چند برس بعد اردو اور علاقائی زبانوں کے باہمی رشتوں کے سوال رونما ہوئے۔ جن میں ایک سوال یہ تھا کہ کیا اردو کے آجانے سے علاقائی زبان کی حیثیت ختم ہوچکی ہے؟ اس مسئلے کی کئی ایک جذباتی صورتیں بھی تھیں۔ علاقائی زبان مادری زبان تھی۔ اس ضمن میں مادری اور قومی زبان کا رشتہ بھی زیر بحث آیا۔ مادری زبان بے ساختہ رویوں سے پیدا ہوتی ہے اور ان بنیادی انسانی رویوں کو مستحکم کرتی ہے۔ کیا اردو زبان کے ساتھ پاکستان کے لسانی ماحول میں وہ تعلق پیدا ہو سکتا ہے جو علاقائی زبانوں کا اپنے ماحول کے ساتھ برابر موجود رہا ہے؟ اس سلسلے میں یہ امر بھی غور طلب تھا کہ علاقائی زبانوں کا لوک ورثہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا تھا اور بعض زبانوں میں اس ورثے کی تحریری صورت بھی برابر موجود تھی۔ بنگالی بولنے والے اس بارے میں زیادہ پرجوش تھے اور ناگری میں لکھے جانے والے بنگالی ادب کو اپنا ورثہ ماننے پر بضد تھے جس کا بیشترحصہ ہندو ادیبوں کی مسلم دشمن تحریروں پر مشتمل تھا۔ ایسا رویہ معروضی نہ تھا کیوں کہ بنگال (مشرقی پاکستان) کے مسلمان وارن ہیسٹنگز کے عہد سے قبل فارسی رسم الخط میں اپنی زبان کو تحریر کرتے تھے جسے اس زمانے کا اسلامی ادب یا پوتھی ادب کہا جاتا ہے۔ اس رویے کی اساس تاریخی شعور کی مکمل نفی پر قائم تھی جسے صرف جذبات کی سرگرم یورش ہی سے منوایا جا سکتا تھا۔ ------- اس لیےقیام پاکستان کے بعد جو مسئلہ قومی تشخص کے طور پر سب سے پہلے ظاہر ہوا وہ یہ تھا کہ کیا بنگالی پاکستان کی قومی زبان ہے یا اردو کو یہ مقام حاصل ہے؟ زبان کے اس تنازعے کو قائداعظم کے اس اعلان نے دور کیا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہے!

اس موقع پر یہ امر بھی غور طلب ہے کہ قیام پاکستان کے وقت کوئی بھی علاقائی زبان (جس میں بنگالی بھی شامل ہے)ایسی نہیں تھی جو اپنے علاقے (لسانی ماحول) کے باہر یا تو بولی جاتی تھی یا جسے سمجھا جا سکتا تھا۔ بنگالی زبان کے سبب یہ بات بھی سامنے آئی کہ کیا ایک ملک اور مملکت میں‌ایسی زبان کو بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے جس کا رسم الخط دوسری زبانوں سے مختلف ہو۔ کیا ناگری اور قرآنی (عربی/فارسی) رسم الخط کے مابین سمجھوتہ ممکن ہے جبکہ تحریک آزادی کے دوران اردو اور ہندی کے مابین قرآنی اور ناگری رسم الخط کا تنازعہ بھی ایک جائز اختلاف کے طور پر موجود رہا تھا۔ غالباً اسی لیے یہ دشواری بھی رونما ہوئی کہ بنگالی کے ناگری رسم الخط کو قبول کرنے سے قومی تشخص کے مجروح ہونے کی صورت پیدا ہوتی تھی۔ بعض وجوہ کی بناء پر بنگالی (مشرقی

پاکستان کے لوگ) پوتھی رسم الخط کی جانب لوٹنے سے احتراز کرتے تھے۔ رسم الخط کے بارے میں ایسا بے لچک رویہ کسی طرح جائز نہ تھا اور یہ بات بھی جائز نہ تھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کے واحد لسانی تشخص کو نظر انداز کیا جائے اور وہ بھی محض اس بناء پر کہ آزادی کے بعد عددی اعتبار سے مشرقی پاکستان کی آبادی مغربی پاکستان کے لسانی ماحول سے زیادہ تھی۔ اس زمانے کے بااختیار ارباب اقتدار شاید اس امر کو فراموش کر چکے تھے کہ مشرقی پاکستان دراصل مشرقی بنگال میں سلہٹ کے شامل ہونے سے رونما ہوا تھا اور سلہٹ ریفرنڈم کے ذریعے پاکستان میں شامل ہوا تھا مشرقی بنگال میں شامل نہیں ہوا تھا۔ ریفرنڈم سے قبل سلہٹ صوبہ آسام کا حصہ تھا اور آسام کی زبان بنگالی نہ تھی۔

اس صورت حال میں پاکستان بننےکے بعد قومی سطح پر سب سے پہلے رسم الخط کا سوال ظاہر ہوا۔ ناگری اور قرآنی (۱۹۴۷ء سے پہلے عربی اور فارسی رسم الخط کو قرآنی کہا جاتا تھا) رسم الخط کے اس تنازعہ کو رفع کرنےکے لیے پاکستان کی قومی زبان کے لیے رومن رسم الخط اختیار کرنے کے رویے آشکار ہوئے جن کی منطق یہ تھی کہ رومن رسم الخط قرآنی اور ناگری کے تنازعے کو دور کر سکتا ہے۔ رومن رسم الخط مشرقی پاکستان کے لسانی تشخص کو مغربی بنگال کے لسانی اثر سے محفوظ رکھ سکتا ہے اور اس طرح رومن رسم الخط کو قومیت کی تشکیل کے لیے کامیابی سے استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ انڈین برٹش ایمپائر کے زمانےمیں انڈین آرمی میں رومن رسم الخط مروج تھا جو برطانوی آرمی افسروں کی سہولت کے لیے اختیارکیا گیا تھا۔ رومن رسم الخط کے طرفدار جدید ترکی کے رسم الخط کی مثال بھی دیتےتھے جس نے ترک قومیت کی تشکیل کی تھی تاہم اس ضمن میں یہ امر خیال انگیز تھا کہ رومن رسم الخط کے اختیار کرنے سے مسلمانوں کا تہذیبی ورثہ بلاوجہ انقطاع کا شکار ہو سکتا تھا۔ اردو اور علاقائی زبانوں کا اپنے تہذیبی ورثے سےرشتہ ٹوٹ جاتا تھا۔ البتہ بنگالی زبان پر اس کا اثر زیادہ ضرررساں نہیں تھا کیوں کہ بنگالی کا لسانی ورثہ پہلے ہی ناگری رسم الخط میں تھا اور اس ورثے میں ہندو اثرات کی فراوانی تھی۔ رسم الخط کے اس رویے میں انگریزی زبان کے بارے میں بعض خوش کن خیال بھی شامل تھے کہ رومن رسم الخط کے آجانے سے انگریزی اور قومی زبان کے مابین فرق بھی کم ہوگا اور ٹائپ اختیار کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔

رومن رسم الخط کا مسئلہ دراصل پاکستان کے دونوں حصوں کے قومی ارتباط کو لسانی وحدت فراہم کرنے کے لیے محض ایک آزمائشی استدلال تھا اور بنگالی اور اردو کے مابین ایک درمیانی راستے کی شکل کو ظاہر کرتا تھا۔ قیام پاکستان کے

بعد قومیت کے استحکام اور تشکیل کے ضمن میں بنگالی اور اردو کا مسئلہ بہت مشکل پیدا کرتا تھا۔ اس لیے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے دو قومی زبانوں کا تصور سامنے آیا جو درحقیقت تحریک آزادی کے تاریخی اصولوں کی نفی کرتے ہوئے تحریک آزادی کے ارادوں سے واضح انحراف کرتا تھا کیوں کہ ایک قوم دو قومی زبانوں سے اپنا تشخص اخذ نہیں کر سکتی۔ مشرقی پاکستان کے اصرار پر بنگالی کو قومی زبان کا درجہ دینا تاریخی اعتبار سے بھی غلط تھا اور عملی طور پر بھی بے بنیاد تھا۔ کیونکہ بنگال کے باہر سارے برصغیر میں بنگالی کو سمجھا نہیں جاتا تھا برصغیر میں بنگالی کبھی بھی اور کسی بھی صورت میں رابطے کی زبان نہ رہی تھی اور نہ کبھی تھی۔ اسلامی ہندوستان میں بنگالی کا کوئی مقام نہ تھا اور دارالخلافے میں اس زبان کو بہت کم سمجھا جاتا تھا۔ یہ زبان ہر اعتبار سے مقامی زبان تھی اور اس کا دائرہ اثر بے حد کم اور محدود تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں اس زبان کو ان گماشتوں سے مدد ملی تھی جو ابتدائی انگریزی زمانے میں پیش پیش تھے اور جن کے بیٹوں نے مشن اسکولوں میں پڑھنے کے بعد بنگالی ادب کی تخلیق کی تھی۔ برصغیر کی مسلم سیاست میں اور تحریک آزادی کی نشوونما اور کامیابی میں اس زبان کا کوئی حصہ نہ تھا تاہم اگر اس کے مقامی کردار کو دیکھا جائے تو اس زبان نے بھی اس حد تک مسلم عوام تک پاکستان کی تحریک کو پہنچایا تھا جس حد تک برصغیرکی دوسری علاقائی زبانوں نے یہ فرض انجام دیا تھا لیکن اسے قومی زبان کا درجہ دینا اور اسےقومی زبان بنانا ایسے اقدامات تھے جو کسی طرح جائز اور معقول نہ تھے۔ قومی زبان اردو کے مقابلے میں بنگالی اور ناگری رسم الخط کی حمایت صرف اس مقصد کے لیے تھی کہ اردو زبان کے مقابلے میں ایک دوسری زبان کو حریف بنا دیا جائے تاکہ قومیت کے استحکام اور تشکیل کے عمل کو بار آور ہونے سے روکا جا سکے۔ دو قومی زبانوں کا تصور قومیت کی تشکیل میں بہت کم سود مند ثابت ہوتا ہے۔

دنیا کے بہت کم ملکوں میں ایسی صورت دیکھنے میں آئی ہے جہاں دو زبانوں کو قومی منصب حاصل ہو۔ کینیڈا کے بارے میں البتہ دو قومی زبانوں کا تصور قابل توجہ ہے۔ کینیڈا ایک ملک کے طور پراس طرح معرض وجود میں نہیں آیا تھا جس طرح پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے۔ کینیڈا میں انگریز اور فرانسیسی دو متحارب قومیں باقاعدہ ایک دوسرے کے خلاف اس خطۂ زمین کی عملداری کے لیے برسرپیکار تھیں۔ متعدد جنگوں اور لڑائیوں کے بعد انگریز غالب آگئے اور فرانسیسی آبادکاروں نے ان کی عمل داری کو قبول کر لیا۔ یوں کینیڈا لسانی اعتبار سے دو حصوں میں بٹ گیا اور دو زبانیں قومی ارتباط اور وحدت

مملکت کے لیے اختیار کی گئیں۔ تاہم زبانوں کے لحاظ سے فرانسیسی مقامی زبان نہیں تھی اور نہ ہے۔ بنگالی کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس لیے دو زبانوں کو قومی زبان کا مقام دے کر ایک ایسی غلطی سرزد ہوئی تھی جس کی تلافی ممکن نہ تھی۔ یوں تشکیل قومیت کے عمل کو ۱۹۷۱ء میں ایک عظیم سانحے سے دو چار ہونا پڑا۔

تاریخی طور پر جب اردو قیام پاکستان کے وقت علاقائی زبانوں کے لسانی ماحول میں وارد ہوئی اس کا مقام قومیت اور تشکیل قومیت کے عمل میں مرکزی تھا (اور برابر ہے) علمی اعتبار سے یہ صورت جائز اور ہر لحاظ سے درست اور صحیح ہے۔ تاہم عام لوگوں کی سطح پر اس لسانی کیفیت نے نفسیاتی مسائل پیدا کیے جن کو نظر انداز کرنا غیر مناسب تھا۔ پاکستان میں اردو زبان اردو بولنے والوں کی صورت میں وارد ہوئی۔ علاقائی زبانوں کے لسانی منطقوں میں علاقائی زبانیں بولنے والوں کے لیے جذباتی اور نفسیاتی مسائل پیدا ہوئے۔ سوائے صوبہ سندھ (اور مشرقی پاکستان میں بنگالی زبان کے) پاکستان میں علاقائی زبانوں کا مقام واضح نہ تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے یہاں پشتو بولی جاتی تھی لیکن اس کے مدرسے نہیں تھے۔ پنجابی عام بول چال کی زبان تھی لیکن سوائے سکھوں کے کوئی اور گورمکھی نہیں پڑھتا تھا۔ شاید ہی کہیں کوئی گورمکھی کا مدرسہ بھی ہو لیکن عام مدرسوں میں گورمکھی اختیاری زبان تھی جسے عموماً سکھ طلبا پڑھتے تھے۔ فارسی رسم الخط میں پنجابی کا کوئی تدریسی مقام نہیں تھا۔ سندھ میں سندھی مدرسے البتہ موجود تھے لیکن مسلمان سندھی اردو کو ترجیح دیتےتھے۔ پنجابی کے بارے میں اس امر کی تصدیق کی جا سکتی ہےکہ اورینٹل کالج لاہور(پنجاب یونیورسٹی) میں پنجابی فاضل کے امتحانات میں زیادہ تر سکھ طلبا ہی شریک ہوتےتھے۔ پنجابی پڑھنے والے ہندو طلبا کی تعداد بھی زیادہ نہ تھی۔ مسلمان ان امتحانات میں شامل ہوتےدکھائی نہیں دیتے تھے۔ تحریری طور پر قیام پاکستان سے قبل پنجابی صرف ان پنجابی بولنے والے شاعروں کی زبان تھی جو پنجابی میں شعر کہتے تھے۔ سرائیکی علاقوں میں بھی یہی کیفیت تھی۔ پشتو کے بارے میں بھی ایسی ہی صورت تھی۔ قیام پاکستان کے وقت علاقائی زبانوں کی کیفیت لوک زبانوں کی تھی جن میں بول چال اور شعر گوئی کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ اردو کے مقابلے میں علاقائی زبانوں کے تحریری ادب اور مطبوعہ ادب کی ضخامت بے حد معمولی تھی۔

عمرانی اعتبار سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قیام پاکستان نے آزادی کے جس انسانی رویے کو آشکار کیا اس میں مسلمانوں کی خود آگاہی بھی شامل ہے۔

قیام پاکستان نے ملک کے مختلف علاقوں میں بسنے والوں کو اپنے ہونے کا اور اپنی ذات کا شعور دیا۔ اس لیے جب قیام پاکستان کے ساتھ آبادی کی نقل و حرکت کی ابتدا ہوئی اور اردو بولنے والوں کی علاقائی لسانی ماحول میں آمدورفت ہوئی تو علاقائی زبانوں کے باشندوں کو اپنی اپنی زبانوں کا شعوری ادراک ہوا اور نفسیاتی ردّ عمل کے طور پر ان کو احساس ہوا کہ وہ شاید اپنی "زبان" ہی کے سبب اپنی پہچان پاتے ہیں۔ اس ردعمل نے انہیں مادری زبان کا جذباتی تصور دیا اور تحریک پاکستان کے اندر مضمر جمہوری حق نے اس تصور کو بجا طور پر لوگوں کے حق کے طور پر تسلیم کیا۔

اس لسانی صورت حال نے مادری زبان اور قومی زبان کے بنیادی رشتے کو نمایاں کیا اوراس طرح ایک دُوہرا عمل شروع ہوا۔ پہلا یہ کہ قومی زبان کو کاروبار زندگی اور کاروبار مملکت میں کس طرح شریک کیا جائے اور دوسرا یہ کہ مادری زبان کو کس طرح مقامی طور پر زندگی کے شعبے میں اور تدریسی عمل میں شامل کیا جائے اور اس کی ترقی اور نشوونما کے لیے کیا انتظامات کیے جائیں۔ اس دوہرے عمل میں یہ مقصد بھی برابر موجود رہا کہ کس طرح قومی زبان کو علاقائی زبانوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے تاکہ قومی زبان کی نشوونما بھی برابر ہوتی رہے اور علاقائی زبانیں بھی ارتقائی صورتیں اختیار کرتی رہیں۔ اس ہمہ جہتی عمل کے ساتھ قومیت کی تشکیل کا مسئلہ ایک نئے دور میں وارد ہوا۔

۱۲۔ لسانی صورت حال کا تجزیہ

اردو زبان کے جس سیاسی، تہذیبی اور قومی پس منظر کا ذکر کیا گیا تھا اور قیام پاکستان کے وقت جس لسانی صورت حال کی طرف اشارا کیا گیا ہے۔ ان میں اردو زبان کا رول اور کردار مختلف تھا۔ اردو زبان نے اس طویل عرصے میں قومیت کے جس تصور کی تشکیل اور نمائندگی کی تھی وہ تحریک آزادی، جداگانہ ملّی تشخص، لسانی اور ادبی ورثے اور برصغیر کے مسلمانوں کی وحدت سے رونما ہوا تھا۔ دو قومی نظریہ میں اردو زبان کا مقام ایک اہم رکن کا تھا اور اس زبان کے بغیر دو قومی نظریے کی تہذیبی اساس کسی طرح تکمیل پذیر نہیں ہوتی تھی۔ تشکیل قومیت کا وہ عمل جامع اور ہمہ گیر تھا۔ اردو زبان کی وساطت سے اس عمل کی پہچان ممکن ہوتی تھی۔ اردو زبان کے حوالے سے برصغیر کے مسلمان اپنی شناخت کرتےتھے۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد قومیت کی تشکیل کا جو دور شروع ہوا اس میں اردو زبان نئی ذمہ داریوں سے دو چار ہوئی اور ان نئی ذمہ داریوں سے نئے مسائل پیدا ہوئے اور اردو زبان کے کارمنصبی اور کردار کے بارے میں نئے سوال بھی رونما ہوئے اور غالباً سب سے بڑا سوال جو قیام پاکستان کے ساتھ سامنے آیا یہ تھا کہ اردو زبان کا پاکستان میں مقام کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ اس سوال کے جواب میں کسی تمہید یامعذرت کی ضرورت نہ تھی۔ تحریک آزادی کے نتیجے میں برصغیر کی مسلم قوم نے جس آزاد وطن کا مطالبہ کیا تھا اور جس وطن کو وجود میں لایا تھا یہ زبان(اردو) اس قوم کی اور اس طرح اس آزاد وطن کی قومی اور سرکاری زبان تھی اور یوں اصولی طور پر قومی اور سرکاری زبان ہے۔ قائداعظم نے اردو زبان کو قومی اور سرکاری زبان قرار دیا تھا۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۸ء میں اردو زبان کے مقام کے بارے میں جس امر کا اظہار کیا وہ تین غیر منقسم حیثیتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے محبوب قائد ہونے کی حیثیت میں، آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر ہونے کی حیثیت میں اور ۱۹۴۸ء میں مملکت پاکستان کے گورنر جنرل ہونے کی حیثیت میں اردو کے بارے میں قائداعظم کا ارشاد دراصل نئی مملکت کے مافی الضمیر کی آواز تھی۔ پاکستان کی نئی مملکت اس زبان (اردو) کے ساتھ تاریخی طور پر پابند عہد تھی اور اس زبان کے حوالے سے اس مملکت کی قومی وحدت کو آشکار ہونا تھا۔ اس ضمن میں نہ تو ۱۹۴۷ء میں اختلاف رائے تھا اور نہ آزادی کے گزشتہ برسوں کےدوران اختلاف ہوا ہے۔ پاکستان کی زبان اردو ہے۔ ...... اس امر سے

سب اتفاق کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مملکت کی زبان ہی کسی قوم کی سرکاری، تہذیبی اور قومی زبان ہوتی ہے اور قومیں اسی زبان ہی سے پہچانی جاتی ہیں۔ ...... برصغیر میں ایک طویل عرصے سے (۱۷۵۷ء سے اور بعد ازاں ۱۸۵۷ء سے) مملکت موجود نہ تھی۔ مملکت کی بجائے نظم و نسق قائم رکھنے کے ادارے موجود تھے جن کے باہمی ربط اور مجموعے سے مرکزی حکومت کا نظام مرتب ہوتا تھا۔ برصغیر میں مملکت کی بجائے نظام حکومت رائج تھا جو دفاتر اور افسروں کی کارگزاری سے پیدا ہوتا تھا۔ ۱۸۳۵ء سے اس نظام حکومت کی زبان انگریزی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی نے مملکت کے حصول کی جدوجہد کی تھی اور جس مملکت کو حاصل کیا وہ پہلے سے موجود نہ تھی بلکہ ایک نظام حکومت موجود تھا جسے مملکت کی صورت دی گئی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کو پہلے سے موجود نظام حکومت ہی میں اقتدار اعلیٰ منتقل ہوا اور اس طرح اقتدار کی منتقلی سے مملکت معرض وجود میں آئی۔ اس اعتبار سے جب پاکستان کا قیام ہوا اس نظام حکومت کی سرکاری زبان انگریزی تھی جو اقتدار کی منتقلی کے ساتھ نئی مملکت کی نگہداری میں آیا تھا۔ یہ نظام حکومت کئی نسلوں کے دائرۂ عمر پر محیط تھا اور اس نے اپنی طویل عملداری کے دوران میں معاشرے پر گہرا اثر کیا تھا۔ اداروں کی زبان انگریزی تھی، کلچر کی زبان انگریزی تھی، علوم اور جدید سائنسی ایجادوں اور دریافتوں کی زبان انگریزی تھی۔ اس نظام حکومت کے تحت انگریزی تعلیمی درس گاہوں میں لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی تھی اور یہ ذریعۂ تعلیم بھی تھی۔ ملازمتوں کے لیے اس زبان کا جاننا لازمی تھا۔ اس ہمہ گیر اثر کے نتیجے میں تعلیم یافتہ طبقوں نے انگریزی کو باعث افتخار اور انگریزی تعلیم و تدریس کو معاشرتی عزت و تکریم کی علامت گردانا ہوا تھا۔ ایسی کیفیت میں جو افراد اس نظام حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائزتھے اور سول اور فوجی ملازمتوں میں اعلیٰ مقام پر تعینات تھے ان کی تربیت میں انگریزی کا عمل دخل بہت ہی شدید اور نمایاں تھا۔ انگریزی ان کے ذہن کی ضرورت بن چکی تھی اور کاروبار حکومت کو چلانے کے لیے انہیں انگریزی زبان میں بے حد آسانی بھی تھی۔ یوں آزادی سے قبل انگریزی زبان حاکموں کی زبان بنتے ہوئے تفوق و افتخار کا استعارہ بھی بن چکی تھی۔

تحریک آزادی کے نتیجے میں جب مملکت پاکستان وجود میں آئی اور برصغیر کے مسلمانوں کو اقتدار اعلیٰ منتقل ہوا تو انگریزی زبان جاننے کی روایت بھی نئی مملکت کے اداروں میں برابر قائم رہی اور یہ امر واضح ہوا کہ پاکستان میں نہ

صرف مسلمانوں نے عربی اور فارسی کی روایت کو ورثے میں پایا ہے بلکہ انگریزی زبان کی علمی اور فکری روایت بھی اس ورثے میں شامل ہے۔ یہاں یہ کہنا مناسب ہے کہ گو انگریزی جاننے والے انگریزی زبان کی قدر وقیمت کے قائل اور بسا اوقات پرستار بھی تھے مگر اپنے طور پر وہ مسلم قومیت کے تقاضوں سے کسی طرح ناآشنا بھی نہیں تھے۔ اس صورت حال نے لسانی اعتبار سے ایک ایسی کیفیت کو رونما کیا جو کم و بیش کسی نہ کسی شکل میں برابر موجود ہے۔ یہ کیفیت سرکاری زبان کے سوال سے وابستہ تھی کہ کیا انگریزی زبان کی جگہ اردو زبان کو سرکاری زبان کا مقام دیا جا سکتا ہے؟ اور کیا ایسا کرنا ممکن ہے؟ ان دو سوالوں کے ساتھ ایک تیسرا سوال بھی ملحوظ نظر تھا کہ کیا ایسا کرنا واقعی ضروری بھی ہے؟ جس تیسرے سوال کی طرف اشارا کیا گیا ہے وہ نظام حکومت اور مملکت کے حوالے سے ایک بالکل نیا سوال تھا۔ اگر مملکت قبل ازیں موجود ہوتی تو یہ سوال کبھی نہ اٹھتا اور چونکہ مملکت اس نظام حکومت کے بطن سے پیدا نہیں ہوئی تھی جو نظام حکومت اقتدار کی منتقلی کے ساتھ مملکت کے اجزائے ترکیبی کی شکل میں موجود تھا۔ اس لیے اس سوال کے بارے میں رویے بھی مختلف تھے۔ تاہم اس پر سب متفق تھے کہ اردو قومی زبان ہے اور اسے مملکت کی قومی زبان کا مقام دینا ہر اعتبار سے واجب اور درست ہے لیکن اسے سرکاری زبان کا درجہ دینا قابل عمل نہیں ہے کیوں کہ اردو زبان کو سرکاری زبان بننے کی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے ایک لمبا عرصہ درکار ہے۔ ------ قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں سرکاری زبان کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔

انگریزی زبان کے بارے میں بعض نفسیاتی محرکات سے قطع نظر یہ امر بھی قابل غور تھا کہ مملکت کی زبان، قومی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر کون سی زبان ہو۔ جس نظام حکومت کے ساتھ مملکت معرض وجود میں آئی تھی اس کی سرکاری زبان انگریزی تھی اور یہی زبان بین الاقوامی رابطے کی زبان بھی تھی۔ گزشتہ دو سو برسوں کے دوران میں جو قومیں ابھری تھیں ان کا تعلق یورپ سے تھا اور ان کی زبانیں (جو ان قوموں کی قومی زبانیں بھی تھیں) ہی بین الاقوامی رابطے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ انگریزی بھی ان میں ایک زبان تھی۔ اس لیے جب اردو زبان کے قومی منصب کا سوال سامنے آیا تو جہاں اس کے سرکاری زبان بننے کے امکانات زیر بحث آئے وہیں اس زبان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بین الاقوامی رابطے کی ضرورت اور مصلحت بھی تھی۔ یہ سوال اصولی نوعیت کا تھا۔ اگر قومی زبان مملکت کی سرکاری زبان ہے تو بین الاقوامی رابطے کے لیے اس زبان کو کیسے بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور اگر بین الاقوامی رابطے کی ذمہ داریاں

انگریزی زبان کی ہیں تو سرکاری زبان (اردو) کا انگریزی زبان کے ساتھ کیا رشتہ قائم جا سکتا ہے؟ اس مسئلے نے انگریزی زبان کے بارے میں غور و خوض کا طویل سلسلہ پیدا کیا اور انگریزی زبان تین مختلف پہلوؤں سے زیر غور آتی رہی۔

۱۔ انگریزی ------- بین الاقوامی زبان کے طور پر

۲۔ انگریزی ------- ثانوی زبان کے طور پر

۳۔ انگریزی ------- علمی زبان کی حیثیت میں -----

انگریزی زبان کی جو روایت گزشتہ ایک سو برس سے موجود تھی۔ اس میں اس کی اہمیت کے دو نمایاں سبب تھے۔ ایک یہ کہ یہ زبان تدریس کے نظام عمل میں لازمی زبان کا درجہ رکھتی تھی اور دوسرا یہ کہ یہ زبان نظام تعلیم میں لازمی تدریسی ذریعۂ تعلیم بھی تھی ۔ اس کا سرکاری زبان کا رول ادا کرنا بھی انہی بنیادی وجوہ کے سبب سے تھا۔ اس سلسلے میں دو سوال پیدا ہوئے۔

۱۔ کیا کوئی غیر ملکی زبان لازمی زبان کے طور پر پڑھائی جا سکتی ہے اور کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

۲۔ اور کیا کوئی غیر ملکی زبان نظام تعلیم و تدریس میں لازمی ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہے؟ اور کیا ایسا کرنا جائز ہے ؟

اسی ضمن میں ایک اور سوال بھی ظاہر ہوا۔

۳۔ کہ کیا اعلیٰ ملازمتوں کے لیے (اور دوسری ملازمتوں کے لیے بھی) انٹرویو غیر ملکی زبان میں کیے جا سکتے ہیں اور کیا اپنی ہی مملکت میں غیر ملکی زبان میں انٹرویو درست اور جائز ہے؟

ان مسائل سے جو کیفیت سامنے آئی یہ تھی کہ سرکاری زبان صرف وہی زبان ہو سکتی ہے جو نظام تدریس و تعلیم میں لازمی مضمون کےطور پر پڑھائی جائے۔ ذریعۂ تعلیم و تدریس بھی ہو اور ملازمتوں کے حصول کے لیے اسی زبان کے بارے میں دسترس ہی ملحوظ نظر رہے۔ ------- قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں ان مسائل کا حل بے حد ضروری تھا۔

لسانی اعتبار سے پاکستان کے قیام کے بعد اردو کو سرکاری زبان بننے کے لیے وہی مقام حاصل کرنا لازمی تھا جو انگریزی زبان کو ایک طویل عرصے سے میسر تھا۔ اس ضمن میں نظام تعلیم کے دائرہ کار میں اردو کی لازمی تدریسی حیثیت ضروری تھی اور اس کا ذریعۂ تعلیم بننا بھی لازمی تھا۔ اعلیٰ ملازمتوں کے نصاب اور انٹرویو میں بھی اس کی حیثیت کا لازمی تعین ہونا تھا کہ انٹرویو کے لیے قومی زبان میں گفتگو کرنا قومیت کی تشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اردو کو اس طریق کار کے مطابق قومی زندگی میں شامل کرنے سے اردو زبان قومیت کی تشکیل

میں گہرے رشتے قائم کر سکتی تھی اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کا نفوذ اور اثر احساس قومیت کی پختگی اور استحکام کا سبب بن سکتا تھا۔ یقیناً ایسے طریق کار اور نظام تدریس و تعلیم کے نتیجے ہی میں اس زبان کا سرکاری زبان کے طور پر کار فرما ہونا ممکن تھا۔ لیکن جو نظام حکومت مملکت کے قیام کے ساتھ ورثے میں ملا تھا، اس کی سرکاری زبان (انگریزی) کاروبار حکومت کے ہر شعبے پر حاوی تھی اور کئی برسوں کے اثر اور استعمال کے تحت اس سرکاری زبان نے متعدد دفتری رویے اور نفسیاتی عادات پیدا کر رکھی تھیں۔ جن کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ضروری تھا۔

کاروبار حکومت کے ہر شعبے میں (سوائے دیہاتی سطح کے) کلرک سے لے کر اعلیٰ ترین عہدے تک سرکاری زبان انگریزی نے دفتری اصطلاحات کا ایک بے حد طویل سلسلہ پیدا کر رکھا تھا۔ عدالتوں کے فیصلے، وکلاء کی جرح اور دلائل، حکمنامے، تقرریاں، تبادلے، افسران بالا کی مشاورتی رپورٹیں مراسلے درخواستیں، عرضداشتیں، اور ان پر افسر مجاز کی آراء، قواعد اور ضوابط کے نکات، ان کی تشریح، پی.یو.سی اور ڈی.ایف.اے.(کاغذات زیر غور/ ڈرافٹ برائے منظوری) سالانہ خفیہ رپورٹیں، ترقی کے لیے لازمی شرطیں، ملازم کا قلمی خاکہ، ایس.این.ای(نئے اخراجات کا گوشوارہ) اور بے شمار اور ان گنت گوشے ایسے تھے جہاں انگریزی محاورے کے مطابق انگریزی زبان مستعمل تھی اور ایک مخصوص دفتری لفظیات کے مطابق کاروبار حکومت کا نظم و نسق چلتا تھا۔ اس دفتری لفظیات نے دفتری اعتبار سے اور نفسیاتی طور پر دفاتر کے اندر ایک ایسے رویے کو پیدا کر دیا تھا کہ دفاتر کا عام انسانی ذہن ان اصطلاحات کے بغیر دفتری نظام کو کسی طرح بھی چلانے سے قاصر تھا۔ کئی برسوں کی دفتری "روٹین" نے رویوں کے گہرے نفسیاتی سانچے تعمیر کر رکھے تھے جہاں سوچنے کی بہت کم ضرورت پڑتی تھی اور اصطلاحات کے استعمال سے فائل کو متحرک رکھا جا سکتا تھا۔ قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں جب اردو زبان کو ہر سطح پر سرکاری زبان کے طور پر قبول کرنے کی ضرورت پر اصرار ہوا تو دفاتر کے نفسیاتی رویوں نے دفتری زبان کی اصطلاحات کو اس متبادل طریق کار کی راہ میں زبردست رکاوٹ قرار دیا اور کہا گیا کہ جب تک اردو زبان میں دفتری اصطلاحات کے متبادل الفاظ دستیاب نہیں ہوتے اردو زبان کا دفتری زبان (سرکاری زبان) بننا بے حد دشوار ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور امر بھی قابل توجہ تھا کہ جب سے انگریزی زبان عدالت عالیہ کی سرکاری زبان بنی تھی اور جب سے عدالتوں کے فیصلے اسی زبان میں صادر ہوئے تھے، عام آدمی(جو عموماً ان پڑھ تھا) فیصلوں کی پیچیدگیوں

سے کسی طرح آشنا نہیں ہو سکتا تھا۔ یوں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو ان
ناخواندہ لوگوں کی پریشانیوں سے ناجائز فائدہ حاصل کرتا تھا۔ عدالتیں ایک عام
آدمی کے لیے انصاف کی بجائے خوف و ہراس، لوٹ کھسوٹ اور پریشانیوں کی
علامت بن چکی تھیں۔ صرف یہی ایک شعبہ اس نشاندہی کے لیے کافی تھا کہ
انگریزی عہد حکومت میں ایک عام آدمی حکومت پر کہاں تک اعتماد کر سکتا
تھا۔ سرکاری زبان کے طور پر انگریزی زبان حکومت اور عوام کے مابین دیوار بن
کر قائم تھی اور ظاہر ہے کہ دیواریں اعتماد بحال کرنے سے عموماً گریز کرتی ہیں
اور رعب اور دبدبہ قائم کرتی ہیں۔

جس انسانی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے اس کے بارے میں یاد رکھنا ضروری ہے
کہ محض سرکاری زبان (انگریزی) کے تحت اجنبی پن غیریت اور خوف و ہراس
کو مستقل کرنا کہاں تک جائز ہے؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اردو کو سرکاری اور
دفتری زبان قرار دینا صرف ایک جذباتی رویہ ہے اور یہ کہ قومی زبان کو قومی
زندگی میں نافذ کرنے کا عمل جذباتیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ غالباً ایسی رائے
رکھتے ہوئے یہ بات بھلا دی جاتی ہے کہ ملک میں خواندگی کی شرح کتنی ہے اور
ایک عام آدمی آزادی اور انصاف کی اچھائیوں سے کہاں تک مستفید ہو سکتا ہے؟
اور کیا انگریزی کو بحال رکھنے سے عام آدمی کے دل سے اس ہراس کو دور کیا جا
سکتا ہے جو طویل عرصے سے انگریزی کی بناء پر عام آدمی کی نفسیات میں راسخ
ہوچکا ہے۔ اگر اسی مثال کا انگلستان پر اطلاق کیا جائے اور وہاں عدالتوں کی
زبان جرمن زبان فرض کی جائے تو کیا ایک عام انگریز شہری کا اپنی عدالتوں پر
اعتماد برقرار رہ سکتا ہے؟ بظاہر زبان کا سوال معمولی دکھائی دیتا ہے لیکن
نفسیاتی اعتبار سے اس کا اثر بے حد گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ اس لیے قومیت کی
تشکیل کے سلسلے میں اردو زبان کو دفتری زبان بنانا قومی اعتبار سے بے حد
ضروری تھا اور برابر ضروری ہے۔ اسی ضمن میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے (اور
اس کا قبل ازیں ذکر بھی کیا گیا ہے) کہ مملکت اور نظام حکومت کی جو دوئی
قیام پاکستان کے ساتھ ہماری قومیت کو ورثے میں ملی تھی۔اس میں انگریزی زبان کا
سرکاری زبان ہونا سب سے بڑی دشواری تھا۔ یہ زبان مملکت اور نظام حکومت
کے مابین عمرانی تفاوت اور تہذیبی اور تاریخی بُعد اور فاصلے کو پیدا کرتی تھی۔
حکمرانوں اور عام لوگوں کے درمیان دوری پیدا کرتی تھی اور مملکت کے قومی
ہونے کے احساس اور شعور کو پائمال کرتی تھی۔ مملکت عام آدمی کے ووٹ سے
وجود میں آئی تھی اور تحریک آزادی نے اسے ممکن کیا تھا جبکہ نظام حکومت کے
پاس اور نہ انگریزی زبان کے پاس ہی کوئی جواز تھا کہ وہ سرکاری اور دفتری

زبان کے طور پر لوگوں کے درمیان موجود رہے۔ تاریخ کے عمل کی راہ میں ایسی مصنوعی صورتوں کو کسی طرح روا نہیں رکھا جاتا اور نہ قومی زندگی کو غیر ملکی زبان کی وساطت سے اپنے ارادوں کی تکمیل کا امانت دار بنایا جا سکتا ہے۔

مملکت پاکستان کے وجود میں آنے سے تہذیبی اور قومی زبان (اردو) یقیناً علاقائی زبانوں کے لسانی ماحول میں وارد ہوئی اور اس طرح ان زبانوں کے ساتھ رشتہ اور لسانی ربط کے سوال بھی نمایاں ہوئے۔ مادری زبان اور قومی زبان کے باہمی تعلق کا تذکرہ بھی ہوا۔ تاہم اس ضمن میں بعض بنیادی سوال بھی ظاہر ہوئے جن کا براہ راست قومی زبان کے ساتھ تعلق تھا (اور اصولی طور پر) برابر تعلق ہے۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں ایسی لسانی صورت حال کبھی موجود نہیں رہی ہے کہ سب لوگ قومی زبان ہی میں گفتگو کرتے ہوں اور بول چال میں بھی مستند قومی زبان کا استعمال ہوتا ہو۔ ہر ملک میں مقامی بولیاں اور علاقائی زبانیں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں اور برابر موجود بھی ہیں۔ ان ممالک میں بولیوں اور علاقائی زبانوں کی نشوونما کے لیے ادارے بھی کام کرتے ہیں اور ان زبانوں میں لٹریچر بھی برابر لکھا جاتا رہا ہے اور برابر لکھتے بھی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ قومی زبان، کسی طرح علاقائی زبانوں اور بولیوں کی بے دخلی کا باعث بنتی ہے کسی طرح درست نہیں ہے۔ ہر ملک کی قومی زبان علاقائی زبانوں کے لسانی ماحول میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے اور تعلیم و تدریس، دفاتر اور سرکاری اور علمی زبان ہونے کی بناء پر ملک اور معاشرے میں اتحاد اور تشکیل شعور اور استحکام قومیت کا سبب بنتی ہے۔ ذرائع ابلاغ قومی زبان ہی میں ملک اور قوم کے معاملات کو قارئین اور سامعین تک پہنچاتے ہیں اور قومی زبان ہی کی وساطت سے جمہوریت اور تمدنی تقاضوں کے مسائل سے اپنے ملک کے باشندوں کو آگاہ کرتے ہیں۔ گھروں میں مقامی بولیوں اور علاقائی زبانوں ہی کا استعمال ہوتا ہے۔ یوں مقامی بولیوں (علاقائی زبانوں) اور قومی زبان کے درمیان کہیں بھی تضاد دکھائی نہیں دیتا۔

اگر مقامی بولیوں اور علاقائی زبانوں کے عمرانی عوامل کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ ان لسانی کثرتوں کے ذریعے قومی زبان زندہ اور متحرک رہتی ہے اور اس کا رشتہ لوگوں کے ساتھ اور انسانی فطرت کے ساتھ برابر قائم رہتا ہے۔ مقامی بولیاں اور علاقائی زبانیں، جو لوگوں کی عام بول چال کی بناء پر انسانی سرشت اور طبیعت سے قریب تر ہوتی ہیں، قومی زبان کو تازگی اور بالیدگی فراہم کرتی ہیں۔ .... یہ امر بے حد قابل توجہ ہے کیوں کہ جو ذمہ داریاں قومی زبان ادا کرتی ہے اور اسے جن ضرورتوں اورمقاصد کے لیے استعمال

کیا جاتا ہے ان کی موجودگی میں قومی زبان مسلسل اور متواتر عمل کے نتیجے میں علمی صورت اختیار کرتی چلی جاتی ہے اور اس کے مراکز تمدن کے عین وسط سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یعنی قومی زبان اپنا کردار ادا کرتے ہوئے اپنا لسانی وجود، درس گاہوں، ذرائع ابلاغ، تخلیقی ادب، دفاتر اور اعلیٰ سطحی کانفرنسوں سے اخذ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور کسی طرح لوگوں تک اور انسانی فطرت تک براہ راست نہیں پہنچ پاتی جس طرح مقامی بولیاں اور علاقائی زبانیں ان سرچشموں تک رسائی پاسکتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قومی زبان کی زندگی اور نشوونما کے لیے مقامی بولیوں اور علاقائی زبانوں کے لسانی ماحول کا موجود ہونا از حد ضروری ہے۔

تاہم کثرتوں اور قومی زبان کی وحدت کے مابین جس رشتے کی جانب اشارا کیا گیا ہے اس میں بعض دیگر کوائف کو بھی شامل کرنا مناسب ہے۔ بسا اوقات (اور بعض ممالک اور تمدنوں میں) قومی زبان کا اس لسانی گھرانے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جس لسانی گھرانے سے مقامی بولیوں اور علاقائی زبانوں کا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی صورت حال میں قومی زبان اپنی نشوونما کے لیے اپنے انسانی خصائص کو محدود سے محدود تر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ایسی کیفیت وہاں ظاہر ہوتی ہے جہاں کسی ملک کی انسانی صورت حال آزادنہ ہو اور کسی ایسی زبان کو قومی زبان کا مقام دے دیا گیا ہو جس کا علاقے کی بولیوں اور زبانوں سے اور ان کے ادبی ورثے سے کوئی رشتہ نہ ہو۔ مثلاً سوویت یونین میں قومی اور سرکاری زبان روسی ہے لیکن مختلف علاقوں کی اپنی اپنی زبان صوبائی زبان ہے۔ ان حالات میں شاید وہ نتائج پیدا نہیں ہوسکتے جن کی طرف اشارا کیا گیا ہے۔ ایسی صورت حال میں بنیادی اور ثانوی زبان کا تصور رونما ہوتا ہے۔ بنیادی زبان (جو قومی زبان کا مقام رکھتی ہے) ثانوی زبان کے لسانی سرچشموں سے بہت کم مستفید ہوسکتی ہے۔

تاہم پاکستان میں زبانوں کا لسانی اور تہذیبی گھرانہ ایک ہے اور اردو اور علاقائی زبانیں (اور مقامی بولیاں) کم و بیش ایک ہی تمدنی تاریخ سے اپنا وجود اخذ کرتی ہیں۔ ان کی لفظیات، قواعد اور رسم الخط ایک سے ہیں اور سب ایک ہی تہذیبی ورثے سے اپنا تشخص پاتی ہیں۔ اس لیے ان زبانوں اور قومی زبان کے درمیان زندہ اور متحرک رشتے برابر قائم رہ سکتے ہیں۔ ------ اسی ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جہاں قومی زبان اپنے کردار اور فرائض کی بناء پر مجرد، اصطلاحی اور علمی زبان بننے پر مجبور ہے وہیں اس کی لسانی سرشت سے انسانی جذبات کی فعال جہت بھی برابر منہا ہوتی چلی جاتی ہے۔ قومی زبان کے لیے ایسا

ہونا لازمی اور منطقی ہے۔ ان حالات میں علاقائی زبانوں اور مقامی بولیوں کا لسانی ماحول قومی زبان کے لیے انسانی جذبات کی فعال جہت کو برابر موجود رکھتا ہے اور تخلیقی ادب کے ذریعے اس جہت کو قومی زبان کی افزائش کے لیے بروئے کار لاتا ہے۔ انسانی جذبات کی جہت کا موجود رہنا قومی زبان کے لیے بے حد ضروری ہے۔ پاکستان میں اردو کو یہ جہت علاقائی زبانوں اور مقامی بولیوں کے لسانی ماحول سے دستیاب ہوتی ہے۔

لیکن یہ رشتہ یک طرفہ نہیں ہے۔ قومی زبان کے زیر اثر مقامی بولیاں اور علاقائی زبانیں اپنے جذباتی جغرافیے میں برابر موجود رہتے ہوئے قومی زبان کے عقلی اور اصطلاحی مزاج سے تصورات تک پہنچنے کی صلاحیت کو اخذ کر سکتی ہیں اور یوں اپنے ارتقا کے مراحل طے کر سکتی ہیں۔ زبانوں کے اس رشتے سے دونوں (قومی اور علاقائی زبانیں) برابر زندہ رہتی ہیں اور ایک دوسرے کی افزائش کا سبب بن سکتی ہیں۔

قیام پاکستان کے ساتھ اردو کے بارے میں ایک خیال یہ بھی پیدا ہوا کہ یہ زبان ایک خاص علاقےکی زبان ہے اور اس کالہجہ، اس کا صوتی نظام اور اس کے مستند مراکز صرف اس خاص علاقے ہی سے وابستہ ہیں۔ اس سلسلے میں یہ کہنا قابل توجہ ہے کہ اردو کو ماضی کے کسی خاص علاقے کے ساتھ مستقل طور پر منسوب کرنا درست نہیں ہے کیوں کہ قیام پاکستان کے بعد اردو کے مراکز بھی بدل گئے ہیں اور لہجوں اور صوتی نظام کا ماحول بھی بدل گیا ہے۔ جملوں کی ساخت میں اور بسااوقات گرامر میں بھی عام فہم تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ ایسا ہونا تاریخی طور پر ضروری بھی تھا اور تمدنی اعتبار سے ضروری بھی ہے اس لحاظ سے اردو کو قومی اور سرکاری زبان کا مقام سونپتے ہوئے یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اردو جس لہجے اور اصواتی ماحول میں وارد ہوتی ہے اسے اردو زبان کی تقویت کےلیے ضروری عنصر کے طور پر قبول کیا جائے۔

علاقائی زبانوں اور مقامی بولیوں کے جس ماحول میں قومی زبان، علمی زبان اور سرکاری زبان کی حیثیت میں وارد ہوتی ہے وہاں قومی زبان رابطے کی زبان کے فرائض بھی انجام دیتی ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی قومی زبان ہی ملک کے اندر رابطے کی زبان کی ذمہ داریاں پوری کرتی ہے۔ یوں علاقے لسانی طور پر الگ وحدتیں ہوتے ہوئے بھی قومی زبان کی وساطت سے قومی وحدت کا ناقابل تقسیم جزو بن جاتے ہیں اور یوں قومیت کی تشکیل کے مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ تاہم رابطے کی زبان اور تشکیل قومیت کے عمل کو ایک دوسرے زاویے سے بھی زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ ---

برصغیر کے عمرانی مطالعے میں یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اس وسیع تر خطۂ زمین میں مقامی بولیوں اور علاقائی زبانوں کی کثرت کے اسباب غالباً کئی تھے ایک یہ کہ برصغیر قدیم زمانے سے کئی نسلی گروہوں کی نقل مکانی سے آباد ہوتا رہا ہے۔ ہر نسلی گروپ اپنی مخصوص بولی کے ساتھ اپنے علاقے میں آباد ہوتا رہا ہے۔ یوں جس علاقے میں جو بھی نسلی گروپ وارد ہوا اس کی اپنی بولی اور مقامی بولی کے امتزاج سے اس خاص علاقے کی زبان پیدا ہوئی۔ اس ضمن میں ان زبانوں کی مزید نشوونما تمدنوں کے اثرات کے تحت بھی ہوئی اور خاص طور پر پاکستان کے علاقوں میں تمدنی اثرات (اسلام اور تصوف) نے علاقے کی تمام زبانوں اور بولیوں کو یکساں انداز میں متاثر کیا۔ اس طرح ان زبانوں کا تمدنی پس منظر ایک اور مشترک رہا لیکن زبانیں اپنے مقامی جغرافیے اور نسلی تفاوتوں کے تحت ایک دوسرے سے مختلف رہیں۔ پشتو، ہندکو، پوٹھواری، گوجری، کشمیری، پنجابی، سرائیکی، سندھی، براہوی، بلوچی اور شمالی علاقے کی زبانیں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ فکری طور پر ہم آہنگ ہونے کے باوجود مختلف زبانیں رہیں اور اپنے اپنے علاقے کی نمائندگی کرتی رہیں۔ دوسرا سبب غالباً یہ تھا کہ برصغیر کا معاشرہ کئی صدیوں تک برابر غیر متحرک رہا تھا۔ علاقے کے لوگ بہت کم اپنے علاقے کو چھوڑتے تھے اور کسی دوسرے علاقے میں سکونت اختیار کرنے پر آمادہ ہوتے تھے۔ تاہم یہ امر بھی دلچسپ ہے کہ اسلامی ہندوستان کے عہد حکومت میں پشتو اور فارسی بولنے والے لوگ جب یوپی اور دہلی میں آباد ہوئے تو اردو بولنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کا اپنا رشتہ ان کی آبائی زبانوں سے منقطع ہوگیا۔ اس زمانے میں معاشرے کے غیر متحرک ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ روز گار کے وسیلے محدود تھے اور عموماً اپنے ہی علاقے میں دستیاب ہوتے تھے۔ کسی دوسرے علاقے میں آباد ہونے سے نسلی تفاوتوں کا تضاد رونما ہوتا تھا اور روزگار کے مواقع بھی مخدوش تھے۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ نقل و حرکت کے ذرائع سست رفتار تھے اور فاصلے منزلوں کے حساب سے طے ہوتے تھے۔ اس لیے سفر کرنا اور سفر طے کرکے دور دراز کے مقامات میں آباد ہونا کوئی معمولی شے نہیں تھا۔ غالباً اسی لیے لوک شاعری میں پردیس کا تصور کوئی خوشگوار تاثر نہیں دیتا۔ اسی ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان حالات میں جو فرد اپنے علاقے کو خیر باد کہہ کر کسی دوسرے علاقے میں آباد ہوتا تھا وہ اس علاقے کا مستقل باشندہ بن جاتا تھا اور اسی علاقے ہی کی زبان کو اپنی زبان کے طور پر قبول کر لیتا تھا۔ ایسا عمل عموماً اس زمانے میں وقوع پذیر ہوتا رہا تھا جب برصغیر کی مرکزی حکومت مضبوط اور مستحکم ہوتی تھی۔ جو علاقے مرکزی حکومت کے

نظم و نسق سے باہر تھے وہاں لوگوں کی علاقے کو چھوڑنے کی رفتار بھی نہایت کم ہوتی تھی۔

تاہم گزشتہ ایک سو برس کے دوران جب برصغیر میں ریلوے کا نظام قائم ہوا، دریاؤں پر پختہ اور آہنی پل تعمیر ہوئے تو سفر کی آسانی کے ساتھ جان و مال کی حفاظت بھی یقینی ہوتی گئی۔ یوں برصغیر کے لوگ اپنے آبائی علاقوں کو چھوڑ کر بڑے بڑے شہروں میں تلاش روزگار اور ملازمت کے لیے آباد ہوئے۔ یہ بے شمار افراد اپنی مقامی بولیوں اور علاقائی زبانوں کے ساتھ شہروں میں آباد ہوئے تاہم، روزمرہ کی ضرورتوں کے تحت انہیں کسی مشترک زبان کو رابطے کے طور پر اپنانا پڑا۔ اسی بنیادی ضرورت کے طور پر برصغیرمیں اردو زبان رونما ہوئی تھی اور رابطے کی زبان کےطور پر اردو ہی ان بے شمار لوگوں کے مابین افہام و تفہیم کا وسیلہ بنی جو بڑے بڑے شہروں میں آباد ہوئے تھے۔ اپنے ہم زبانوں کے درمیان ان کی مقامی بولی (اور علاقائی زبان) ربط باہم کا سلسلہ قائم رکھتی تھی لیکن اپنے حلقے کے باہر اردو زبان ہی ان کو دوسرے افراد کے ساتھ ہمکلام ہونے میں مدد گار ثابت ہوتی تھی۔

تاہم قیام پاکستان کے بعد اس عمرانی عمل میں بھی کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ سب سے بڑی تبدیلی جو وقوع پذیر ہوئی یہ تھی کہ آزاد وطن کے شہری ہونے کے سبب ان پر نقل و حرکت کے سلسلے میں کوئی پابندی نہ تھی۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ روزگار کے مواقع بڑھ گئے۔ صنعتی کارخانوں، امپورٹ ایکسپورٹ کے اداروں اور کاروبار کے مرکزوں کے پھیلنے سے آبادی بھی دیہات سے شہروں کی جانب نقل مکانی کرنے لگی۔ لسانی اعتبار سے یہ نقل و حرکت دراصل مقامی بولیوں اور علاقائی زبانوں کی نقل و حرکت تھی جو ایسے مقامات کی طرف نقل مکانی کر رہی تھی جہاں ذرائع ابلاغ رابطے کی زبان اور دفاتر کے ارد گرد بولی جانے والی زبان اردو تھی۔ یوں ایسے عمرانی عمل کے نتیجے میں علاقائی زبانوں اور قومی زبان کے مابین ایک نیا رشتہ قائم ہوا اور ایسے امکانات پیدا ہوئے کہ قومی زبان اور علاقائی زبانوں (اور مقامی بولیوں) کے مابین لسانی تفاوت کم ہوگا وہیں ان کے باہمی ربط اور تعلق سے قومی زبان کی جڑیں بھی لوگوں میں پختہ ہوں گی اور پاکستان کی سرزمین اردو کی لسانی ترقی کے لیے ایک نیامستقبل پیدا کرے گی۔ قومیت کی تشکیل میں ان امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

لسانی صورت حال کے تجزیے کے بعد ایک بار پھر اردو اور انگریزی زبان کےباہمی رشتےکا سوال سامنے آتا ہے۔ اس امر کی وضاحت کی جا چکی ہےکہ تشکیل قومیت کے مقاصد کےتحت اردو کےقومی زبان اور سرکاری زبان بننےکے لیے

ان مراحل کو طے کرنا ضروری ہے جن پر عرصہ دراز سے انگریزی زبان کی اجارہ داری رہی ہے۔ تاہم اس ضمن میں یہ بات توجہ طلب ہے کہ مملکت نہ صرف قومی اکائی کے طور پر وجود پاتی ہے بلکہ بین الاقوامی اکائی کے طور پر بھی اس کا وجود رونما ہوتا ہے۔ اس لیے جب قومی زبان اور تشکیل قومیت کا سوال سامنے آتا ہے تو یہ مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مملکت اپنے بین الاقوامی معاملات کے لیے کون سی زبان استعمال کرے گی؟ قومی مملکت کے طور پر بین الاقوامی معاملات کے لیے قومی زبان ہی کا استعمال جائز اور واجب دکھائی دیتا ہے لیکن دنیا کے جس سیاسی نقشے نے بین الاقوامی معاملات کو ظاہر کیا ہے اس نقشے میں قومی زبان کا کردار فی الوقت محدود نظر آتا ہے۔ کسی زمانے میں اسلامی ہندوستان کے ساتھ بیرونی حکومتیں اس زمانے کی سرکاری زبان (فارسی) میں معاملات طے کرتی تھیں۔ عہد نامے بھی اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ دربار میں غیر ملکی سفیروں کے لیے بھی اسی زبان میں گفتگو کرنا ضروری تھا۔ لیکن عصر حاضر میں ایسا مقام پانے کے لیے کچھ عرصہ درکار ہے۔ اس لیے جب مملکت کی بین الاقوامی معاملاتی زبان کا سوال سامنے آتا ہے تو انگریزی زبان ہی کی افادیت سے مستفید ہونے کی گنجائش نکلتی ہے۔ یہ صورت حال لسانی مسئلے کو کچھ اس طرح ظاہر کرتی ہے۔

١۔ بین الاقوامی امور کی زبان ----- انگریزی

٢۔ قومی اور سرکاری امور کی زبان ----- اردو

اس مسئلے کی مزید وضاحت سے یہ امر بھی نمایاں ہوتا ہے کہ بین الاقوامی امور خواہ مملکت کے ہوں یا کاروبار کے ان کی انجام دہی کے لیے انگریزی زبان کا جاننا ضروری ہے، اس لیے انگریزی زبان کے مقام کا تعین بھی لازمی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک کی ساری آبادی کے لیے اس زبان کا جاننا ضروری بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ بین الاقوامی امور کاروبار کے معاملات کی انجام دہی میں صرف وہی لوگ شریک ہوسکتے ہیں۔ جو انگریزی جانتے ہوں اور اس زبان میں دسترس رکھتے ہوں۔ ان لوگوں کی تعداد سارے ملک کی آبادی کے مقابلے میں یقیناً بہت زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ان ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انگریزی زبان کو ثانوی زبان کا درجہ فراہم کرنا ضروری ٹھہرتا ہے۔ کئی ملکوں میں ان معاملات کی انجام دہی کے لیے انگریزی زبان کو ثانوی زبان کے طور پر نظام تعلیم کا جزو بنایا گیا ہے اوراس طرح نہ تو ان ملکوں کی قومیت کا احساس کسی طرح متاثر ہوا ہے اور نہ لازمی انگریزی کی تدریس کے نتیجے میں انسانی افرادی قوت کا اس درجے زیاں ہوا ہے جیسا ہمارے نظام تعلیم کے طریق کار کی موجودگی میں ہوتا

رہا ہے۔ تاہم اگر اس اعلیٰ سطح پر زبانوں کے مقام کو سمجھا جائے تو احساس ہوگا کہ زبانیں اپنا وقار اور مقام اپنی قوموں کے وقار اور مقام سے اخذ کرتی ہیں اور اس مقصد کے لیے تاریخی عوامل کا ادراک نہایت ضروری ہے۔ جو زبانیں اور جو قومیں عصر حاضر میں بین الاقوامی مقام کی حامل ہیں وہ تین چار سو برس قبل ایسے مقام پر کسی طرح فائز نہیں تھیں۔ قومیت کی تشکیل ہی نے انہیں ایسا منصب دیا ہے۔ ان قوموں کے تاریخی ارتقا میں قومی زبان کے کردار کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم قیام پاکستان کےبعد خود انگریزی زبان کے بارے میں برطانوی رویوں میں بھی تبدیلی واقع ہوئی اور یہ عمل بتدریج ہوا۔ انگریزی عہد حکمرانی میں انگریزی زبان برٹش ایمپائر کی لازمی اور سرکاری زبان تھی۔ ایشیا اور افریقہ میں انگریزی زبان کا یکساں معیار اور مقام تھا لیکن دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء - ۱۹۴۵ء) کے بعد جہاں برطانیہ کی سلطنت ختم ہوئی اور نئے ممالک اور آزاد قومیں ظاہر ہوئیں وہیں انگریزوں نے برطانیہ کے باہر افریقہ اور ایشیا میں انگریزی زبان کے بارے میں اپنے قدیم نقطۂ نظر میں مناسب ترامیم کیں اور اس امر کو برملا تسلیم کیا کہ ان آزاد ممالک میں جہاں ان کے عہد حکومت میں انگریزی کا مقام ترجیحی تھا اب وہ مقام ان ممالک کی قومی زبانوں کو حاصل ہو چکا ہے۔ B.B.C. سے ہندی اور اردو میں نشریاتی سروس اس برملا اقرار کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اور دنیا کے بدلے ہوئے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انگریزوں نے اپنی یونیورسٹیوں میں انگریزی زبان کے نئے ڈسپلن قائم کیے جہاں انگریزی کی تدریس کے نئے رویوں کو رواج دیا گیا۔ ان نئے تدریسی رویوں کی روشنی میں انگریزی زبان کے افادی پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا اور تین نمایاں ڈسپلن ترتیب پائے۔

١۔ انگریزی زبان کی تدریس، بین الاقوامی زبان کے طور پر

٢۔ انگریزی زبان کی تدریس، غیر ملکی زبان کےطور پر

٣۔ انگریزی زبان کی تدریس، ثانوی زبان کےطور پر

بین الاقوامی زبان کے طور پر انگریزی کا تدریسی مقام وہی رہا جو لازمی زبان کےطور پر عرصۂ دراز سے برطانوی سلطنت کے دوران تھا۔ یہ زبان بین الاقوامی امور اور جدید علوم و افکار کے لیے کارآمد گردانی گئی ہے۔ تاہم غیر ملکی زبان کی حیثیت میں اور ثانوی زبان کے طور پر انگریزی زبان کا مقام قومی زبانوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے وضع ہوا تھا۔ انگریزوں کے اس دوررس انداز فکر کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا ضروری ہےکہ پاکستان میں اور تیسری دنیا کے ممالک میں

انگریزی کو لازمی زبان قرار دینے کا رویہ متروک ہو چکا ہے اور خود انگریز اپنی زبان کے لیے ان ممالک میں ایسا کوئی رول تسلیم نہیں کرتے۔ برٹش کونسل بھی انگریزی زبان کو افادی ضرورتوں کے تحت پڑھائے جانے کے رویوں پر اصرار کرتا ہے اور ایسے پروگراموں ہی کو اپنے لائحہ عمل میں شامل کرتا ہے جو انگریزی کو غیر ملکی زبان اور ثانوی زبان قرار دیتے ہیں۔

ایسے رویوں کے آجانے سے انگریزی کی مرکزی اہمیت بھی متاثر ہوئی ہے اور پرانے عہد کے برطانوی مقبوضات کے لیے زبان کے بارے میں رائے بدلنے کا زمانہ شروع ہوا ہے۔ ان حالات میں انگریزی کو لازمی زبان کے طور پر پڑھنے اور پڑھانے کا دور ختم ہو چکا ہے اور اسے صرف اختیاری مضمون کے طور پر ہی شامل تدریس کیا جاسکتا ہے۔ جہاں اسے فارن زبان کے طور پر یاثانوی زبان کے طور پر بآسانی پڑھا جا سکتا ہے اور صلاحیتوں کے مطابق اس میں دسترس اور عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی زبان کے بارے میں نئے تدریسی رویےایسے ہیں جن سے اس زبان کی افادیت کو بخوبی بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اس لیے جب انگریزی زبان کے بارے میں پرانے رویوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور یہ کہا جاتا ہےکہ لازمی انگریزی کے بے دخل ہو جانے سےکوئی سانحہ رونما ہوگا تو ایسا ردعمل محض غیر قدرتی نفسیاتی دباؤ اور ذہنی عادت کی نشاندہی کرتے نظر آتا ہے۔ اصولی طور پر قیام پاکستان کے بعد انگریزی زبان نے قومی زبان کے لیے فرائض کی انجام دہی کا راستہ کھول دیا تھا اور کسی طرح بھی قومی زبان کی مد مقابل نہیں‌تھی۔ اس لیے جب کبھی تشکیل قومیت کے لیے قومی زبان کے مقام و منصب کا ذکر ہوتاہے اور انگریزی زبان کے چلےجانے کا بے بنیاد چرچا ہوتا ہے تو ان ساری باتوں کے پردے میں معاشرے کا طبقاتی شعور کار فرما دکھائی دیتا ہے۔ تشکیل قومیت کے ضمن میں قومی زبان اور انگریزی کے افادی پہلوؤں کو ہم آہنگ کرنے کے لیے صرف تجربے اور طریق کار ہی کی ضرورت ہے۔ تاریخ اور زمانہ ------ اور خود برطانیہ کے اہل دانش، اس صداقت کی تائید کرچکے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں اور قومیت کی تشکیل میں صرف قومی زبان ہی مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے۔

تاہم انگریزی اور اردو کے باہمی لسانی رشتے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک بنیادی سوال ضرور ابھرتا ہے جو انگریزی زبان کےلازمی مضمون کےطور پر پڑھائے جانے سے متعلق ہے۔ غالباً تیسری دنیا میں جنوبی ایشیا واحد تمدنی منطقہ ہے جہاں لازمی انگریزی کی تدریسی روایت ۱۸۳۵ء سے برابر موجود ہے۔ اس لیے کیا یہ امر واقعی ضروری ہے کہ اس لازمی مضمون کی روایت کو ختم کر دیا جائے؟ کیا لازمی مضمون کی روایت کو تدریسی عمل میں برابر شریک کرتے ہوئے قومی زبان

کو اس کا منصب اور مقام نہیں دیا جاسکتا؟ لازمی مضمون کی یہ روایت تعلیمی اور تدریسی عمل کا ایک بنیادی جزو بن چکی ہے اور غالباً تعلیم کا تصور انگریزی کی لازمی تدریس کے بغیر مکمل بھی نہیں ہوتا۔ ایسا رویہ ڈیڑھ سو برس کی ذہنی عادت کا نتیجہ بھی ہے اور عصر حاضر کی ٹیکنالوجی کے پیش نظر بھی پیدا ہوا ہے۔ اس لیے غیر ملکی زبان اور ثانوی زبان کے نظریے جو انگریزی کو اختیاری مضمون بناتے ہیں اس روایت کی نفی کرتے ہیں جو لازمی مضمون کے طور پر انگریزی زبان سے موسوم ہے۔ قیام پاکستان کے بعد قومی زبان کے مرتبے اور مقام کا سوال اس روایت کے برقرار رہنے سے کسی طرح متاثر نہیں ہوتا بشرطیکہ قومی زبان کو سرکاری زبان کا مقام دیا جائے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قومی زبان کو سرکاری زبان بنا کر انگریزی کی لازمی تدریس کسی طرح متاثر نہیں ہوسکتی کیوں کہ تدریسی عمل میں قومی زبان کا مقام بھی لازمی مضمون ہی کا ہوا کرتا ہے۔

۱۴۔ اردو کیوں ؟ انگریزی کیوں ؟

قیام پاکستان کے بعد جس لسانی صورت حال کا (انگریزی زبان کے حوالے سے) گزشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی روشنی میں جو سوالات پیدا ہوتے رہے ہیں ان کا معروضی طور پر جائزہ لینے سے گریز کیا گیا ہے۔ اس لیے جب اردو زبان کے قومی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے ذکر ہوا ہے بعض رویے ایسے ظاہر ہوتے ہیں جو ایسے لسانی کردار کو بلاوجہ جذبات پرستی سے موسوم کرتے ہیں۔ دنیا کی کسی بھی مملکت میں قومی زبان کے کردار کو چیلنج نہیں کیا گیا اور نہ دنیا کی دوسری قومیں قومی زبان کی صلاحیتوں کے بارے میں اس قدر بے بہرہ ہونے کا ثبوت دیتی ہیں جیسا رویہ بعض ایسے حلقوں کی جانب سے سامنے آتا رہا ہے جو قومی زبان کے کردار کے بارے میں تشویش اور ہراس کو نمایاں کرتے رہے ہیں۔ اردو کا قومیت کی تشکیل میں کردار صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے جب اس زبان کو وہ مقام حاصل ہو جو انگریزی زبان نے تاریخ کے بعض حالات کے نتیجے میں کئی نسلوں سے غصب کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ سوال کہ اردو کیوں قومی زبان ہو؟ اسے قومیت کی تشکیل میں مثبت مقام کیوں دیا جائے ؟ اور اسے انگریزی کی جگہ کیوں رواج دیا جائے؟ ایسے سوال ہیں جو تاریخ کی منطق کو نظر انداز کرتے ہیں، تحریک آزادی کے مقاصد کی نفی کرتے ہیں اور ان بے شمار بزرگوں اور نسلوں کی جانی قربانیوں کو فراموش کرتے ہیں جن کے تاریخی عمل سے وہ دن نصیب ہوا کہ برصغیر کے مسلمان آزادی اور آزاد وطن کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔ انگریزی زبان کے پاس تاریخی نوعیت کا ایسا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس کے برعکس شروع میں انگریزی زبان کا کردار ایک تباہ کن دشمن کا تھا جس نے پہلے فارسی اور بعد میں اردو کو تہذیبی اور سرکاری مناصب سے ہٹا کر اپنے آپ کو ان کی جگہ پر فائز کر لیا اور مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں کے ایک طویل سلسلے کو جنم دیا۔ انگریزی زبان نے برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی میں قطعاً کوئی کردار ادا نہیں کیا اور نہ اس زبان نے مسلمانوں کے ملی وجود کو استحکام بخشا ہے کیوں کہ یہ زبان صرف ایک بے حد معمولی اقلیت کی زبان رہی تھی اور اس زمانے میں بھی انگریزی جاننے والوں کا تناسب پاکستان کی کل آبادی میں بے حد معمولی ہے۔ انگریزی زبان میں ناکام ہونے والے امیدواروں کی تعداد ہی اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس زبان کے ذریعے پاکستان کے افرادی ذہن کا کس درجے زیاں ہو رہا ہے اور اگر ناکام امیدواروں کو انگریزی کی مخالفت میں

عمومی رائے عامہ کا درجہ دیا جائے تو یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ہماری نوعمر نسلوں کی تقریباً ۷۰٪ تعداد انگریزی زبان کے روایتی مقام و منصب کی نفی کرتی ہے اور ایسے مقام اور منصب کو برقرار رکھنے کے حق میں نہیں ہے۔

انگریزی زبان موجودہ زمانے میں عالمی سطح پر نہ صرف علمی زبان کے طور پر مستعمل ہے بلکہ کاروباری زبان بھی ہے۔ اس اعتبار سے اس زبان کی افادیت کو ان دو تقاضوں کی روشنی میں بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ تاہم اگر علمی زبان کے طور پر بھی اور کاروباری زبان کی حیثیت میں بھی اس کا مقام پرکھا جائے تو اس زبان کے فہم و ادراک کا حلقہ بھی عددی اعتبار سے کچھ زیادہ وسیع اور پھیلا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے یہ زبان صرف اہل علم اور اعلیٰ کاروباری طبقے تک ہی محدود نظر آتی ہے اور یہ دونوں ضرورتیں انگریزی بہ طور فارن زبان (EFL) اور بہ طور ثانوی زبان (ESL) پورا کر سکتی ہے۔ یوں اسے لازمی زبان کے طور پر مستعمل رکھنا غیر ضروری دکھائی دیتا ہے۔

تاہم موجودہ زمانے میں انگلش میڈیم سکولوں کی افراط اور پاکستان کے متعدد گھرانوں کی مقبول عام روش کہ بچوں کو انگلش میڈیم سکولوں میں داخلہ دلایا جائے ایک ایسی کیفیت ہے جسے انگریزی زبان کے مقام و منصب میں علمی اور تدریسی جواز کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ان سکولوں کی طرف رجحان اس لیے بھی حد سے بڑھ گیا ہے کہ ان سکولوں کے مقابلے میں اردو میڈیم سکول معاشرتی اور ثقافتی لحاظ سے کئی درجے کم تر ہیں اور وہ لوگ جو انگلش میڈیم سکول کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں وہ ہمارے ملک کے اوسط آمدنی والے اشخاص سے کہیں زیادہ خوشحال ہوتے ہیں۔ انگلش میڈیم سکول اس اعتبار سے انگریزی زبان کی افادیت کی بجائے طبقاتی فرق اور معاشرتی تفوق کی بناء پر طلبا کو اپنی جانب راغب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انگلش میڈیم سکول کاروبار کے مواقع اور ملازمتوں کے بہتر امکانات کے لیے بھی فروغ پاتے ہیں۔ اس طرح ان سکولوں سے پڑھ کر نکلنے والے طلبا کلچر کے حوالے سے اپنا تشخص پاتے ہیں۔ یہ کلچر انگریزی زبان کے ساتھ منسوب ہو کر آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو معاشرے کی انسانی وحدت سے الگ تھلگ کرتا ہے۔ تاہم اگر اس صورت حال کو بغور دیکھا جائے تو احساس ہوگا کہ انگریزی کے برابر قائم رہنے کے لیے جو جواز پیش کیا جاتا ہے وہ بنیادی طور پر علمی اور تہذیبی نہیں ہے بلکہ غیر ملکی کاروبار، مغربی کلچر اور اچھی ملازمتوں کے حصول کو اہمیت دیتا ہے۔ ایسا کردار انگریزی کو غیر ملکی زبان یا ثانوی زبان کے طور پر پڑھانے سے بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔

تاہم اگر انگلش میڈیم سکول کے تدریسی منظر کو معاشرتی زندگی کے حوالے سے دیکھا جائے تو معاشرہ تعلیمی طور پر دو الگ الگ وحدتوں میں تقسیم ہوتے دکھائی دیتا ہے اور اس طرح دو متوازی نظام تعلیم، دو متوازی ذہنی رویے اور دو متوازی انسانی دنیائیں رونما ہوتے نظر آتی ہیں۔ تدریسی رویوں کے ایسے عمل سے قومیت کی تشکیل میں رخنے پڑتے ہیں اور اس نقصان کا سبب لازمی انگریزی کا تدریسی نظام بنتا ہے۔ یہ زبان دونوں طرز کے سکولوں میں برابر لازمی ہے اس لیے استطاعت اور صلاحیت کا فرق قومیت کی تشکیل کے عمل کو نفسیاتی اثرات کا ہدف بھی بنا سکتا ہے اور عموماً بناتا ہے۔ دونوں طرز کے اسکولوں میں انگریزی زبان کے بارے میں نظریۂ افادیت مختلف بھی ہوتا ہے۔ اردو میڈیم اسکول میں انگریزی علمی زبان کے طور پر داخل نصاب ہے لیکن انگلش میڈیم اسکول میں یہ زبان مغربی کلچر کے حوالے سے پڑھائی جاتی ہے۔ دونوں طرز کے سکولوں کے مابین قومی اور تہذیبی تفاوتوں کو برابر محسوس کیا گیا ہے اور کچھ عرصے سے ان تفاوتوں کو دور کرنے کے لیے مناسب تدابیر بھی اختیار کی گئی ہیں۔

انگریزی زبان کے حق میں یہ دلیل بھی عموماً سنی گئی ہے کہ یہ زبان استفادے کی زبان ہے۔ تاہم اس سلسلے میں جس سوال کو پوری طرح سمجھا نہیں گیا یہ ہے کہ یہ زبان کس شے کے استفادے کے لیے ہے؟ انگریزی زبان کی لازمی تدریس میں انگلش میڈیم سکول انگریزی زبان کے تلفظ اور محاورے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح یہ امر ملحوظ نہیں رکھتے کہ معیاری تلفظ اور معیاری روزمرہ کا علاقہ کم از کم فاصلے کے اعتبار سے سات ہزار میل دور ہے اور نسلی اور تہذیبی طور پر اس کی مسافت بھی کئی منزلوں کی ہے۔ علاوہ ازیں انگلش میڈیم سکول یہ بات بھی فراموش کرتے ہیں کہ کوئی بھی غیر ملکی زبان اپنے لسانی ماحول کے بغیر کسی دوسرے تہذیبی منطقے میں اپنی جڑیں نہیں پکڑ سکتی - ان دشواریوں کے نتیجے میں انگلش میڈیم سکول کا تجربہ طلبا کے ذہن کی کشود کی بجائے ان کے ذہن کو تقلید اور سطحی رویوں کی نقل میں بدلتے دکھائی دیتا ہے۔ قومیت کی تشکیل کے عمل میں ایسا تجربہ قومی زندگی کے لیے ضرررساں بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

انگریزی زبان کے بارے میں جن رویوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے انگریزی زبان کی افادیت کے دو نمایاں رجحان بخوبی نظر آسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ عہد حاضر میں

۱۔ انگریزی، علمی زبان ہے

۲۔ بین الاقوامی امور کاروبارکی زبان ہے۔

ان دو رجحانات کے علاوہ ایک تیسرا رجحان بھی نمایاں ہوا ہے کہ

۳۔ انگریزی، بین الاقوامی رابطے کی زبان بھی ہے۔

قومیت کی تشکیل کے عمل میں ان تینوں رجحانات کو ملحوظ نظر رکھنا ضروری ہے کیوں کہ ان تینوں رجحانات کا قومیت کے ساتھ کوئی متصادم رویہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر قومی زبان کو سرکاری، تدریسی اور تہذیبی فرائض کی انجام دہی کے لیے بخوبی استعمال کیا جائے تو مذکورہ بالا تینوں رجحانات کو ایسے انتظامات سے کسی دشواری کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑتا۔ ایسے انتظام کے تحت انگریزی زبان کا درجہ دوسری غیر ملکی زبانوں ہی کے مانند تصور کیا جا سکتا ہے جن کو سیکھا اور کسی بھی زبان کی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں کو اسی طرح پڑھا اور سیکھا گیا ہے۔ مغرب کے بیشتر سکالر اردو، فارسی اور عربی کو اسی طرح سیکھتے اور پڑھتے رہے ہیں اور ان میں نکلسن آرنلڈ، براؤن اور این میری شمل کے نام سرفہرست ہیں۔ قرون وسطیٰ میں جب عربی زبان مہذب دنیا کی علمی زبان تھی، یورپ کے اہل علم نے عربی زبان کو غیر ملکی زبان اور علمی زبان کے طور پر پڑھا اور سیکھا تھا اور اس میں دسترس حاصل کی تھی۔ یہ لسانی کیفیت فوری طور پر انگریزی زبان کو غیر ملکی زبان یعنی فارن زبان کا مقام دیتی ہے اور اس طرح قومیت کی تشکیل کے عمل میں اسے ایک ضروری قومی جہت کے طور پر قبول کرتی ہے۔ قومی زبان اور قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں انگریزی زبان کو ایسا مقام دینا تاریخی تقاضوں کے عین مطابق دکھائی دیتا ہے۔

انگریزی زبان کی حیثیت کے بارے میں کہ کیا یہ زبان غیر ملکی(فارن) زبان ہے یا ہمارے قومی پس منظر میں اس کا مقام ثانوی زبان کا ہے، سردست کوئی واضح نظریہ قائم نہیں ہوا۔ اس مسئلے کی وضاحت کے لیے اور انگریزی زبان کے مقام کے ضمن میں انگلش ٹیچنگ فورم کے رسالے"فورم" کا ایک اقتباس قابل توجہ ہے۔[1] "انگریزی کی بین الاقوامی زبان کے طور پر حیثیت " کا ذکر کرتے ہوئے پیٹر سٹر یونز[2] لکھتا ہے :

> " ایک بین الاقوامی زبان کے طور پر انگریزی کے بارے میں بے شمار مغالطے پیدا ہوئے ہیں۔ جب کہ انگریزی زبان چار مختلف تناظر میں اپنے

---

1. English Teaching Forum : Forum: October Vol 25 No, 4: 1987 (Washington D.C.) P. 56-63.
2. Peter Strevens English as an International Language.

اس کردار کو نمایاں کرتی رہی ہے۔ پہلا تناظر (۱) اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس زبان کو کون لوگ اور کتنے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ دوسرا تناظر وہ ہے (۲) جب کوئی فرد اس زبان کو استعمال کرتا ہے۔ تیسرا تناظر (۳) اس ملک میں انگریزی زبان کا مقام ہے جہاں اسے استعمال کیا جاتا ہے اور چوتھا تناظر(۴) اس زبان کی تعلیم و تدریس کا ہے۔ ......

" پہلا تناظر زبان کو مادری اور غیر مادری زبان کے درجوں میں بدل دیتا ہے۔ تاہم جب سے انگریزی زبان، بین الاقوامی زبان کے طور پر ظاہر ہوئی ہے یہ زبان مادری زبان بولنے والوں ((Native Speakers-NS اور غیر مادری زبان بولنے والوں (Non Native Speakers- NNS) میں بٹ گئی ہے اور غیر مادری زبان (غ م ز.N.N.S) والوں کی تعداد مادری زبان (م ز .N.S) والوں سے بڑھ گئی ہے۔ یوں یہ حقیقت نمایاں ہوئی ہے کہ اس زبان کا اینگلوسیکسن ورثے سے تعلق کم ہوا ہے اور یہ زبان اپنی تاریخ اور جغرافیے سے بے نیاز ہو چکی ہے (صفحہ ۵۷) دنیا بھر میں انگریزی کو م ز کے طور پر بولنے والوں کی تعداد غ م ز کے مقابلے میں محض۲۵ فی صد ہے۔ جہاں تک افراد کا اس زبان کو استعمال کرنے کا تعلق ہے، اس میں غور طلب یہ ہے کہ ماں اور باپ میں ایک کی یا دونوں کی مادری زبان کا تعلق م ز کے گروپ سے ہے یا غ م ز کے گروپ سے۔ اگر والدین میں سے ایک کا تعلق م ز گروپ سے ہے تو افراد کی زبان بھی دو زبانوں کی ہوگی جبکہ ان میں سے ایک زبان انگریزی ہوگی۔ اس لحاظ سے وہ علاقے جن کو غ م ز کے گروپ میں شامل کیا گیا ہے۔ وہاں انگریزی کی حیثیت یا تو فارن (غیر ملکی) زبان کی یا ثانوی زبان کی ہوگی اور زبان کی ایسی حیثیت کے پیش نظر ان علاقوں کے افراد کی زبان کے بارے میں صلاحیت بھی متاثر ہوگی۔

"جو علاقے غ م ز کے گروپ میں شامل ہیں وہاں انگریزی زبان اپنے بین الاقوامی کردار کی بناء پر غیر ملکی (فارن) ہوتی ہے یا ثانوی زبان ہوتی ہے۔ جہاں تک اس زبان کی فارن (غیر ملکی) حیثیت کا تعلق ہے ان ملکوں میں انگریزی کا مقام بھی وہی ہوتا ہے جو دوسری مختلف زبانوں کا ہوا کرتا ہے۔ اسے کوئی خاص منفرد مقام حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن ثانوی زبان کا مقام مختلف ہوتا ہے۔ بعض تاریخی وجوہات کی بناء پر ان علاقوں میں ثانوی زبان (ESL) عدالتوں کی زبان ہوتی ہے،

انتظامی امور کی زبان ہوتی ہے، نظام و تدریس کا ذریعہ تعلیم ہوتی ہے، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور بڑے بڑے اخبار بھی اس زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ -------- لبنان میں اسی طرح فرانسیسی زبان کا درجہ ثانوی زبان کا ہے۔ ------

" ان کوائف کی روشنی میں غ م ز گروپ کے لوگ یا تو انگریزی کو فارن زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں یا اسے ثانوی زبان کی حیثیت میں برتتے ہیں۔ اصل میں ان کی اپنی زبان (LI) ہی ان کی اپنی[۱] زبان ہوتی ہے (صفحہ ۶۰) کوریا میں انگریزی فارن زبان ہے۔ نائجیریا میں ثانوی زبان ہے۔ برازیل میں فارن زبان ہے۔ ہانگ کانگ میں ثانوی زبان ہے۔ چین میں فارن زبان ہے۔ فلپائن میں ثانوی زبان ہے۔ فرانس میں فارن زبان ہے۔ سائپرس میں ثانوی زبان ہے۔ سویڈن میں فارن زبان ہے۔ جبرالٹر میں ثانوی زبان ہے۔ انڈونیشیاء میں فارن زبان ہے اور جزائر فجی میں ثانوی زبان ہے۔ -----

" اس سلسلے میں یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ فارن زبان (EFL) اور ثانوی زبان (ESL) کے لسانی تفاوت کے سبب انگریزی کی بین الاقوامی افادیت (EIL) میں کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ فرق اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب انگریزی زبان کو پڑھانے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ فارن زبان کے علاقوں کے لیے انگریزی مطلقاً اجنبی ہوتی ہے۔ لیکن ثانوی زبان کے علاقوں میں ایسی اجنبیت موجود نہیں ہوتی۔ اس لیے دونوں منطقوں کے افراد کی اس زبان میں صلاحیت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ فارن زبان کے علاقوں کی انگریزی زبان پر ویسی دسترس دکھائی نہیں دیتی جو ثانوی زبان کے علاقوں میں نظر آتی ہے۔ ----

"تاہم اس ضمن میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے جو غ م ز گروپ کے علاقوں میں دکھائی دیتی ہے۔ انگریزی کے بین الاقوامی زبان بننے سے غ م زعلاقوں میں زبان کے اعتبار سے ایک ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہوتی ہے جسے "انا" کی توہین ۲ سے موسوم کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کی مادری زبان انگریزی ہے وہ ان لوگوں کا تمسخر اڑاتے ہیں جو

۱- LI سے مراد قومی زبان ہے۔ م ز سے مراد مادری زبان اور غ م ز سے غیر مادری زبان مراد ہے یہ اصطلاح انگریزی زبان کے ضمن میں ہے۔

2. Ego- Cracking Linguistic insult. (P.60)

انگریزی کو م ز گروپ کے معیار کے مطابق نہ تو بول سکتے ہیں نہ اس میں کامیابی کے ساتھ اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق انگریزی بولنے والے (م ز گروپ) مغرور اور استعمار پسند ہوتے ہیں اور غ م ز گروپ کے افراد کو کمتر مخلوق خیال کرتے ہیں۔ ....."

اس اقتباس کا آخری جملہ جو غ م ز گروپ کے بارے میں ہے دراصل برصغیر کے لسانی رویوں کے ضمن میں ایک ایسے مصنف کے تاثرات پر مبنی ہے جس نے اپنے ایک مطالعے[1] میں اس کیفیت کا ذکر کیا تھا۔ غالباً ایسا رویہ نہ تو سویڈن میں دکھائی دیتا ہے اور نہ فرانس میں جہاں انگریزی زبان فارن زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ م ز گروپ کے نسلی اور استعماری رویے شاید غ م ز کے ان علاقوں ہی میں رونما ہوتے ہیں جہاں انگریزی زبان کا مقام ثانوی (ESL) زبان کا ہے اور تاریخی اعتبار سے ثانوی زبان (ESL) انگریزوں کے اقتدار ہی کی نشاندہی کرتی ہے اور سرکاری زبان کے طور پر آزاد قوموں کے وقار کو مجروح کرتی ہے۔ یہ صورت حال انگریزی زبان کے بارے میں بدلے ہوئے نقطۂ نظر کی جانب اشارا کرتی ہے۔

انگریزی کے حوالے سے پاکستان نے جس لسانی صورت حال کو ورثے میں پایا ہے اس میں انگریزی کا مقام کچھ یوں ہے۔

الف) انگریزی --- لازمی ذریعۂ تعلیم و تدریس

۱۔ ہائی سکول اور اعلیٰ تعلیمی مدارج میں

۲۔ انگلش میڈیم سکولوں میں

۳۔ سول اکیڈمیوں اور فوجی نوعیت کی درس گاہوں میں

ب) سرکاری زبان کے طور پر

۱۔دفاتر اور اونچے درجے کے محکمانہ معاملات میں

۲۔عدالتوں میں (ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں)

۳۔ انڈسٹری میں

۴۔ کاروباری اداروں میں

ج) علمی زبان کے طور پر

۱۔ میڈیکل کالجوں میں

۲۔ انجینئرنگ یونیورسٹیوں میں

---

1. BRAJ KACHRU: Initiations in Communicative Language Teaching : 1984 (Ref: Forum - above)

۳۔ کمپیوٹر سائنس میں
۴۔ اعلیٰ ریسرچ میں
۵۔ فوجی تربیت کے مرکزوں میں
۶۔ بین الاقوامی رابطوں میں

انگریزی زبان کے بارے میں ترجیحات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور مذکورہ بالا کردار کی روشنی میں یہ امر واضح ہوتا ہے کہ انگریزی زبان کی اس زمانے میں اہمیت صرف اس بات میں ہے کہ اس زبان کی مدد سے سائنس اور ٹیکنالوجی تک پہنچا جا سکتا ہے اور ان سے استفادہ ممکن ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کا جاننا صرف اس ضرورت کے تحت ہے کیوں کہ اس زبان کے بغیر عہد حاضر کے ان علوم تک رسائی ممکن نہیں ہوسکتی۔ انگریزی زبان کا کردار محض وسیلہ فراہم کرتا ہے اور یوں یہ زبان اپنے مقصد کے تحت وسیلے کی زبان بنتی ہے اور اگر یہ زبان "وسیلے" کی زبان ہے اور اس کا مقصد سائنس اور ٹیکنالوجی تک دسترس پانا ہے تو بعض روایتی ضرورتیں جن کے لیے یہ زبان استعمال میں رہی ہے اپنی افادیت کھو دیتی ہیں۔ مملکت کے اندر سرکاری زبان کا کردار کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اس کا جواز ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر قائم رکھنا غیر منطقی اور غیر عقلی نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ انگلش میڈیم سکولوں کی ایسی تربیت کو جو انگریزی کو مغربی کلچر کا وسیلہ گردانتی ہے کسی طرح قابل اعتناء تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس سلسلے میں بین الاقوامی رابطے کا کردار انگریزی کے بارے میں نئی ترجیحات کو نمایاں کرتا ہے جس میں انگریزی زبان کے بارے میں اعلیٰ مہارت، انگریزی بولنے والی قوموں کے کلچر کا گہرا مطالعہ اور علم اور انگریزی زبان میں گفتگو کرتے وقت اس زبان پر بخوبی عبور اور دسترس ----- یہ ترجیحات بین الاقوامی رابطے اور معاملات کے لیے کم از کم عصر حاضر کی دنیا میں بے حد ضروری ہیں۔ مملکت کی مختلف حکمت عملیوں میں ان ترجیحات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح عالم اسلام کے ورثے کا ایک بہت بڑا حصہ عہد حاضر میں مغربی زبانوں میں محفوظ ہے۔ اس ورثے کے بغیر عالم اسلام کا مستقبل صورت پذیر نہیں ہوسکتا اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سفر بھی اپنے لیے مناسب مواد حاصل نہیں کر سکتا۔ انگریزی زبان میں مہارت اس ضمن میں بھی اہم ہے۔ اس لیے اس زبان کی ترجیحات میں اس پہلو کا شامل کرنا بھی ضروری ہے۔ اس اعتبار سے جو ترجیحات قائم ہوتی ہیں ان میں انگریزی زبان کی تحصیل و تدریس کا عمل لازمی قرار پاتا ہے۔

جن ترجیحات کا ذکر کیا گیا ہے ان کو مختلف ملکوں میں (کم یا زیادہ)

انگریزی کو فارن زبان (FEL) کا مقام دے کر حاصل کیا گیا ہے۔ پاکستان میں انگریزی کی حیثیت مختلف ہے؟ گو زمانے کی ترجیحات میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ پاکستان میں انگریزی لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے اور یہ تدریسی روایت ڈیڑھ سو برس پرانی ہے۔ اس روایت کی موجودگی میں انگریزی ہمارے تمدن میں اجنبی نہیں ہے۔ ہمارے ادب اور معاشرے پر بھی اس زبان کے ادب کی گہری چھاپ ہے۔ آبادی کی ایک بڑی تعداد اس زبان کے حروف سے ناآشنا نہیں ہے اور انگریزی زبان کے بے شمار الفاظ ہماری زبان کا حصہ بھی بن چکے ہیں۔ ۱۸۳۰ء میں جب انگریزی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں رائج کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا، اس زمانے میں کمپنی حکمران ادارے کے طور پر ظاہر ہوئی تھی اور اسے اپنے نظم و نسق کے لیے افراد کی ضرورت تھی جو کمپنی کے دفاتر میں بخوبی کام کرسکتے۔ ۱۸۳۰ء سے پہلے برصغیر کے ان علاقوں کی سرکاری زبان فارسی تھی اور کمپنی کے اعلیٰ عہدہ داروں کے لیے اس زبان کا سیکھنا ضروری تھا۔ زباندانی کا ایسا عمل انگریزوں کے لیے دشوار تھا اور نئے انتظام کے تحت برطانیہ سے بڑی تعداد میں دفتری عملے کی درآمد مہنگی بھی تھی اور آسان بھی نہیں تھی۔ اس لیے کمپنی نے اپنے سکولوں میں انگریزی کو لازمی مضمون کے طور پر رائج کیا اور اپنی سہولت کے پیش نظر برصغیر کی سرکاری اور دفتری زبان کے طور پر (ایک خاص سطح کے بعد)انگریزی کو رائج کیا۔ یوں انگریزی زبان سرکاری زبان کے طور پر ظاہر ہوئی۔ اس ضمن میں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ آزادی سے قبل فیصلہ کرنے والی ایجنسی کے افراد انگریز تھے اس لیے سرکاری زبان انگریزی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد نظم و نسق اور کاروبار مملکت کے ادارے جن افراد کے ذریعے کام کرتے ہیں وہ نسلی طور پر نہ تو غیر ملکی اور انگریز ہیں اور نہ انگریزی ہی ان کے گھرانوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس لیے انگریزی کا سرکاری زبان کے طور پر برقرار رہنا مناسب دکھائی نہیں دیتا۔

کچھ دیر پہلے ایک اقتباس میں اس بات کا ذکر سامنے آیا تھا کہ انگریزی صرف ان حالات ہی میں ثانوی زبان کا کردار ادا کرتی ہے جب کسی ملک کی سرکاری زبان انگریزی ہو۔ یہ لسانی رشتہ جو تمدنی رشتے میں بھی بدلتا ہے کچھ تو اس امر کی جانب اشارا کرتا ہے کہ انگریزی کو ثانوی زبان کے طور پر پڑھنے سے سرکاری محکموں میں ملازمت مل سکتی ہے اور کچھ اس طرف اشارا کرتا ہے کہ دفاتر کا نظام انگریزی کے بغیر شاید احسن طریقے سے چل نہیں سکتا۔ سرکاری زبان کا ایسا منظر قابل غور ہے۔ یہ اس لیے کہ اگر دفاتر میں وہ لوگ یکسر موجود نہیں ہیں جو نسلی اعتبار سے جزائر برطانیہ کے باشندے ہوں تو

انگریزی زبان کا وسیلہ کس مقصد کے لیے ضروری ہے؟ ظاہر ہے کہ قیام پاکستان کے بعد دفاتر کے تمام تر عہدے ان کے پاس ہیں جو انگریزی کے علاوہ قومی زبان بھی سمجھتے ہیں۔ اس لیے انگریزی کا سرکاری زبان کے طور پر برقرار رہنا دفاتر کے طریق کار ہی کا نتیجہ دکھائی دیتا ہے۔ دفاتر کے طریق کار نے انگریزی کو سرکاری زبان کا مقام دے رکھا ہے اور یوں کسی بہت بڑی مشین کی طرح جس پر انسانی عادت انحصار کر چکی ہو دفاتر کے طریق کار میں سے انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر منہا کرنا بے حد دشوار دکھائی دیتا ہے۔ تاہم طریق کار اور انسانی عادت، سرشت انسان کے ایسے پہلو ہیں جو حادث ہیں اور جن کو بخوبی بدلا جا سکتا ہے۔

اس جائزے سے دو باتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ انگریزی صرف وہاں غیر ملکی زبان کا مقام رکھتی ہے جہاں قومی زبان کا مرتبہ سرکاری زبان کا ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ انگریزی کو ثانوی زبان کے طور پر ایسے حالات میں قبول کیا جاتا ہے جہاں انگریزی زبان اس ملک کی سرکاری زبان ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو یوں بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے:
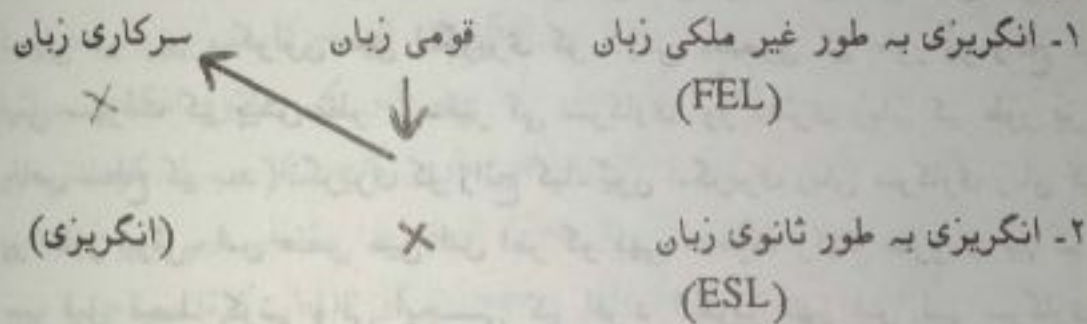
[اگر قومی زبان سرکاری زبان ہے تو انگریزی فارن زبان ہے اور اگر انگریزی سرکاری زبان ہے تو انگریزی کا مقام ثانوی زبان کا ہے]

قومی زبان کو سرکاری زبان کا مقام دینا دراصل قومیت کی تشکیل کے عمل کا بنیادی تقاضہ ہے۔ ہماری قومی زبان ایسے فرائض کی انجام دہی کے لیے ان صلاحیتوں سے عاری بھی نہیں ہے جو سرکاری زبان کے لیے ضروری ہوا کرتی ہیں۔ بادی النظر میں ایسا کرنا بے حد آسان ہے۔ لیکن قومی زبان کو سرکاری زبان بنانے کے بعد انگریزی زبان کا مقام بھی یکسر بدل جاتا ہے اور یہ زبان ڈیڑھ دو سو برس کے فوراً بعد غیر ملکی (فارن) زبان بن جاتی ہے اور غیر ملکی زبان (FEL) بنتے ہی نظام تعلیم و تدریس میں اس کا مقام بھی بدل جاتا ہے۔ ایسی صورت کے پیدا ہوتے ہی انگریزی زبان جو لازمی زبان[1] (ECL) کے طور پر نظام تعلیم کا حصہ

1. English As Compulsory Language.

رہی ہے اپنے اس روایتی مقام کے بارے میں جواز سے محروم ہو جاتی ہے اور یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا انگریزی کو لازمی زبان (ECL) کے طور پر برقرار رکھا جائے اور سرکاری زبان کو بدل دیا جائے اور اگر سرکاری زبان کو بدلنا ہی مقصود ہے تو پھر انگریزی زبان کے لازمی ہونے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟

پرانی ترجیحات میں انگریزی کا لازمی مضمون ہونا اس زبان کے سرکاری زبان بننے اور برقرار رہنے کے لیے ضروری تھا۔ لازمی انگریزی، سرکاری زبان کے فرائض کی انجام دہی کے لیے ضروری تھی۔ تاہم پرانی ترجیحات میں انگریزی کا لازمی ہونا محض سرکاری زبان ہی کے ساتھ منسوب نہ تھا۔ بلکہ یہ زبان علمی زبان کے طور پر بھی نصاب تعلیم میں شامل کی گئی تھی۔ اس لیے جب سرکاری زبان کے بدلنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو ایسے عمل کے ساتھ انگریزی کے علمی زبان ہونے کا مقام کسی طرح متاثر نہیں ہوتا۔ البتہ یہ سوال ضرور اٹھتے ہیں کہ انگریزی زبان کا علمی زبان کے طور پر برقرار رکھنے کے لیے کیا اسے فارن زبان (EFL) کے طور پر قبول کیا جائے یا اسے ثانوی زبان (ESL) کا درجہ دیا جائے ؟ اور کیا ان دونوں طریقوں کے ذریعے انگریزی زبان، علمی زبان کے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتی؟ اور اگر یہی دو طریقے کارآمد ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی کامیابی کے ساتھ اپنایا جا سکتا ہے تو پھر لازمی زبان کے طور پر ہی اس زبان کو کیوں نظام تعلیم میں برقرار رکھا جائے؟ تاہم لازمی زبان کے مقام کو موقوف کرنے سے ایک طویل تدریسی روایت کا سلسلہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ کیا ایسی روایت کا توڑ دینا کسی طرح مستحسن بھی ہے ؟ اور کیا ایسے عمل کو جائز بھی گردانا جا سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ قومیت کی تشکیل کے لیے ماضی میں قائم ہونے والی روایات کو توڑنا غالباً مناسب نہیں ہے خواہ یہ روایات کسی بھی تاریخی ضرورت کے تحت پیدا ہوئی ہوں۔ لازمی انگریزی کی تدریسی روایت بھی ایسی ہی روایات میں شامل ہے۔ سرکاری زبان کو قومی زبان میں بدل دینے سے انگریزی زبان کا دائرہ کار بھی بدل جاتا ہے اور یہ زبان علمی زبان کے طور پر اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ آشکار ہوتی ہے۔ اس لیے تبدیلی کے ایسے عمل کے ساتھ یہ کیفیت بھی رونما ہوتی ہےکہ کیا اسے (ESL) فارن زبان کا درجہ دے کر شامل نصاب کیا جائے یا ثانوی زبان (ESL) کے طور پر اسے تدریسی نظام میں شریک کیا جائے ؟

اس ضمن میں یہ امر غور طلب ہے کہ غیر ملکی زبان کے طور پر انگریزی زبان کا ایک مخصوص طریق کار ہے اور اس کی میتھڈالوجی الگ ہے۔ یہی کیفیت انگریزی زبان کو ثانوی زبان کے طور پر پڑھانے کی ہے۔ ثانوی زبان کی تدریس کا

اپنا الگ طریقہ ہے۔ برصغیر میں لازمی انگریزی (ECL)دراصل ثانوی زبان (ESL) کے طور پر پڑھائی گئی تھی اور ایسے ہی مقام کی حامل رہی تھی تاہم طویل تدریسی روایت کے دوران لازمی انگریزی زبان کی تدریس میں سے ثانوی زبان کے پہلو منہا ہوتے چلے گئے تھے اور یہ زبان بنیادی زبان (PRIMARY LANGUAGE) کے طور پر بروئے کار آتی رہی تھی۔ موجودہ زمانے میں انگلش میڈیم سکول اسے بنیادی زبان ہی کی حیثیت میں پڑھانے کا اہتمام کرتے ہیں۔

اسی سلسلے میں ایک اور امر بھی قابل توجہ ہے۔ لازمی زبان کی روایت کو ثانوی اور غیر ملکی زبان کی جدید تکنیک اور متھیڈالوجی کی مدد سے اور زیادہ موثر بنانا ہماری قومیت کی تشکیل کے لیے ضروری ہو چکا ہے۔ قومیت کے متعدد مقاصد کا واضح رشتہ ذہن کی نشوونما کے ساتھ بھی ہے۔ ایک طویل عرصے سے لازمی انگریزی اس ضرورت کو پورا کرتی رہی ہے۔ اس لیے قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں اور اس کے ساتھ وابستہ مقاصد کی روشنی میں دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ سرکاری زبان کے طور پر انگریزی کے مقام کو بدلا جا سکتا ہے اور قومی زبان کو سرکاری زبان کا مقام دیا جانا ممکن ہے اور دوسری یہ کہ علمی تقاضوں کے پیش نظر لازمی انگریزی (ECL) کا نصاب تعلیم میں برابر موجود رہنا ضروری ہے۔

۱۵۔ ذریعۂ تعلیم : انگریزی یا اردو
... علاقائی زبان بہ طور ثانوی زبان

۱۸۳۵ء میں ذریعۂ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے لارڈ میکالے نے جو نئی تعلیمی پالیسی کا اصل محرک تھا اس امر کی طرف اشارا کیا تھا کہ اگر ذریعۂ تعلیم کے طور پر مقامی زبانوں (ورنیکلر زبانوں) کو استعمال کیا جائے تو وہی مقصد پورا ہوگا جو انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر رائج کرنے سے حاصل کیا گیا ہے۔۱ میکالے کی رائے کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہےکہ ذریعۂ تعلیم محض ایک اضافی طریق کار ہے اور اسے کسی طرح مطلق اور قائم بالذات تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ذریعۂ تعلیم ایک طویل مدت کے بعد تدریسی اور ذہنی عادات کو مستحکم کرتے ہوئے تمدن میں اپنا نہایت مؤثر مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور اسے بدلنا تمدن کے بے شمار رجحانات اور رویوں کو متاثر کرتا ہے۔ کچھ یہی معاملہ انگریزی زبان کا ہے اور ایسے ہی مسائل اس زبان کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی حیثیت سے نمایاں ہوتے رہے ہیں اور برابر نمایاں ہو رہے ہیں۔ ۱۸۳۵ء میں جب اس زبان کو رائج کیا گیا تھا تو سارے برصغیر میں اس زبان کو جاننے والا سوائے دس بارہ ہندو بنگالیوں کے اور کوئی نہ تھا۔ یعنی انگریزی کو ایک ایسے زمانے میں ذریعۂ تعلیم کے طور پر نافذ کیا گیا تھا جب برصغیر میں اس کے ابلاغ کی شرح صفر تھی۔ سائنس کی اپنی حیثیت یورپ کے ممالک میں ابھی ابتدائی مراحل میں تھی اور فزکس اور کیمسٹری ہی کے میدان میں کام جاری تھا۔ ریلوے انجن، ٹیلی گراف اور دُخانی، جہاز، فن آہن گری کے سائنسی نتائج کی صورت میں ظاہر ہو چکے تھے تاہم میکالے کو یقین تھا کہ انگریزی زبان کی مدد سے یہ علوم اور ہنر بھی بوصغیر کے باشندوں کی دسترس میں آ سکیں گے لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ علوم اور ہنر تو غالباً میسر نہ آسکے البتہ برطانیہ کو برصغیر میں ایک وسیع و عریض تجارتی منڈی ضرور دستیاب ہوئی۔ کچھ یہی صورت انگریزی زبان اور ذریعۂ تعلیم کے بارے میں تھی۔ انگریزی زبان کے نفاذ سے قبل مغربی علوم کو مشرقی زبانوں میں منتقل کرنے کی پالیسی رائج تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اپنا

---

۱. تفصیل کے لیے دیکھیے "انگریزی زبان و ادب کی تدریس میں قومی زبان کا کردار" جیلانی کامران ۱۹۸۵ء

خیال بھی یہی تھا کہ مغربی علوم کو مشرقی زبانوں میں بیان کرکے لوگوں کو نئے زمانے کی روشنی سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے تعلیمی نظام کی موجودگی میں صرف وہی انگریز اس نظام کو چلا سکتے تھے جو مشرقی زبانوں پر عبور رکھتے تھے لیکن ایسے انگریزوں کی تعداد بے حد کم تھی۔ یوں برصغیر میں مشرقی علوم کے جاننے والوں کی اجارہ داری قائم تھی اور ان کو مالی مواقع بھی حاصل تھے۔ مشہور انگریز مصنف ڈاکٹر جانسن نے بھی اپنے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت ملازمت کی خواہش ظاہر کی تھی، مگر مشرقی زبانوں سے نابلد ہونے کی بناء پر اسے ملازمت نہ مل سکی۔ اس نے اپنے غصے کا اظہار اس معروف جملے میں کیا کہ جو انگریز، کسی غیر زبان کو روانی سے بول سکتا ہے اس کی حب الوطنی بھی شک و شبے سے بالاتر نہیں ہوسکتی۔ تاہم جس زمانے کاذکر کیا گیا ہے وہ زمانہ برطانیہ میں بے روزگاری کا تھا۔ انقلاب فرانس کے بعد اور نپولین کے ساتھ جنگوں کے نتیجے میں بے روزگاری ایک نہایت شدید معاشرتی مسئلہ بن چکی تھی۔ ۱۸۲۶ء میں برطانیہ کے عوام پر فائرنگ کی گئی کہ وہ قحط اور بھوک کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ ایسے پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ انگریزی کو کیوں لازمی مضمون کے طور پر نافذ کیا گیا تھااور کیوں ذریعۂ تعلیم بھی اسی زبان ہی کو بنایا گیا تھا۔ ایسے اقدام نے برطانیہ میں بے روزگاری کے مسئلے کو اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والے انگریزوں کے لیے حل کر دیا تھا اور ان کے لیے ملازمتوں کے بے شمار مواقع پیدا ہوئے تھے۔ اگر کسی طرح انیسویں صدی کے دوران انگریز اساتذہ کی تعداد کے اعداد و شمار حاصل ہو سکیں تو نہ صرف انگریزی کے نفاذ اور اس کے ذریعۂ تعلیم بننے کے اقتصادی محرکات آشکار ہو سکتے ہیں بلکہ یہ بھی بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں لازمی انگریزی اور ذریعۂ تعلیم کو بنیادی طور پر برطانیہ میں بے روز گاری ہی کو دور کرنے کے لیے رائج کیا گیا تھا۔

اگر اس کیفیت کو انسانی نفسیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات بھی ظاہر ہوگی کہ ایک ایسے استاد کے لیے جو نسلی اعتبار سے برطانیہ کا باشندہ ہے انگریزی مادری زبان کے طور پر دستیاب ہوتی ہے۔ اسے اس زبان کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی رشتے قائم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ اس زبان کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اپنانے سے اسے کسی مصنوعی عمل سے گزرنا بھی نہیں پڑتا۔ لیکن ایسے استاد کے مقابلے میں برصغیر کی جن بے شمار نسلوں کو ایک مصنوعی عمل سے گزرنا پڑا اور اس عمل کے نتیجے میں ان کی جتنی توانائی صرف ہوئی ہے اس کو مثبت مقاصد کی ذیل میں کسی طرح شمار نہیں کیا جا سکتا۔ برطانیہ میں

انگریزی بولنے والا ہر شخص کسی ترجیحی سلوک کا مستحق نہیں ہوتا لیکن برصغیر کے کلچر میں اور قیام پاکستان کے بعد انگریزی کا جاننا فخر اور مرتبے اور ترجیحی مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔ برطانیہ میں انگریزی کا جاننا ایک جمہوری عمل ہے اور انسانی استعداد کی علامت ہے۔ لیکن ہمارے تمدن میں انگریزی کا جاننا غیر جمہوری اور طبقاتی ہے اور ایک مصنوعی اور غیر قدرتی (اکتسابی) استعداد کی علامت ہے۔ انگریزی زبان کے ساتھ مواقع اور ملازمتوں کا حصول ایسے طبقاتی تفاوت کو مستحکم کرتا ہے اور حکمران طبقے اور عام لوگوں کے مابین فاصلے اور مسافت میں اضافہ کرتا ہے۔ ہمارے تمدن میں بدقسمتی سے انگریزی زبان اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ منصب اور اونچے طبقے کا نشان بن چکی ہے۔ قومیت کی تشکیل میں انسانی نفسیات کے ان پہلوؤں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں ذریعۂ تعلیم کی اہمیت مرکزی ہے اور کسی ایسی زبان کو ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا جا سکتا جو محض ایک علمی زبان ہو یا جس کا مقام اکتسابی ہو یا جو کسی طرح ایک ایسے کلچر کی زبان ہو جو اس ملک سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو جہاں اس زبان کو ذریعۂ تعلیم بننے کی ذمہ داری سونپی گئی ہو۔ انگریزی زبان کے ذریعۂ تعلیم بننے کی بنیادی وجہ اوپر بیان کی گئی ہے۔ اس زبان کو ذریعۂ تعلیم کے فرائض اس لیے بھی سونپے گئے تھے کہ یہ زبان انگریز قوم کے لیے ایک بڑی سہولت تھی۔ اس لیے جب قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے ذریعۂ تعلیم کو بدلنےکا مسئلہ سامنے آتا ہے تو ایسے سوال اٹھائے جاتے ہیں جن کا تعلق علمی زبان سے ہوتا ہے اور ذریعۂ تعلیم سے جن کی کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ دنیا کے مہذب ملکوں میں ذریعۂ تعلیم ان ملکوں کی قومی زبان ہے۔ اس لیے اس مسئلے کے حل کے لیے اصولوں کو مصلحتوں پر قربان کرنا کسی طرح جائز دکھائی نہیں دیتا۔

برصغیر میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کی روایت پرانی ہے۔ ابتدا میں سکولوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم کی درس گاہوں تک انگریزی ہی ذریعۂ تعلیم تھی۔ لیکن سرکاری سکولوں میں ابتدائی تعلیم مقامی زبانوں میں دی جاتی تھی۔ پنجاب اور کشمیر میں ابتدائی جماعتوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہوا کرتی تھی۔ انگریزی کی تعلیم ۹ برس کی عمر سے شروع ہوتی تھی۔ آٹھویں جماعت تک یعنی ۱۳ برس کی عمر تک ذریعۂ تعلیم برابر اردو زبان تھی۔ البتہ میٹرک کے درجے میں ذریعۂ تعلیم بدل جاتا تھا۔ یہاں تک کہ تاریخ اور جغرافیے میں امتحانی سوال انگریزی میں پوچھے جاتےتھے لیکن ان کے جوابات کے لیے کوئی پابندی نہ تھی۔ انگریزی سوالوں کے کم

از کم اس مضموں میں جوابات اردو میں دیے جا سکتے تھے۔ سائنس اور ریاضی، الجبرا اور جیومیٹری کا ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ امتحاں میں سوال بھی انگریزی میں پوچھے جاتے تھے اور جوابات بھی انگریزی ہی میں دیے جاتے تھے۔ میٹریکولیشن کے بعد اعلیٰ تعلیم کے سارے مضامین کا ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ امتحاں میں سوالات بھی انگریزی ہی میں پوچھے جاتے تھے اور جوابات بھی انگریزی ہی میں تحریر کیے جاتے تھے۔

ذریعہ تعلیم کے اس سارے تدریسی عمل میں انگریزی زباں دو مختلف راستوں سے تدریس و تعلیم میں شریک ہوتی تھی۔ ایک لازمی مضموں کی حیثیت میں اور دوسرے کلاس روم میں تدریسی عمل کے دوراں ذریعہ تعلیم کے طور پر۔ اس دوہرے عمل کو امتحانی نظام اور انگریزی میں جوابات تحریر کرنے کی پابندی مزید پائدار اور مستحکم کرتی تھی۔ اس پورے نظام تدریس کو دیکھنے سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اس تدریسی عمل میں انگریزی زباں، اپنا تمام کردار علمی زباں کے طور پر ادا کرتی تھی۔

اگر اس سارے منظر کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پوچھا جائے کہ ذریعہ تعلیم کی بنیادی طور پر افادیت کیا ہے؟ تو غالباً یہی ایک جواب ظاہر ہوگا کہ ذریعہ تعلیم کی مدد سے طالب علم، استاد کی وساطت سے معلومات وصول کرتا ہے اور علم کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ تاہم ذریعہ تعلیم الفاظ کی مدد سے طالب علم کو معلومات فراہم کرتا ہے اور الفاظ کا مقصد غالباً یہی نہیں ہے کہ ان کو ازبر کر لیا جائے اور ضرورت آنے پر ان کو تحریری جواب کی صورت میں امتحانات کے وقت لکھ دیا جائے۔ اگر الفاظ ہی کی منتقلی کا نام حصول علم ہوتا تو شاید دنیا میں ایجاد اور دریافت کی منزلیں ظاہر نہ ہوتیں۔ اس لیے جو بات محل نظر دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ذریعہ تعلیم طالب علم کے ذہن پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے وہ اس لیے کہ ایسے ہی رشتے سے ذریعہ تعلیم کی افادیت رونما ہوتی ہے۔

ذریعہ تعلیم کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے کہ اسے بدل دینے سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا تک رسائی متاثر ہوگی اور ہمارا تعلق جدید دنیا کے سائنسی علوم سے منقطع ہو جائے گا۔ ایسا خدشہ بجا طور پر تشویش ناک ہے تاہم اگر اسی ضمن میں یہ سوال کیا جائے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے انگریزی زباں کے ذریعہ تعلیم کے طور پر موجود رہنے سے سائنسی علوم کے بارے میں کیا مثبت نتائج پیدا ہوتے رہے ہیں یا ہوئے ہیں؟ تو ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں صورت حال واضح ہوسکے گی۔ کیا ان ڈیڑھ سو برسوں کے دوران ہمارے تمدن میں سائنسی ذہن رونما ہوا ہے؟ کیا ہمارے کلچر کی فضا میں سائنسی علوم اور

سائنسی تصورات کی جہتیں ظاہر ہوتی ہیں؟ کیا ہمارے علمی اداروں نے سائنس کی ریسرچ میں کوئی مقام پایا ہے؟ اور کیا ایجاد اور دریافت کی منزلیں بھی دکھائی دتا ہیں؟ یہ سوال بنیادی نوعیت کے ہیں اور ان کا تعلق یقیناً ذریعۂ تعلیم (انگریزی) کے ساتھ براہ راست بھی ہے۔ ڈیڑھ سو برس کی علمی روایت کچھ کم با اثر نہیں ہوتی اور ذہن کی تشکیل پر بہت گہرا اثر مرتب کرتی ہے۔ اس ضمن میں ذریعۂ تعلیم کے علاوہ دوسری سہولتوں کی کمیابی بھی یقیناً مانع دکھائی دیتی ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ جب ذہن کسی علم کے باعث کھلتا ہے اور اس کی تخلیقی قوتیں بیدار ہوتی ہیں تو سہولتوں کے سلیقے بھی میسر آ سکتے ہیں۔ سائنس کی تعلیم جو گزشتہ کئی برسوں سے انگریزی زبان کی وساطت سے دستیاب ہوتی رہی تھی اور جس کا مزاج اب بھی وہی ہے شاید ذہن کے ساتھ طبعی اور قدرتی رشتہ اس لیے قائم نہیں کرسکی کہ ذریعۂ تعلیم مصنوعی تھا (اور برابر مصنوعی ہے)۔ اس سلسلے میں انگلستان کی سائنسی ترقی کی روداد کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ قرون وسطیٰ (۱۱۰۰ء۔ ۱۴۸۵ء) کے دوران انگلستان کی علمی زبان لاطینی تھی اور ذریعۂ تعلیم بھی لاطینی تھا۔ اس کے باوجود کہ لاطینی کی بے حد قدر و منزلت تھی اور اس زمانے کے اہل عرب کے سائنسی علوم بھی لاطینی تراجم میں دستیاب تھے۔ انگلستان میں ایجاد اور دریافت کی کوئی منزل دکھائی نہیں دیتی۔ ان کا ذہن تقلیدی اور نظر کوتاہ بین تھی۔ لیکن جب انگریزی زبان کو علمی زبان اور ذریعۂ تعلیم کا مقام دیا گیا اور ۱۶۶۶ء میں رائل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تو انگلستان کی ذہنی فتوحات کا ایک نیا دور شروع ہوا اور سائنس نے ایک نئی دنیا کو پیدا کیا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سترہویں صدی کے انگریز سائنسدان سائنسی علوم کو حاصل تو لاطینی سے کرتے تھے لیکن اپنے مشاہدات کو انگریزی میں قلمبند کرتے تھے۔ ترجمے کا عمل اس سلسلے میں کسی رابطے کی نشاندہی نہیں کرتا تھا۔ یہ صورت دو زبانوں کی صورت تھی۔ لاطینی اور انگریزی۔ سائنسدان دونوں زبانوں سے یکساں لگاؤ رکھتے تھے لیکن اپنے سائنسی مسائل کو انگریزی میں قلمبند کرنےکو ترجیح دیتے تھے۔ ہمارے تمدن میں اور قومیت کے مقاصد کی پیروی میں قومی زبان کے بارے میں ایسا علمی ترجیحی رویہ بہت کم دکھائی دیتا رہا ہے۔

تاہم سائنسی علوم کے بارےمیں ذریعۂ تعلیم (انگریزی) پر جس قدر اصرار دکھائی دیتا ہے حقیقت میں ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی کیوں کہ سکول سے لے کر اعلیٰ تعلیمی مدارج تک ذریعۂ تعلیم کلیتاً انگریزی بھی نہیں ہے۔ قومی زبان بھی عموماً مددگار زبان کے طور پر بروئے کار آتے دکھائی دیتی ہے۔ تشریح،

وضاحت، استدلال، مسائل، رابطے، سوالات کی گرہیں اور ایسی بے شمار دوسری کیفیات کے دوران ذریعۂ تعلیم میں لچک نظر آتی ہے اور مسائل کی درست تفہیم کے لیے قومی زبان کی مدد بھی حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن یہ صورت حال دو مختلف نوع کی زبانوں کو نمایاں کرتی ہے۔ ایک نوع اس انگریزی زبان کی ہے جو جملے ترتیب دیتی ہے اور بیانیہ معانی کی ترسیل کرتی ہے اور دوسری نوع اس انگریزی زبان کی ہے جو متعلقہ سائنس کی خصوصی معلومات کو بیان کرتی ہے اور اصطلاحوں کی وساطت سے معانی تک رہنمائی کرتی ہے۔ پہلی نوع کو ذریعۂ تعلیم کہا جا سکتا ہے اور دوسری نوع کو سائنسی زبان کے ساتھ موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح جو صورت بنتی ہے یہ ہے:

۱۔ ذریعۂ تعلیم کی زبان

۲۔ سائنسی زبان جو اصطلاحوں کے ذریعے معانی فراہم کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ذریعۂ تعلیم جو موضوع تک رسائی کا سبب بنتا ہے کسی بھی زبان کو اختیار کر سکتا ہے کیوں کہ اس کا کام محض جملے بنانا، جملوں کو مربوط کرنا اور موضوع کے لیے ماحول تعمیر کرنے کا ہوا کرتا ہے۔ زبان کے اس پہلو کو سائنس کے کسی بھی ڈسپلن میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جملے سازی کے لیے انگریزی زبان کی اجارہ داری کسی طرح معقول دکھائی نہیں دیتی۔ کہ محض اس ایک فرض کے لیے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر برقرار رکھا جائے۔ چونکہ بیانیہ جملے سائنس نہیں ہوتے اور نہ ان جملوں کی مدد سے سائنس کی دنیا آشکار ہوتی ہے، سائنس صرف اس مقام سے ابتدا کرتی ہےجہاں اس کی اصطلاحی زبان بروئے کار آتی ہے اور اس زبان (اصلاحوں کی زبان) کو انگریزی زبان نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ یہ زبان سائنس کی علامتی زبان ہوتی ہے۔ علامتوں کو کسی دوسری زبان میں بدلناعلامتوں کے معانی کو تلف کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس لیے سائنس کی زبان کو ذریعۂ تعلیم کی شق میں شامل نہیں کیا جا سکتا اور چونکہ سائنس کی زبان ذریعۂ تعلیم میں شمار نہیں کی جا سکتی اس لیے اس کا بدلنا بھی کسی طرح ضروری اور جائز دکھائی نہیں دیتا۔ صرف ذریعۂ تعلیم کو بدلا جا سکتا ہے۔

ذریعۂ تعلیم کو بدلنے کی راہ میں کہ انگریزی کی بجائے اردو (قومی زبان) کو ایسی ذمہ داری سونپی جائے، سب سے بڑی رکاوٹ سائنسی مضامین کی تدریس کے بارے میں سامنے آتی ہے۔ ایسی دشواری صرف سائنسی علوم ہی کے ساتھ منسوب نہیں ہے بلکہ جدید علوم کی تمام تر شاخیں ایسی ہی دشواری کو نمایاں کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں بعض تاریخی حقائق کو شاید نظر انداز کیا گیا ہے جس کی

پیدا ہو ذریعۂ تعلیم کے ضمن میں الجھنیں پیدا ہوئی ہیں۔ برصغیر میں مغربی تعلیم
کے ساتھ جدید علوم کی ایک طویل فہرست تدریسی اور تعلیمی نصاب میں شامل
ہوئی تھی۔ مغربی تعلیم سے پہلے ہمارے مدرسوں اور دارالعلوم کی تعلیم کے نصاب
میں ایسے مضامین موجود نہیں تھے۔ اگر بعض صورتوں میں یہ مضامین موجود بھی
تھے، مثلاً اخلاقیات اور طب اور جغرافیہ (اور اس نوع کے دیگر مضامین) لیکن ان
میدانوں میں مغربی علوم نے مزید دریافتوں کو شریک کیا تھا اور نئے نئے مسائل
کا اضافہ کیا تھا۔ اس لیے نئے علوم کی متبادل اصطلاحات مشرقی نصاب تعلیم میں
موجود نہ تھیں۔ اسی لیے نئی اصطلاحات کو وضع کیے بغیر جدید علوم کو مشرقی
تدریسی روایت میں شامل کرنا دشوار تھا۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق نئی اصطلاحات
کو وضع کرنے کا رویہ نمایاں ہوا تاکہ اگر ذریعۂ تعلیم کو انگریزی کی بجائے قومی
زبان میں بدل دیا جائے تو اصطلاحات کی دشواری مانع نہ ہو اور تدریسی ابلاغ کا
خاطر خواہ انتظام موجود ہو۔

تاہم جہاں تک جدید علوم کی اصطلاحات اور ان علوم کی خصوصی زبان کا
تعلق ہے، اہل یورپ نے ان علوم کو سترہویں صدی میں اپنے نصاب تعلیم میں شامل
کیا تھا۔ اس طرح ایک مشترکہ علمی سرمائے کی بنیاد رکھی تھی جس میں مغربی
یورپ کے ممالک پیش پیش تھے۔ یوں اصطلاحات اور جدید علوم کی خصوصی زبان
کا ایک مشترکہ ذخیرہ ترتیب پایا جو مغربی یورپ کے تمام ملکوں میں مقبول ہوا
اور جسے اعلیٰ تعلیم کی درس گاہوں میں مستند مقام حاصل ہوا۔ اس سلسلے میں
یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اہل یورپ نے جدید علوم کی اصطلاحوں کے لیے یونانی
اور لاطینی زبانوں سے استفادہ کیا تھا اور ان کی اصطلاحیں انہی زبانوں سے اخذ
کی گئی تھیں۔ ------ اسی ضمن میں انگریزی زبان کی وسعت میں بھی اضافہ ہوا
اور یورپ کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں انگریزی زبان کی سائنسی لفظیات کا
حلقہ پھیلتا گیا۔ انگریزی زبان نے دنیا کی ہر زبان سے الفاظ مستعار لیے اور انہیں
اپنی لفظیات میں برابر کا درجہ دیا۔ انگریزی کے علمی زبان بننے کی اس ایک خوبی
کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔

اصطلاحات سازی کے اس عمل کو دیکھتے ہوئے علم ہوتا ہے کہ اہل یورپ نے
ہر چند کہ سائنسی اور جدید علمی اصطلاحات کو یونانی زبان سے بھی اخذ کیا
تھا لیکن انہوں نے اصطلاحات کو یونانی حروف تہجی میں منتقل نہیں کیا بلکہ
انہیں رومن حروف میں ڈھالا تھا جو مغربی یورپ کے ملکوں کی مشترکہ علمی
وراثت تھے۔ اس طرح سائنس اور جدید علوم کی اصطلاحوں کا مشترکہ سرمایہ
ترتیب پایا تھا۔ البتہ ریاضیات میں یونانی حروف تہجی کو علامتوں کے طور پر

اختیار کیا گیا اور یہی حروف فزکس اور بسا اوقات کیمسٹری میں بھی رائج ہوئے۔ یونانی حروف سگما(Σ)پائی (Π) اور تھی ٹا θ علامتوں کے طور پر ریاضیاتی علوم میں استعمال کیے گئے۔ یہی صورت ایلفا(ALPHA)، بی ٹا (BETA) اور گے ما(GAMA) کی رہی۔ اصطلاحات اور یونانی حروف کے ایسے تدریجی عمل نے جدید علوم کو ایک اعتبار سے علامتی زبان فراہم کی جو ان علوم کی خصوصی زبان اور انفرادی شناخت بن گئی۔ اسی طرح کیمسٹری میں معدنیات کو بھی علامتی نشان دیے گئے۔ سلور (چاندی) Ag، گولڈ (سونا) Au، مرکری (پارہ) Hg اور سوڈیم Na کے شناختی نشانوں سے علم کیمیا میں پہچانے گئے اور انہی نشانوں کے ذریعے ان کو کیمیاوی ایکویشن (مساوات) میں شامل کیا گیا۔ یہی طریق کار تیزابیات میں بھی اختیار کیا گیا اور نمک کے تیزاب کو ہائیڈروکلورک ایسڈ (HCL)، گندھک کے تیزاب کو سلفیورک ایسڈ (H_2SO_4) اور شورے کے تیزاب کو نائٹرک ایسڈ (HNO_3) کے علامتی ناموں سے پکارا گیا۔ ایسی ہی صورت آرگینک کیمسٹری میں دکھائی دی جہاں ۱ بین زین کو رنگ ⬡ کی شکل میں دکھایا گیا اور علم کیمیا کی علامتی زبان میں مفردات اور مرکبات کی صورت گری کی گئی۔ سائنس کے دیگر علوم میں بھی ایسا ہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ علم نباتیات (باٹنی) میں فلورل فارمولا اور فلورل ڈایا گرام کا استعمال کیا گیا۔ فزیالوجی اور سائیکولوجی میں تمام تر علمی نقشہ ایسے ہی اصطلاحی ناموں سے ظاہر ہوتا ہے اور ان ناموں اور اصطلاحوں کے بغیر جدید علوم کی دنیا میں وارد ہونا دشوار ہے۔ اس ضمن میں اکنومکس ، سوشیالوجی اور پولیٹیکل سائنس میں انگریزی کی عام فہم صورت کو ملحوظ رکھا گیا جہاں ڈیمانڈ اور سپلائی، فیملی اور گروپ، الیکشن اور گورنمنٹ کے الفاظ کو اصطلاحی معانی دیے گئے۔

جدید علوم کے جس اصطلاحی علمی منظر کا ذکر کیا گیا ہے جو کسی طرح جامع بھی نہیں ہے۔ اس کا ذریعۂ تعلیم کے ساتھ اور امتحانات کے نظام کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور اس ضمن میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ ذریعۂ تعلیم اور نظام امتحانات کو وسیع تر علمی تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔ تعلیم اور تدریس کا عمل، عالمی تناظر کے بغیر اپنی افادیت ظاہر نہیں کر سکتا۔ جدید علوم کے سلسلے میں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان علوم کی مروجہ اصطلاحی زبان کے بغیر قومی تعلیمی عمل نامکمل رہ سکتا ہے اور قومیت کی تشکیل کے ذہنی اور فکری مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ سلفیورک ایسڈ کو

1. BENZENE : ring

گندھک کا تیزاب کہہ کر اس محلول کے بارے میں شناخت تو ممکن ہو سکتی ہے لیکن اسے H_2SO_4 کے حوالے سے کیمسٹری کے اعلیٰ علمی مدارج میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے علمی ریسرچ کے لیے جو کشود ذہن کی بنیادی ضرورت ہے اور جس کا تعلق قومیت کی ذہنی اور فکری اور علمی تشکیل کے ساتھ بھی ہے ضروری ہے کہ جدید علوم کی اصطلاحی زبان ہی کو بنیادی معلومات کے لیے استعمال کیا جائے اور اس ضمن میں ذریعۂ تعلیم اور اصطلاحی زبان میں تمیز کرتے ہوئے ان دونوں میں فرق کو مدنظر رکھا جائے۔

جدید علوم کی تدریس میں (جن میں سائنسی، میکانکی اور معاشرتی علوم شامل ہیں) قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے بغیر قومیت کی اعلیٰ ترین صورتوں میں تشکیل ممکن نہیں ہے کیوں کہ ان علوم کا انسانی ذہن کے ساتھ براہ راست رشتہ قائم کیے بغیر ذہن کی صلاحیتوں کو بیدار کرنا مشکل ہے اور بے شمار دوسرے ملکوں میں قومی زبان ایسے فرائض کی انجام دہی میں بخوبی کامیاب بھی ہوتی رہی ہے۔ تاہم قومی زبان ذریعۂ تعلیم کے طور پر کارگر ہوتے ہوئے انسانی ذہن کو جدید علوم کی اصطلاحی دنیا میں وارد کر سکتی ہے اور غالباً یہاں تک رہبری کرنے کے بعد اس کی کارگزاری میں بہت کچھ تبدیلیاں ضروری ہو جاتی ہیں۔ کیوں کہ رہبری کے ایسے عمل کے بعد ان علوم کی زبان اصطلاحی صورت اختیار کرتی ہے۔ جس کے ساتھ ذریعۂ تعلیم کے طور پر قومی زبان کے رشتےکو سمجھنا بے حد اہم ہے۔ اس رشتے کی معروضی کیفیت کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے۔ ------ کیوں کہ اس مقام پر جہاں جدید علوم کی اصطلاحی صورت دکھائی دیتی ہے باور کیا گیا ہےکہ یہ ایسا مقام ہے جہاں ترجمےکی ضرورت پڑتی ہے اور غالباً ترجمے کے بغیر یا تو قومی زبان کا بہ طور ذریعۂ تعلیم سارا عمل ادھورا رہ جاتا ہے یا اصطلاحی زبان کو قومی زبان میں منتقل کیے بغیر قومیت کی تشکیل کا عمل تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے۔ ایسی کئی غلط فہمیوں کی بناء پر قومی زبان کے راستےمیں دشواریاں حائل رہی ہیں۔

قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں ضروری ہے کہ قومی زبان صرف ذریعۂ تعلیم کے طور پر کارگر ہوتے ہوئے جدید علوم کی اصطلاحی زبان تک انسانی ذہن کی رہنمائی کرے اور اصطلاحی زبان کو اسی طرح انسانی ذہن کا ورثہ بننے میں مددگار ثابت ہو تاکہ اصطلاحی زبان میں اور انسانی ذہن میں کسی قسم کی غیریت باقی نہ رہے۔ علم کے جس عالمی تناظر سے ہماری قومیت کا عمل گزر رہا ہے اس میں اصطلاحی زبان کو ترجمے کی صورت میں منتقل کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے کیوں کہ ترجمہ کرنے سے اصطلاحوں کا ایک محدود اور مقامی

ماحول ہی ظاہر ہو سکتا ہے جس کی بین الاقوامی طور پر قطعاً کوئی افادیت ممکن نہیں ہے۔ خلافت عباسیہ کے دور میں جب بیت الحکمۃ قائم ہوا تھا اور علوم کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا تھا جس کی تفصیل ابن الندیم الوراق کی الفہرست میں دکھائی دیتی ہے۔ زمانہ مختلف تھا اور عالم اسلام کی دنیا بھر میں حیثیت بھی مختلف تھی۔ اس کے بعد دنیا میں قوتوں کا تناسب بدل چکا ہے اور تہذیبوں کی باہمی نسبتیں بھی بدل چکی ہیں۔ کم از کم ہمارے تہذیبی احیاء میں اور نشاۃ ثانیہ کے امکانات میں زمانی اعتبار سے کئی صدیوں کے فاصلے رونما ہوچکے ہیں۔ ان فاصلوں کو جدید علوم اپنی اصطلاحوں اور اپنی اصطلاحی زبان کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں جو امراہم ہو چکا ہے یہ ہے کہ جدید علوم کی آگہی اور دسترس کے بغیر ہماری نشاۃ ثانیہ کا سفر بھی اپنے امکانی نتائج حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے اصطلاحی (اور خصوصی) زبان کو ترجمے کے عمل سےگزارنا قومیت کی تشکیل کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے اور اس عمل کی سست رفتاری ہمارے مستبقل کے لیے بھی فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی۔ ان حالات میں جو کیفیت رونما ہوتی ہے اسے کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔
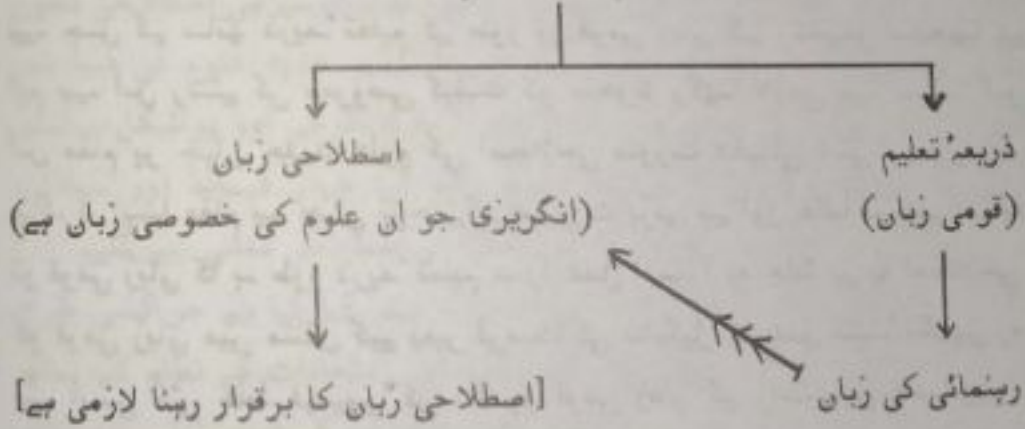
قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے جانےکے جس تدریسی عمل کی طرف اشارا کیا گیا ہے اس سے جو فائدے قومی زبان کو حاصل ہو سکتے ہیں وہ قومی زبان کی وسعت اظہار، ہمہ گیری اور گہرائی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جدید علوم کی اصطلاحی زبان (انگریزی) قومی زبان کے ذریعۂ تعلیم بننے کے ساتھ قومی زبان کا جزو بن سکتی ہے۔ اور اس طرح علمی فضا کو پیدا کرنے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ اس ضمن میں یہ اندیشہ بھی باقی نہیں رہتا کہ اصطلاحی زبان کی موجودگی میں قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم کے فرائض نہیں سونپے جاسکتے۔ تاہم اس بارے میں یہ بھی

کہا جا سکتا ہے کہ ایسا عمل تو دو زبانوں کے باہمی رابطے ہی کو نمایاں کرتا ہے۔ اس امر کی وضاحت کے لیے یہ کہنا مناسب ہے کہ علم عموماً دو زبانوں ہی کے باہمی ربط اور رابطے سے پیدا ہوتا ہے۔ علم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کی اپنی خصوصی زبان نہ ہو۔ تصوف کی بھی اپنی خصوصی زبان ہے۔ اسلامیات اپنی اصطلاحوں میں کلام کرتی ہے۔ اسی طرح علم الشعر کی اپنی منفرد لفظیات ہے۔ قومی زبان ذریعۂ تعلیم کے طور پر ان اصطلاحوں اور ایسی لفظیات تک رسائی پانے میں مدد دیتی ہے۔ اگر غیر سائنسی مضامین میں ایسا طریق کار موجود ہے تو اسی طریق کار کو سائنسی اور جدید علوم کے ضمن میں اختیار کرنےمیں کیا عذر مانع ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قومی زبان کا سائنسی علوم کے لیے ذریعۂ تعلیم بننا قومی مقاصد اور قومیت کی تشکیل کے لیے بے حد لازمی ہے۔ صرف اسی طرح قومی زبان (اردو) جدید علوم کی اصطلاحی زبانوں کے ساتھ رابطہ پیدا کر سکتی ہے اور قومی شعور جدید علوم کی دنیا میں زیادہ اعتماد کے ساتھ وارد ہو سکتا ہے اور قومی مستبقل کے لیے وسیع تر امیدوں کو آشکار کر سکتا ہے۔

تاہم اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی برابر اہم ہے جو امتحانات سے تعلق رکھتا ہے اور اس سوال کی جانب اشارا کرتا ہے کہ اگر قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم کے فرائض سونپے جا سکتے ہیں اور سائنس کے علوم تک دسترس قومی زبان کی رہبری میں ممکن ہے تو سائنس کے امتحانات میں جواب کون سی زبان میں تحریر کیے جا سکتے ہیں؟ اس ضمن میں یہ امر قابل توجہ ہے کہ سائنس کی زبان (انگریزی) کو خصوصی اور اصطلاحی زبان کہا گیا ہے اس لیے ان مضامین کے سوالات کو اصطلاحی زبان ہی میں پوچھا جا سکتا ہے اور جوابات کے لیے بھی یہی زبان موزوں ہے۔ تاہم قومیت کی تشکیل کے دور رس تناظر کے لیے لازمی دکھائی دیتا ہے کہ اصطلاحی زبان کے مضمرات اور مافیہ کو قومی زبان میں بھی بیان کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ہائی سکول کے بعد ہر سطح پر ایک ایسا سوال جو عمومی اور نظری یا بنیادی نوعیت کا ہو اور جسے سائنس کی اصطلاحی زبان میں پوچھا گیا ہو اس کا جواب قومی زبان میں تحریر کیا جائے۔ اس سوال کو ہر سطح پر لازمی سوال تصور کیا جائے اور اس کا قومی زبان میں جواب تحریر کرنا ہر طالب علم اور امیدوار کے لیے لازمی قرار دیا جائے۔ عالمی تناظر میں اور جدید زمانے میں قومی زبان کو سائنس کی اصطلاحی زبان کے قریب تر لانے کے لیے ایسے اقدامات کی بہت ضرورت دکھائی دیتی ہے۔

قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم کی ذمہ داری سونپتے ہوئے عموماً یہ رویہ نمایاں ہوتا ہے اور اکثر حالات میں ہوا بھی ہے کہ انگریزی میں پڑھائے جانے والے مضامین

کو قومی زبان میں پڑھائے جانے کی روش ظاہر ہوتی ہے اور بعض حالات میں ایسا میلان سامنے بھی آیا ہے۔ یوں نہ صرف ایسے مضامین کی لفظیات قومی زبان میں منتقل ہوتی ہے بلکہ ذریعہ تعلیم بھی قومی زبان ہی کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ایسے تدریسی عمل کی کیفیت اکنامکس (اقتصادیات) اور سائیکالوجی (نفسیات) اور دوسرے انسانیاتی مضامین میں بآسانی ظاہر ہوتی ہے۔ ایسے طریق کار سے دو متوازی تدریسی نظام آشکار ہوئے ہیں جن کو عرف عام میں اردو میڈیم اور انگلش میڈیم کہا جاتا ہے۔ یہ تدریسی طریق کار بظاہر ایسا ہے جسے آسان ترین کہا جا سکتا ہے کہ مناسب وقت آنے پر انگلش میڈیم کو ختم کرنے کے امکانات دکھائی دیتے ہیں اور یہ خیال مستحکم ہوتا ہے کہ مضامین کی اردو لفظیات طلبا کے ذہن میں بتدریج راسخ ہو کر انگریزی لفظیات کا متبادل بن سکے گی۔ تاہم علمی اعتبار سے اردو لفظیات ذہن کو علوم کے عالمی تناظر سے منقطع کر دینے کا خدشہ بھی پیدا کر سکتی ہے۔ اردو لفظیات کے ذریعے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچنے کے باوجود ریسرچ اور عالمی معلومات کے ساتھ رابطہ ممکن نہیں ہو سکتا اور خود تدریسی نظام ہی میں طلبا کا ذہن انگریزی لفظیات کے ادراک کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ایسا یک طرفہ طرز عمل اور تدریسی طریق کار قومیت کی تشکیل کے اعلیٰ ترین مقصد (کشود ذہن) کو حاصل کرنے میں مدد گار بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔ اس لیے قومیت کی تشکیل کے لیے ضروری دکھائی دیتا ہے کہ اردو میڈیم اور انگلش میڈیم کے فرق کو کسی طور استعمال نہ کیا جائے اور متوازی تدریسی نظام کی نفی کی جائے۔ قومی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کرتے ہوئے مضامین کی خصوصی لفظیات (انگریزی) ہی کو برقرار رکھنا مناسب ہے تاکہ طلبہ علوم کی جدید خصوصی لفظیات کے ساتھ ذہنی رشتوں کو برابر قائم رکھ سکیں اور علمی اعتبار سے قومیت کی تشکیل کا عمل کسی یک طرفہ اور محدود کیفیت سے دو چار نہ ہو۔ اس ضمن میں قابل غور امر یہ ہےکہ قومیت کی تشکیل کا عمل جدید لفظیات کو فہم و ادراک کا جزو بنانے سے مؤثر اور پائدار ثابت ہوسکتا ہے۔ قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا ایک واضح مقصد یہ بھی ہے کہ اس ذریعہ تعلیم کی وساطت سے تعلیمی نظام، نصابی تقاضے اور طلبہ کا ذہن علوم کی جدید لفظیات اور اس کے مافیہ سے برابر بہرہ ور رہے۔ مضامین کو قومی زبان میں منتقل کرنے سے لفظیات کی اجنبیت پیدا ہو سکتی ہے اور نظام تعلیم اور قومیت کی تشکیل کے مقاصد بلاوجہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ قومی زبان ذریعہ تعلیم بنتے ہوئے ارتباط علم کا محور بن سکتی ہے اور علوم کے مافیہ کو قومیت کے تخلیقی مزاج میں مستحکم کر سکتی ہے۔

جس لسانی ماحول کی طرف اشارا کیا گیا ہے۔ اس میں واضح طور پر انگریزی اور قومی زبان کا باہمی رشتہ نہایت اہم ہے تاہم تدریسی صورت حال میں قومی زبان اور علاقائی زبان کا باہمی رشتہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے اور اس ضمن میں جب کبھی نظام تدریس میں ذریعۂ تعلیم کا موضوع سامنے آیا ہے علاقائی زبان کے کردار کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس طرح ایک کلیتاً غیر سائنسی مفروضے کو دلیل کا رنگ دیا گیا ہے کہ تعلیم کے لیے بہترین ذریعہ مادری زبان ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کسی بھی تمدن میں دو مائیں ایک سی زبان میں اپنے بچے سے باتیں نہیں کرتیں۔ مادری زبان اصل میں گھرانے کی زبان ہوتی ہے اور گھرانوں کے محدود حلقے میں پیدا ہوتی اور پھیلتی ہے۔ اگر مادری زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا جائزہ لیا جائے تو بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ ایک ہی محلے میں مادری زبان کی لفظیاتی صورت یکساں نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں گھرانے کی مادری زبان بھی کئی دوسرے معاشرتی عوامل سے متاثر ہوتی ہے۔ گھرانے کا اندرونی کلچر، خواندگی کی شرح، گھرانے کی آمدن کے ذرائع، ماؤں اور رشتہ داروں کا پڑھا لکھا یا ان پڑھ ہونا، ریڈیو اور ٹیلی وژن کی موجودگی، اخبارات اور رسائل کا مطالعہ، مردوں کے اختیار کیے ہوئے پیشے، مذہبی تعلیم و تربیت کا معیار اور ان سب عوامل کے ساتھ ساتھ گھرانے کی ذہنی اُپج اور تہذیبی افتاد طبع ------ یہ سب ایسے اجزاء ہیں جو مادری زبان کی ساخت اور ابلاغ پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ مادری زبان وہ ہے جو مائیں بولتی ہیں محض ایک جذباتی رویہ ہے جس کے ذریعے بچے کو اشیاء کے ساتھ اور عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ تو متعارف کیا جا سکتا ہے، اس کی ذہنی نشوونما کو وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس اعتبار سے جب مادری زبان گھرانے کے باہر مستعمل ہوتی ہے تو ایک مشترکہ مادری زبان کی صورت اختیار کرتی ہے اور اس مشترکہ مادری زبان کا گھرانے کی زبان سے رشتہ منقطع ہوتے دکھائی دتیا ہے دوسرے لفظوں میں جب گھرانے کی مادری زبان معاشرتی شکل اختیار کرتی ہے تو اس کی لفظیات پھیلتی ہیں اور اس کا لسانی حجم بڑھ جاتا ہے اور جو کیفیت نظر آتی ہے اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے :

گھرانہ (ماں اور بچہ) مادری زبان ← { معاشرہ / مادری زبان اور بچے ← { مشترکہ مادری زبان ←
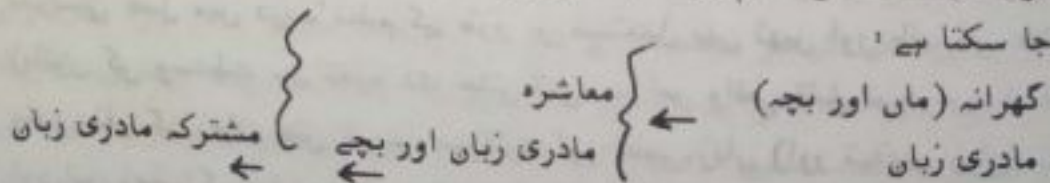
اس طرز عمل سے جو امر واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مادری زبان بھی اصولی طور پر معاشرتی ارتباط کی زبان ہے جس کی وساطت سے بچے اپنے ماحول میں

دوسرے بچوں کے ساتھ رابطہ قائم کرتے ہیں۔ تاہم لسانی جغرافیہ اس ارتباط کو ایک خاص علاقے کی حدود تک ہی کامیابی کے ساتھ ممکن کر سکتا ہے کیوں کہ مادری زبان کے علاقے لسانی اعتبار سے محدود ہوتے ہیں اور صرف ایک خاص حد تک ہی کارآمد ہوتے ہیں۔ لسانی جغرافیہ اس اعتبار سے ان گنت مادری زبانوں کے منطقوں میں منقسم دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مخصوص مادری زبان کے حلقے کے باہر انسانی روابط بھی قائم نہیں ہوسکتے اور مادری زبان الف اور مادری زبان ج کے مابین انسانی ارتباط کے قیام میں دشواریاں حائل دکھائی دیتی ہیں۔ مادری زبان اپنے دائرہ کار میں صرف محدود فاصلے اور محدود مقاصد ہی کی تکمیل کرتی ہے۔

گھرانے اور گھرانے کے باہر ماحول کے مابین بچے کے طبعی عمل کو دیکھنے سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ انسان جامد نہیں ہے، متحرک ہے اور گھرانے سے باہر کی دنیا کے ساتھ رشتے قائم کرنے کا طبعی طور پر آرزو مند ہے۔ دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ انسان اپنے لسانی جغرافیے کو عبور بھی کرتا ہے اور ایک بڑے انسانی ماحول کا حصہ بھی بنتا ہے۔ اگر ان دونوں صورتوں کو باہم دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ نہ صرف انسان متحرک ہے بلکہ وہ مختلف زبانوں کو سیکھنے کی صلاحیت سے بہرہ مند بھی ہے۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو وہ نہ تو اپنا گھر چھوڑ سکتا ہے اور نہ سفر کر سکتا ہے۔ مادری زبان کا تصور کم از کم اس اعتبار سے ایک جامد معاشرے اور غیر متحرک کلچر کا تصور ہے اور ایک ایسے زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب لوگ اپنے آبائی علاقے سے کبھی باہر نہیں آتے تھے، سفر کرنے سے کتراتے تھے، پردیس سے خوف زدہ تھے اور دنیا کے باقی علاقوں سے کٹے ہوئے تھے۔ عہد حاضر میں مادری زبان کو پرانے ماحول کے پس منظر کے مطابق علم و خرد کا ذریعہ بنانے کی روش کسی طرح مفید اور کارآمد دکھائی نہیں دیتی۔

تاہم اس ضمن میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اسلامی ہندوستان کے زمانے میں مادری زبان کے حوالے سے بیشتر علاقائی زبانیں اس زمانے کے علمی اور تدریسی عمل میں ذریعۂ تعلیم کے طور پر مستعمل بھی تھیں اور طلبہ کو علاقائی زبانوں کی وساطت سے تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ امر واقعی قابل توجہ ہے۔ اسلامی ہندوستان کے زمانے میں فارسی سرکاری اور علمی زبان (اور تہذیبی زبان) تھی۔ اور اس زمانے کے تعلیمی مقاصد کے تحت طلبہ کو اسلامی علوم سے بہرہ مند کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اسلامی ہندوستان نے کسی مشترکہ قومی زبان کو ابھی دریافت نہیں کیا تھا۔ علمی حلقوں میں فارسی زبان رابطے کی زبان تھی اور سندھ،

پنجاب، ملتان، کشمیر یا ہزارہ اور پشاور کے رشتے دہلی کے ساتھ فارسی زبان کی وساطت سے قائم ہوتے تھے۔ اس زمانے کی لسانی اور تدریسی کیفیت کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

علاقائی زبان = ← فارسی (سرکاری علمی) علوم اسلامیہ
محصوص جغرافیائی منطقہ ← اور علوم اسلامیہ ← عالم اسلام
← عربی مذہبی زبانیں
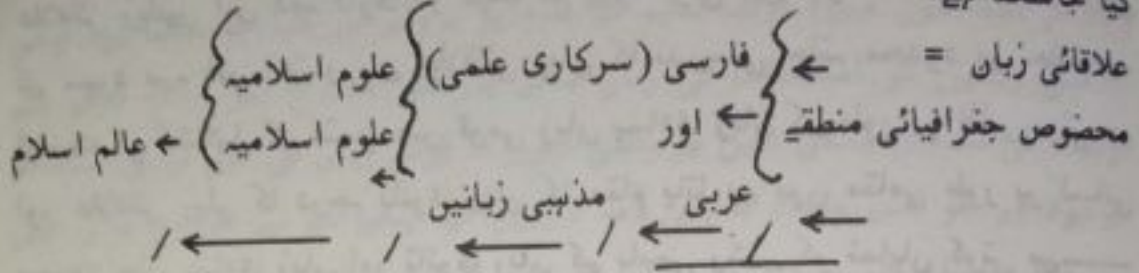
اسلامی ہندوستان کا نظام تعلیم فارسی اور عربی کے ذریعے اسلامی علوم کی تکمیل کے مواقع فراہم کرتے ہوئے علاقائی ذہن کو عالم اسلام کے ساتھ منسلک کرتا تھا۔ قومی زبان کی عدم موجودگی میں یہ ذمہ داریاں علاقائی زبانوں کے سپرد تھیں اور رابطے کی زبان گو اعلیٰ سطح پر فارسی تھی۔ تاہم اس زمانے میں وہ مشترک زبان بھی نشوونما کے مراحل طے کررہی تھی جسے آج ہماری قومی زبان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ تاہم اس ضمن میں یہ بات بھی کم اہم نہیں ہے کہ اسلامی ہندوستان اور پاکستان کے مابین علمی صورت کئی اعتبار سے بدل چکی ہے اور اس کے ساتھ مادری زبان/ علاقائی زبان کی افادیت پر بھی گہرا اثر پڑا ہے۔ عہد حاضر میں علوم کی وسعت بڑھ گئی ہے۔ جدید علوم کے مراکز عالم اسلام کی سرحدوں کے باہر قائم ہوچکے ہیں اور خود مسلمان اقوام علمی مقابلہ آرائی کے عمل سے دوچار ہو رہی ہیں۔ اس حقیقت سے کسی طور انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علمی میدانوں میں فوقیت حاصل کرنے ہی سے مسلمان اقوام کا مستقبل ظاہر ہو سکتا ہے اور پاکستان کی قومیت اپنی تکمیل سے آشنا ہو سکتی ہے۔

ان حالات میں جن کا ذکر کیا گیا ہے یہ سوال کہ مادری زبان کا تعلیمی عمل میں کیا مقام ہے؟ اور اسے کس حد تک تدریسی اور تعلیمی عمل میں شریک کیا جا سکتا ہے ایسے سوال ہیں جن کو معروضی طور پر حل کرنے کی ضرورت ہے۔ قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں مقامی طور پر قومی زبان اور علاقائی (مادری) زبان کے باہمی رشتے کا مسئلہ نمایاں ہوتا ہے۔ جسے واضح لفظوں میں سمجھنا ضروری ہے۔ دنیا کے ہر مہذب ملک میں مقامی زبانیں بولی جاتی ہیں مگر قومی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ دونوں کے مابین بہت کم تضاد رونما ہوتا ہے۔ امریکہ میں جہاں مختلف نسلیں آباد ہیں اور مختلف زبانوں کے گھرانے برابر موجود ہیں قومی زبان (انگریزی) ہی ذریعۂ تعلیم ہے۔ برطانیہ میں موجود پاکستان، بھارت، سری لنکا اور ملائیشیا اور دوسرے ملکوں کی نسلی وحدتیں برابر موجود ہیں لیکن ان کے بچے انگریزی ہی کی وساطت سے تعلیم پاتے ہیں۔ اسی طرح جرمنی اور

فرانس میں بھی علاقائی بولیاں موجود ہیں۔ ویلز اور سکاٹ لینڈ میں بھی علاقائی زبانیں (اور ان کا ادب) موجود ہے لیکن ذریعۂ تعلیم ان ملکوں کی قومی زبان ہے۔ علاقائی زبانیں اس ذمہ داری کو بہت کم پورا کرتی ہیں جو ذمہ داری قومی زبان کے سپرد ہے۔ اس اعتبار سے علاقائی زبان کا تدریسی حلقہ محدود ہو جاتا ہے۔ قومیت کی تشکیل کے ضمن میں قومی زبان بنیادی زبان کے طور پر ظاہر ہوتی ہے اور علاقائی زبان کا درجہ ثانوی زبان کا مقام پاتا ہے یوں مقامی طور پر لسانی صورت حال بنیادی زبان اور ثانوی زبان کے باہمی رشتے کو نمایاں کرتی ہے۔۔۔۔۔

ظاہر ہے کہ جس نوع کے کلچر سے ہمارا معاشرہ گزر رہا ہے وہاں ابتدائی تعلیم کے لیے مقامی زبان ہی کو استعمال کرنا ناگزیر ہے، کیوں کہ ہمارا کلچر اپنے ارتقائی عمل کے دوران ایک جامد معاشرے سے ایک متحرک تمدن کی جانب سفر کر رہا ہے۔ جامد معاشرے کی جغرافیائی ضروریات کے تحت مقامی بولی/ علاقائی زبان ہی چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے۔ تاہم اگر انگلش میڈیم سکولوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو ملحوظ رکھا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک بچہ جو پشتو، سندھی، پنجابی، براہوی یا بلوچی گھرانے میں پیدا ہوا ہے اور اسے انگلش میڈیم سکول میں پڑھنے کے لیے بھیجا جا سکتا ہے تو ایسے طریق کار کو مادری زبان کے علمبردار کیسے برداشت کر سکتے ہیں اور اسے قابل قبول گردان سکتے ہیں ؟ اگر بچہ انگلش میڈیم میں تعلیم پا سکتا ہے تو وہ قومی زبان کے بارے میں بھی کوئی دشواری محسوس نہیں کرسکتا۔ یہ کیفیت بنیادی زبان (قومی زبان) اور ثانوی زبان (علاقائی زبان) کے بارے میں نفسیاتی رویوں ہی کی نشاندہی کرتی ہے۔ تاہم اسی ضمن میں یہ خیال بھی توجہ طلب ہے کہ اگر علاقائی زبانوں کی تدریس کا انتظام نہ کیا جائے تو غالباً علاقائی زبانیں اپنا وجود اور اپنا شعری سرمایہ محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔ یہ امر جس بات کی طرف اشارا کرتا ہے وہ ذریعۂ تعلیم سے تعلق نہیں رکھتا علاقائی زبانوں کے وجود کے لیے مناسب انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک ذریعۂ تعلیم کا تعلق ہے اسے صرف بنیادی زبان کے ساتھ ثانوی زبان ہی کی حیثیت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کئی زبانوں کے ذریعۂ تعلیم ہونے سے قومیت کا تصور متاثر ہوتا ہے اور علمی مقاصد بھی حاصل نہیں ہو سکتے ۔ ۔۔۔۔۔

قومیت کی تشکیل کے لیے ثانوی زبان (علاقائی زبان) کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا تصور ایک محدود افادیت کا حامل ہے کہ بچے کو اس کی ابتدائی جماعتوں میں علاقائی زبان کی مدد سے پڑھایا جائے۔ یہ ذریعۂ تعلیم چار سے چھ سال کی عمر تک ہی کارآمد ہوسکتا ہے اور اس عمر کے بعد اسے جاری رکھنا قومیت کے مقاصد

کی تکمیل کے لیے مناسب دکھائی نہیں دیتا۔ چونکہ قومی زبان اور علاقائی زبانیں ایک ہی لسانی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے ان دونوں کو بیک وقت (ابتدائی جماعتوں میں) ذریعۂ تعلیم کے طور پر بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ لیکن علاقائی زبانوں کو امتحانات کی زبان بنانے یا اعلیٰ مدارج میں رائج کرنے سے قومیت کی تشکیل ممکن نہیں ہوسکتی کیوں کہ قومی زبان ہی میں ایسی استعداد موجود ہے جو اسے متعدد تعلیمی ذمہ داریوں کے اپنانے کے لیے موزوں قرار دیتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ قومی زندگی کے فیصلے ہر اعتبار سے تاریخی ہوتے ہیں۔ تحریک پاکستان کے دوران برصغیر کے مسلمانوں نے جس زبان کو اپنی تہذیبی اور قومی زبان قرار دیا تھا اسی زبان کو آزادی کے بعد فوقیت حاصل ہو سکتی ہے اور صرف وہی زبان ذریعۂ تعلیم کے فرائض انجام دے سکتی ہے۔ تاہم جس کلچر سے ہماری قومیت اس وقت گزر رہی ہے اس کی ضرورتوں کے لیے محض محدود سطح تک (ثانوی) علاقائی زبانوں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

ذریعۂ تعلیم کو کلاس روم میں گفتگو کے ذریعے کے طور پر محض ایک معمولی طریق کار قرار دینا تعلیمی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ ذریعۂ تعلیم نظام تدریس کا ایک نہایت لازمی عنصر ہے اس کی وساطت سے نہ صرف معلومات علمی طلبہ تک پہنچ پاتی ہیں بلکہ ذریعۂ تعلیم کے حوالے سے بھی (الفاظ، جملوں اور معانی) تعلیمی مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ تعلیمی مقاصد کا ابلاغ ایک معروضی عمل بھی ہے۔ اس اعتبار سے ذریعۂ تعلیم کے لیے بھی غیر جذباتی، براہ راست، اختصار پسند اور باوقار ہونا ضروری ہے۔ ہر جماعت کے حوالے سے ذریعۂ تعلیم کے معیار کی سطح بھی تجویز کی جا سکتی ہے۔ ابتدائی جماعتوں کے لیے ذریعۂ تعلیم کی زبان کا معیار بھی جہاں طلبہ کی عمر کے مطابق ہونا ضروری ہے وہیں اس کا اپنا معیار ابتدائی جماعتوں کے ذہنی تقاضوں سے ذرا بلند ہونا لازمی ہے۔ یہ تقاضے ذریعۂ تعلیم کو اعتماد اور پختگی فراہم کرسکتے ہیں۔ پختہ اور بااعتماد ذریعۂ تعلیم کے بغیر تدریسی مقاصد بھی پورے نہیں ہوسکتے۔

پاکستان میں قومی زبان کا لسانی ماحول اخبارات، رسائل ریڈیو، (بی بی سی، وائس آف امریکہ) ٹیلی وژن اور مشاعروں، مذہبی تقاریر، خطبات، ذکر حسین اور مجالس عزا، سیاسی اور سرکاری تقاریر کے باعث ہمہ گیری اختیار کر چکا ہے اس ضمن میں فلم انڈسٹری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کیسٹوں کو فراموش کیا جا سکتا ہے جن کے گیت قومی زبان کی وساطت سے سنے جاتے ہیں۔ اسی طرح مشرق وسطیٰ، شمالی افریقہ، اور تحصیل روز گار کے دوسرے

علاقوں میں جہاں علاقائی زبانوں کے باشندے ملازمت کرتے ہیں قومی زبان ہی ان کو اپنے ہم وطنوں سے ہمکلام کرتی ہے۔ اس لیے ذریعۂ تعلیم کے لیے علاقائی زبان کو کسی طرح زیادہ موثر قرار دینا غالباً درست نہیں ہے۔ ذریعۂ تعلیم صرف وہی زبان بن سکتی ہے جس کا لسانی اثر ہمہ گیر اور وسیع تر ہو اور جس کی صلاحیتوں کے پھیلنے کی رفتار تیز تر ہو۔ دوسرے لفظوں میں ذریعۂ تعلیم صرف وہی زبان بن سکتی ہے جو بین الاقوامی کلچر کے زیادہ قریب ہو اور جس کے تخلیقی شعور کی جہتیں متعدد ہوں اور جو ہر نوع کے موضوع اور مضمون کو اپنی گرفت میں لینے پر قادر بھی ہو۔

اسی سلسلے میں ایک اور حقیقت بھی بہت اہم ہے اور وہ کسی زبان کی نشوونما میں انسانی آبادی کے تناسب کی شرح ہے اور جس کے ساتھ لوگوں کی شرح خواندگی بھی وابستہ ہے۔ قومی زبان (اردو) کو پرانے آگرہ اودھ یا دہلی کے ساتھ مستقل طور پر منسلک نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ زبان مسلمانانِ برصغیر کی زبان کے طور پر برابر تسلیم کی جاتی رہی ہے اور کی گئی ہے۔ اس زبان کی نشوونما، تخلیقی تاریخ اور ہمہ گیری میں برصغیر کے تمام مسلمانوں (اور غیرمسلموں) نے برابر کا حصہ لیا ہے اور عہد حاضر میں یہ زبان ایک نو عمر بین الاقوامی زبان بن کر جدید دنیا کی قومی زبانوں میں ابھری ہے۔ اس زبان کی شرح خواندگی بھی زیادہ ہے۔ اس زبان میں ہمارے مذہب کی کتابوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ تفاسیر اور احادیث کا لٹریچر بھی اس زبان میں بہت ہے۔ اسی ضمن میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ علاقائی زبانیں اپنے لسانی جغرافیے کے باہر اپنا ابلاغ زائل کر دیتی ہیں جبکہ قومی زبان کا لسانی علاقہ بے حد وسیع ہے۔ اردو کو ذریعۂ تعلیم بناتے وقت علاقائی زبانوں کے ثانوی کردار کو تخلیقی اظہار ہی کے لیے مخصوص کیا جا سکتا ہے تاکہ علاقائی زبانوں کی تخلیقی سرشت نشوونما پاسکے۔ ان زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے تخلیقی طور پر شاید کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

تاہم بنیادی زبان (قومی زبان) اور ثانوی زبان (علاقائی زبان) کے جس رشتے کا ذکر کیا گیا ہے اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ تعلیم کے جس عمل کا ذکر ملحوظ ہے اور قومیت کی جس تشکیل کو ہمارے قومی مقاصد حاصل کرنے کے طلب گار ہیں وہ ایسے لسانی رشتے کے قیام کے بغیر شاید ممکن نہیں ہو سکتے۔ ثانوی زبانوں کے ساتھ علاقے کے جذباتی رشتے بھی رونما ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے رشتے کے باوجود ذریعۂ تعلیم کے بارے میں کسی قسم کا مشروط سمجھوتہ شاید قومیت کی تشکیل کے لیے سود مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ ذریعۂ تعلیم میں ثانوی زبان کو صرف بے حد محدود اور ابتدائی صورتوں ہی میں شریک

کیا جا سکتا ہے تاکہ "مکان کی دہلیز" سے بچے کو دنیا کی دہلیز پر لانے میں آسانی ممکن ہو سکے۔ اگر ثانوی زبان کو ذریعہٴ تعلیم بنا کر بچے کے ذہن کو پھلنے پھولنے دیا جائے تو بچہ اپنے محدود کلچر ہی میں مقید ہو سکتا ہے اور اس کا ذہن دنیا کے محدود نقشے ہی سے آشنا ہو سکتا ہے۔ یوں ایسے طریق کار کے نتیجے میں علاقے مزید محدود تر ہو سکتے ہیں اور آزادی کے جس ثمر کے لیے تحریک آزادی کی ساری جدوجہد کار فرما رہی تھی وہ محدود لسانی ماحول کی بناء پر کشود ذہن کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ زبانیں انسان کے وسیع تر ذہنی انکشاف کے لیے معرض وجود میں آتی رہی ہیں اور انسان کو آبائی جغرافیے سے آزاد کرتے ہوئے اسے انسانی وحدت میں شامل کرنے کی گنجائش پیدا کرتی ہیں۔ ان حالات میں تعلیمی عمل قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں علاقے کی کثرتوں کو قومیت کی وحدت میں صرف اس وقت شامل کر سکتا ہے جب ذریعہٴ تعلیم بنیادی زبان (قومی زبان) ہو اور ذہن جغرافیے کے مقامی ماحول سے آزاد ہونے کی جہت سے برابر آشنا ہوتا رہے۔ قومیت کی تشکیل کثرتوں کو وحدت میں منتقل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے اور یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب ذریعہٴ تعلیم ایک زبان ہو اور وہ قومی زبان ہو۔ ایسے طریق کار کے بغیر قومیت کی تشکیل اپنے مقاصد کی تکمیل حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ جدید دنیا کا مزاج جغرافیے کو عبور کرنے کی جانب راغب ہے۔ محدود جغرافیائی اکائی اپنے طور پر زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ نشوونما پاسکتی ہے۔ اس کا کسی وسیع تر اکائی میں جذب ہونا لازمی ہے تاکہ وہ اپنے تمدن کے ارتقا کو انسانی سرشت میں دریافت کر سکے۔ ایسا اثباتی رویہ اور تاریخی کردار صرف قومی زبان کے ذریعہٴ تعلیم بننے ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

١٦- دفاتر کی زبان/ دفتری زبان

بادی النظر میں دفاتر کی زبان کوئی مسئلہ نہیں ہے کیوں کہ کسی بھی کلچر میں دفاتر وہی زبان استعمال کرتے ہیں جو اس کلچر کی قومی اور سرکاری زبان ہوتی ہے۔ لیکن ہماری تاریخ میں دفاتر کی زبان اور اس زبان کا رواج مختلف ادوار میں مختلف رہا ہے۔ عہد اکبر سے دفاتر کی زبان فارسی تھی جسے ۱۸۳۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے مقبوضات میں موقوف کرکے انگریزی زبان کو رائج کیا تھا۔ آزادی (۱۹۴۷ء) سے قبل دفاتر کی زبان اعلیٰ سطح پر انگریزی تھی اور نچلی سطح پر اردو تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اعلیٰ درجے کے حاکم عموماً انگریز تھے اور دفاتر کی کارروائی ان کے جائزے اور فیصلوں کے لیے انگریزی زبان میں تھی جسے حالات کے پیش نظر جائز قرار دیا جا سکتا تھا۔ نچلی سطح پر مقامی زبانوں اور اردو کا استعمال لوگوں کی سہولت کے لیے تھا جو عموماً انگریزی زبان نہیں جانتے تھے۔ آزادی سے قبل ایسا طریق کار اس امر کی جانب ضرور اشارا کرتا تھا کہ دفاتر کی زبان وہی ہونا چاہیے جو لوگوں کی مشترکہ اور عام فہم زبان ہو۔ اس اعتبار سے برصغیر کے دفاتر کی زبان کا اعلیٰ اور بالائی سطح پر انگریزی ہونا مجبوری کا فیصلہ بھی تھا جسے عارضی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ دفاتر کی وہ زبان کسی طور دائمی نہیں ہو سکتی جو غیر زبان ہو اور جس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے برسوں کی تدریس ضروری ہو۔ تاہم اس کے باوجود کہ انگریزی زبان اونچی سطح پر اور حکومت کے اعلیٰ تر محکموں ہی میں مستعمل تھی سارے برصغیر کی سرکاری زبان (حکومت کی زبان) انگریزی ہی کو گردانا جاتا تھا۔

آزادی کے بعد اور قومیت کے تقاضوں کے پیش نظر دفاتر کی زبان کو بدلنے کے لیے جو رویے ظاہر ہوئے وہ قومی زبان کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کرتے تھے جو نہایت جائز مطالبہ تھا۔ قومیت کی تشکیل میں دفاتر کی زبان کا مقام ہمیشہ مرکزی رہا ہے۔ تاہم دفاتر کی زبانوں میں جس نوع کا تفاوت موجود تھا اسے کسی طرح قومی مقاصد کا مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ تحصیل اور ضلع کی سطح پر، تھانے کی سطح پر پولیس کی کارروائی اور محکمہ مال کے دفتروں کی کارروائی کے لیے اردو زبان کا استعمال پہلے ہی سے موجود تھا۔ لیکن ضلع کے باہر کمشنری کی سطح پر، سیشن عدالتوں اور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں، صوبائی سیکرٹریٹ میں، اسمبلی کی کارروائیوں میں اور وفاقی حکومت کے

ڈویژنوں اور وزارتوں میں ہر جگہ انگریزی ہی کو دفتری زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس لیے جب قومیت کی تشکیل کے لیے اور قومی مقاصد کی تکمیل کی خاطر قومی زبان کو ہر سطح پر استعمال کیے جانے کا مطالبہ ہوا تو کئی دشواریوں کی نشاندہی کی گئی جن کے ہوتے ہوئے انگریزی زبان کو بدلنا مشکل دکھائی دیا۔ سرکاری زبان کے طور پر آزادی سے قبل حکومت نے زبانوں کے جس تفاوت کو رائج رکھا تھا وہ بتدریج طبقاتی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اعلی حکام انگریزی میں دفتری کام انجام دیتے تھے جبکہ پٹوار خانے، تھانے اور تحصیل کی سطح پر نچلے اہلکار اردو کا استعمال کرتے تھے۔ عہدے اور تنخواہ کے اعتبار سےبھی دونوں زبانوں کے دفاتر میں نمایاں تفاوت اور فرق تھا۔ ڈیڑھ سو برس کی انگریزی عملداری نے دفتری زبان کو اصطلاحی زبان بنا دیا تھا اور دفاتر کی روٹین اور کارروائی کو اصطلاحی طریق کار کی صورت دے دی تھی۔ ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے اوپر کی سطح پر ہر عہدہ انگریزی زبان سے مستعار تھا۔ فائل ورک کی ایک خاص تکنیک تھی جو مخصوص اصطلاحوں کے بغیر بروئے کار نہیں آسکتی تھی۔ محکموں کے نام اور ان کا دائرہ کار انگریزی زبان کے بغیر ظاہر نہیں ہوسکتے تھے۔ ایسے پچیدہ اور طویل تر دفتری نظام کو، جو گورنر جنرل اور صدرمملکت سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک باقاعدہ انگریزی زبان ہی پر قائم تھا، فوری طور پر بدلنا ممکن نہیں تھا اور اس امر کے باوجود کہ انگریزی زبان نے اہلکاروں اور افسروں کی انتظامی نفسیات کو اپنی اصطلاحوں کے ساتھ مانوس کر رکھا تھا حکومت نے قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے آزادی کے بعد ہی اردو زبان کو دفتری زبان بنانے کا فیصلہ کیا۔ پنجاب میں اس مقصد کے حصول کے لیے دسمبر ۱۹۴۹ء میں مجلس زبان دفتری کا قیام عمل میں آیا تاکہ سرکاری دفاتر، محکموں اور عدالتوں میں انگریزی کی بجائے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنےکے متعلق ضروری ذرائع اور موزوں طریق کار کو اختیار کرنے کے لیے راہ ہموار کی جا سکے۔ اس اعتبار سے مجلس زبان دفتری کی کارروائی قومیت کی تشکیل کے لیے مناسب اور ضروری اقدام ثابت ہوئی۔

اس امر پر حکومت کا ہر محکمہ اور ہر ذمہ دار افسر متفق تھا کہ دفاتر کی زبان کے لیے قومی زبان (اردو) ہی کا استعمال کیا جائے لیکن متبادل اصطلاحوں اور مترادفات کے بغیر دفاتر کی کارگزاری کو قائم رکھنا آسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے دفتری اصطلاحوں کے لیے اردو کی متبادل اصطلاحات اور مترادفات کے لیے الگ شعبے قائم کیے گئے اور شعبہ ترجمہ اور مجلس استناد کی مدد سے اصطلاحوں اور مترادفات کی ترکیب و تدوین کی گئی جسے لغت کی شکل میں شائع کرکے

مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے محکموں کو ارسال کیا گیا۔ متبادل اصطلاحات اور مترادفات کے بارے میں یہ اصول ملحوظ رکھا گیا کہ یہ آسان اور عام فہم ہوں اور جہاں انگریزی اصطلاحات زبان زد خاص و عام ہوں انہیں رد و بدل کرکے انگریزی ہی کی اصطلاحات کے طور پر برقرار رکھا جائے۔ عہدوں کے بارے میں بھی یہی اصول مدنظر رکھا گیا کہ سیکرٹری کو معتمد کی اصطلاح میں بدلنا مناسب نہیں ہے۔ کچھ یہی صورت اکاؤنٹنٹ جنرل اور آڈیٹر جنرل کے دفاتر میں بھی نظر آتی تھی۔ گزشتہ کئی برسوں سے انگریزی کے دیے ہوئے عہدے کسی دشواری کے بغیر لوگوں میں مانوس ہوچکے تھے اس لیے عہدوں کے متبادل تلاش کرنا غیر ضروری قرار پایا۔ تاہم بعض نئے عہدے جو آزادی کے بعد رونما ہوئے انہیں دونوں زبانوں میں مستعمل کرنا مناسب دکھائی دیا صدرمملکت کے عہدے کو صدر اور پریذیڈنٹ دونوں طرح روا رکھا گیا، لیکن وفاقی محتسب کے عہدے کو اردو زبان ہی کے مترادف سے نسبت دی گئی اور اس کے انگریزی متبادل کو رد کر دیا گیا۔ اردو کو دفتری زبان بنانے کے لیے ٹریننگ سنٹر قائم کیے گئے جہاں اردو میں دفتری کارروائی کی تربیت کا انتظام کیا گیا۔ اسی ضمن میں ٹائپ رائٹروں کے اردو حروف تہجی، کی ٹائپ رائٹر لوح بنوائی گئی اور اردو ہی میں شارٹ ہینڈ (مختصر نویسی) اور ٹائپ کاری کی تربیت بھی دی گئی۔ سیکرٹریٹ ٹریننگ سنٹر میں اردو دفتری زبان کے تربیتی کورسوں کا انتظام بھی کیا گیا اور دفاتر کے عملےمیں اردو دفتری زبان کے استعمال کے لیے موافق ماحول اور افراد کی مناسب تعداد کا حصول ممکن ہوا۔ شرعی عدالتوں میں بیانات مقدمہ، دلائل اور استدلال، جرح اور جواب جرح اور عدالتی فیصلے اردو زبان میں لکھے گئے۔ پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں اردو کو لازمی پرچے کے طور پر شامل کرکے انٹرویو میں بھی مناسب حد تک اردو زبان کو شریک کیا گیا۔ حکومت کے گزٹ کو جریدہ کی متبادل اصطلاح دی گئی لیکن گزٹ کا لفظ زیادہ مقبول رہا۔ نوٹیفیکیشن اردو میں ترجمہ کیے گئے اور دفتری قواعد و ضوابط اور قوانین کے ترجمے بھی اردو میں کیے گئے جنھیں شائع کیا گیا۔

دفتری زبان کی قومی تحریک کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو ہر اعتبار سے قومیت کی تشکیل اور قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشاں رہی ہے حکومتوں نے بھی اردو کو دفتری زبان بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ اس ضمن میں حکومت پنجاب کے اقدامات کا تذکرہ قابل توجہ ہے۔ حکومت پنجاب نے وقتاً فوقتاً اردو کو بہ طور دفتری زبان اختیار کرنے کے سلسلے میں ہدایات جاری کیں کہ لوگوں کی طرف سے جو مراسلے اور درخواستیں اردو میں موصول ہوں ان کا جواب حتی

الامکان اردو میں دیا جائے۔ عوام کے استعمال میں آنے والے تمام فارم اردو میں شائع کیے جائیں۔ سول سیکرٹریٹ کے شعبہ شکایات میں تمام کارروائی اردو ہی میں ہو۔ افسروں کے نام اور عہدوں کے سائن بورڈ اردو میں بھی لکھوائے جائیں۔ محکمہ تعلقات عامہ کی تمام تقریبات کے لیے دعوت نامے اردو میں طبع کرائے جائیں۔ حکومت کے تمام اجلاسوں کی روداد ممکنہ حد تک اردو میں تحریر کی جائے۔ سرکاری محکمے اپنے افسروں اور اہلکاروں کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے دفتری زبان کورس کے لیے نامزد کریں جہاں شرکاء کو مراسلت اور مراسلہ نگاری کی تربیت دی جاتی ہے۔ ۴ جولائی ۱۹۷۹ء کو حکومت پنجاب نے احکامات جاری کیے کہ سرکاری محکموں کے سربراہاں فائلوں پر نوٹنگ (کیفیت نگاری) اردو میں کریں تاکہ ماتحت عملہ ان کی پیروی میں اردو کو ذریعۂ اظہار بنائے اور سرکاری گزٹ میں عام اہمیت کے اعلانات اور تقرری و تعیناتی سے متعلق احکام زیادہ سے زیادہ اردو میں شائع کیے جائیں۔ مئی ۱۹۸۱ء میں حکومت پنجاب نے ہدایات دیں کہ صوبے میں منعقد ہونے والی تمام سرکاری تقریبات میں صرف اردو ہی کو ذریعۂ اظہار بنایا جائے اور صوبائی گورنر اور صوبائی کابینہ کو جو بھی خلاصے ضروری غور و فکر یا احکام کے لیے بھیجے جائیں وہ اردو میں تحریر کیے جائیں۔ دفتری زبان کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرنے کے لیے صدر مملکت نے اردو ہی میں خطاب کرنے کی روایت قائم کی اور قومی تقریبات میں اردو زبان ہی کو سرکاری زبان کا مقام دیا۔ تقریب اعزازات کے موقع پر اعزاز یافتہ افراد کے پس منظر کی روداد کے لیے بھی اردو زبان کو استعمال کیا گیا اور تقریب کے وقت اردو متن ہی کو پڑھنے کی روایت قائم ہوئی۔ تعلیمی اداروں میں تقسیم اسناد کے موقع پر ساری کارروائی کے لیے اردو ہی کے استعمال کو مقدم گردانا گیا اور کالجوں کے پراسپکٹس اور داخلہ فارم اردو ہی میں شائع کیے گئے۔ اسی سلسلے میں درخواستوں کو اردو ہی میں تحریر کرنےکی ہدایت کی گئی۔ دفاتر کی زبان کو قومی زبان میں بدلنے کے اس عمل میں سول سروس اکیڈمی اور دوسرے تربیتی اداروں میں "دفتری اردو" کے موضوع پر لیکچروں کا انتظام بھی کیا گیا تاکہ دفتری اردو کے ضمن میں دشواریوں کا علم ممکن ہو اور مختلف کیڈر کے افسروں کے ردعمل کا بھی ادراک ہوسکے۔ تاہم اس ہمہ گیر عمل کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی نمایاں ہوا کہ جب تک درس گاہوں کی علمی زبان انگریزی کی جگہ قومی زبان نہیں بنتی اس وقت تک دفاتر کی زبان میں قومی زبان کے لیے گنجائش ممکن نہیں ہو سکتی۔ درس گاہوں کی علمی زبان ذہنی مزاحمت کے رویوں کو پیدا کرتی ہے اور جب تک ذہنی رویوں کی مناسب سمت نمائی کا انتظام نہیں ہوتا۔ دفاتر کی

زبان کو قومی زبان میں بدلنے کا عمل تیز رفتار نہیں ہو سکتا۔

دفاتر کی زبان کو نچلی سطح سے اعلیٰ سطح تک قومی زبان میں بدلنے کی راہ میں یہ امر مانع نہیں ہے کہ اعلیٰ افسران یا حکومت کے پالیسی ساز اداروں کے سربراہ اردو زبان سے ناآشنا ہیں۔ آزادی کے بعد اعلیٰ سطح کے ایسے افسران بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں جو اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ فرداً فرداً کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اردو کے دفتری زبان بننے کی مخالفت چاہتا ہو۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز افسران بھی اچھی اردو میں گفتگو کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ تاہم اس ضمن میں دشواری غالباً یہی ہے کہ اعلیٰ سطح کی دفتری کارروائی کے بارے میں اردو کے استعمال کا دفاتر کو تجربہ نہیں ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آزادی سے قبل اردو کو دفتری ضرورتوں کے لیے اعلیٰ سطح پر آزمانے کی کوئی روایت ہی موجود نہیں ہے۔ آزادی سے قبل برطانوی ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست حیدر آباد دکن میں اردو سرکاری زبان کے فرائض انجام دیتی تھی اور علمی زبان کے طور پر عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم بھی تھی۔ ریاست حیدرآباد اپنے امور خارجہ کے لیے انگریزی زبان کا استعمال کرتی تھی۔ اس اعتبار سے برصغیر کی خوش حال ترین مسلم ریاست (حیدرآباد دکن) کے انتظامی ماڈل کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو کیفیت اس ریاست کی اپنے دور اقتدار میں تھی اسی کیفیت کو مملکت پاکستان کے انتظامی اور دفتری امور کے لیے بخوبی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے اور اردو زبان کو دفاتر کی زبان کے طور پر کامیابی کے ساتھ نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ حضور نظام کی حکومت کے اعلیٰ افسران انگریزی سے بھی اسی طرح آشنا تھے جیسے وہ اردو زبان سے آشنا تھے اور ان کا برطانوی حکومت کے افسروں کے ساتھ برابری کا حق بھی تسلیم شدہ تھا۔ وہ افسران اپنے عہد کے قابل احترام خطابات کے حامل بھی تھے اور مقام و افتخار کے معاشرتی تقاضوں کے مطابق ان کا شمار اونچے لوگوں میں ہوتا تھا۔ تاہم ایسے معاشرتی پس منظر کے باوجود (جو ان کی بڑائی کی نشاندہی کرتا ہے) وہ اپنے اعلیٰ دفاتر اور عہدوں کے معاملات کے لیے اردو ہی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرنے کے پابند تھے اور اردو کا استعمال کرتے تھے۔

تاہم اس سلسلے میں جب اردو کو ہر سطح پر دفاتر کی زبان بنانے کا سوال سامنے آتا ہے، یہ بات بھی دہرائی جاتی ہے کہ ایسا کرنے سے بین الاقوامی خط و کتابت اور رابطے کی راہ میں دشواریاں رونما ہوسکتی ہیں۔ عہد حاضر میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی بین الاقوامی زبان کا استعمال نہ کرتا ہو۔ اس لیے ہر ملک میں بین الاقوامی زبانوں کی تدریس کا مناسب انتظام بھی موجود ہے۔

ہمارے تعلیمی نظام میں یہ ضرورت انگریزی زبان کی تدریس پوری کرتی ہے۔ اس لیے اردو زبان کو دفاتر کی زبان بنانے سے یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکل سکتا کہ انگریزی کا استعمال کلیتاً ختم ہو سکتا ہے اور غالباً پوری طرح موقوف ہو جائے گا۔ بین الاقوامی رابطے کے لیے انگریزی کا استعمال بھی قومی مقاصد کی تکمیل کرتا ہے اور بین الاقوامی تناظر میں قومیت ہی کی تشکیل کرتا ہے۔ تاہم مملکت کے داخلی کاروبار کے لیے دفاتر کی زبان کو اردو میں بدلنا کسی طرح متنازعہ ثابت نہیں ہوتا۔ ------ فرانس میں دفاتر کی زبان نہ تو انگریزی ہے اور نہ جرمن زبان ہے۔ اسی طرح آئرش ری پبلک میں کاروبار آئرش میں ہوتا ہے لیکن بین الاقوامی رابطے کے لیے دوسری زبانوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔

اردو کو دفاتر کی زبان بنانے کی راہ میں جو تکنیکی اور اصطلاحی دشواریاں حائل دکھائی دیتی رہی ہیں ان پر حکومت کی کوششوں سے بڑی حد تک قابو پا لیا گیا ہے اور دفاتر کی کارگزاری کے نظام کو چلانے کے لیے مناسب مترادفات اور اصطلاحیں بھی مرتب کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں ان مترادفات اور اصطلاحوں کے بارے میں بعض اعتراضات اپنی ابتدائی صورت میں محض علمی نوعیت کے دکھائی دیتے ہیں۔ سب سے بڑا اعتراض ان کا غیر مانوس ہونا ہے۔ ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ مترادفات (بعض صورتوں میں) ثقیل ناقابل فہم اور ادائیگی کے طور پر دشوار اور مشکل بھی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے کہ عام فہم انگریزی اصطلاح ہی کو بلاوجہ رد کرنابھی معقول نہیں ہے۔ ایسے اعتراضات صرف اس وقت رفع کیے جا سکتے ہیں۔ جب نئی اصطلاحوں اور مترادفات کو دفاتر کے معاملات اور کاروبار میں شامل کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان کو نافذ کرنے کے بعد ترامیم اور رد و بدل کی کیا صورت سامنے آسکتی ہے۔ اردو زبان کو دفاتر کی سرکاری زبان کی ذمہ داری سونپنے سے قبل اردو زبان کی کارگزاری اور افادیت واضح نہیں ہو سکتی۔

ان اعتراضات کے برعکس دفتری زبان بدلنے کی تحریک کے حق میں کام کرنے والوں کی عمومی رائے کچھ ایسی رہی ہے کہ غالباً دفاتر کے اعلیٰ عہدہ دار انگریزی کے جانبدار زیادہ ہیں اور اردو کے بارے میں شاید ان کی "نیت" اچھی نہیں ہے۔ ایسی رائے کو اخلاقیات کے دائرے میں شریک کرنا درست دکھائی نہیں دیتا کیوں کہ دفاتر کی زبان کے بدلنے سے اصولی طور پر نفسیاتی مزاحمت کے رویے ظاہر ہوسکتے ہیں۔ ان رویوں کو دفتری کارگزاری سلیقے اور طریق کار اور ذہنی عادت کے ساتھ منسوب بھی کیا جا سکتا ہے۔ تاہم آزادی کے بعد یہ امر بھی سامنے آیا ہے کہ قومیت کے عمل سے افراد (اور اہلکار) کی ذہنی نشوونما اور تربیت بھی ممکن ہوئی ہے اور ۱۹۴۷ء کے بعد کم از کم تین نسلوں کے افراد دفاتر کے مختلف زینوں

پر کام کر چکے ہیں اور برابر کام کر رہے ہیں اور اس عہد میں جس پود کے عہدے دار دفاتر کی کارگزاری میں شریک ہیں ان کا رویہ غالباً کسی طرح بھی نفسیاتی مزاحمت کا نہیں ہے کیوں کہ سول سروس کے امتحان کے بعد جو افراد دفاتر کی سربراہی کے لیے منتخب ہوتے رہے ہیں اور ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق درمیانے طبقے سے ہے اور وہ اردو سکولوں کے پڑھے ہوئے ہیں۔ اس لیے دفاتر کی زبان کے بارے میں ان کا رویہ صرف اس حد تک دفتری روایت کی جانبداری کر سکتا ہےکہ اردو زبان کے آجانے سے ممکن ہے دفتری کارگزاری متاثر ہو اور دفتری معاملات میں ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہو۔ موجودہ حالات میں انگریزی اصطلاحوں کے مانوس، قابل فہم اور طے شدہ معانی دفتری کارگزاری کے عمل کی رفتار متعین کرتے ہیں۔ ہر اصطلاح ایک مشترکہ معانی، مفہوم، تشریح اور استناد کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے اور انہی معانی کے ساتھ کسی کیس کے حسن و قبح کو، اور عہدہ دار اور محکمے کی زیادتی کو عدالتوں میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ عدالتوں میں بھی انگریزی اصطلاحوں کے مافیہ پر بحث اور استدلال سے انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس لیے نئی اصطلاحوں کے آ جانے سے "معانی" کے بارے میں دشواریاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں اور دفتری معاملات کی کارگزاری پر منفی اثر پڑ سکتا ہے۔ ----- یہ صورتحال اصطلاحوں کے استناد کو بہت اہم گردانتی ہے۔ تاہم اردو زبان کو دفاتر میں رائج کیے بغیر ان مسائل کی توجیہہ ممکن نہیں ہوسکتی۔ محکمانہ قواعد و ضوابط، اور دفاتر کا طریق کار بھی ایک طویل مدت کے تجربے سے اخذ ہوئے ہیں۔ انگریزی اصطلاحوں کے معانی کو بھی ایک طویل مدت کی مشق نے راسخ کیا ہے۔ اس لیے دفاتر کی زبان میں مضمر دشواریوں کو اس وقت ہی ہمدردانہ طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب دفاتر میں انگریزی کی بجائے اردو کا استعمال ہو اور اس زبان کو دفاتر کی جملہ کارگزاریوں میں شریک کیا جائے۔

لیکن اس سلسلے میں ایک اور سوال بھی قابل غور دکھائی دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا ڈیڑھ سو برس کی دفتری روایت کو (زبان کے اعتبار سے) فوری طور پر بدلا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا ایک جواب (جو منفی نوعیت کا ہے) یہ ہے کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو فوری طور پر فارسی کی بجائے انگریزی نافذ کر سکتی ہے جب انگریزی جاننے والوں کی تعداد بے حد کم تھی تو پاکستان میں دفاتر کی زبان کو اردو میں بدلنے کی راہ میں کیا امر مانع ہے جب اردو جاننے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے اور جب اردو مملکت کی قومی زبان بھی ہے؟ ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگریزی کو اس لیے دفتری زبان بنایا تھا کہ کمپنی کے پاس فارسی جاننے والے بہت کم تھے اور انگریز افسر کو فارسی پڑھنا پڑتی تھی جسے

مغلیہ سلطنت کے انحطاط کی بناء پر انگریز افسر ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ولیم بنٹنک کے زمانے میں انگریز برصغیر کو اپنی مملکت تصور کرنے لگے تھے اور اپنے نسلی تفوق کو اپنی زبان کے ذریعے ظاہر کرنے کے خواہشمند تھے۔ دفتری زبان کے فیصلے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ انگریزی کی مدد سے برصغیر کے حالات کو آسانی سے سمجھ سکتے تھےاس لیے حقائق کو معتبر طور پر حل بھی کرسکتے تھے۔ ----- ظاہر ہے کہ پاکستان میں ایسی صورت حال نہیں ہے۔ دفاتر کی زبان کا مسئلہ اس اعتبار سے قابل عمل طریق کار کا مسئلہ ہے کہ دفاتر میں قومی زبان کو سرکاری زبان کے طور سے کیسے نافذ کیا جا سکتا ہے؟ قومیت کی تشکیل کے لیے دفتری زبان کا طریق کار جس قدر آسان اور مرحلہ وار ہو وہ اسی قدر مفید اور باثمر ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس طریق کار کو مرحلہ وار صوبائی سکرٹریٹ میں آزمایا جا سکتا ہے اور باقاعدگی سے بالائی سطح تک دفتری زبان کا دائرہ وسیع کیا جا سکتا ہے۔ تاہم دفاتر کی زبان بدلنے کے لیے حکومت کی پالیسی کا غیر مبہم ہونا بھی ضروری ہے اور دفتری زبان کے بارے میں اس پالیسی کی نگہداری بھی لازمی ہے۔ اردو کو دفاتر کی زبان بنانے سے قومیت کی تشکیل کے مقاصد بھی پورے ہو سکتے ہیں اور انگریزی زبان کے سرکاری زبان ہونے کی بناء پر جو خلیج اعلیٰ افسروں اور معاشرے کے مابین ہے وہ بھی عبور کی جا سکتی ہے۔ اردو کا دفتری اور سرکاری زبان کے طور پر رواج پانا قومیت کی تشکیل اور استحکام کے لیے بے حد اہم ہے اور ایسے فیصلے پر عمل درآمد کرنا تاریخی اعتبار سے کسی طرح غیرمناسب بھی نہیں ہے۔

۱۷۔ نفاذ اردو کی تحریک

اس امر کے باوجود کہ مملکت پاکستان کے لیے قومی زبان (اردو) اور قومیت کی تشکیل کا باہمی رشتہ کسی اختلاف کا سبب نہ تھا تاہم گزشتہ کئی برسوں کے دوران اسی مسئلہ پر حالات سنگین صورتوں سے دو چار ہوتے رہے اور زبان کے مسئلے نے نہایت غیر ضروری تضادات کو نمایاں کیا۔ تحریک آزادی کے دوران اردو زبان سارے مسلمانوں کی مشترکہ تہذیبی زبان کے طور پر ایک طے شدہ صداقت بن چکی تھی۔ بنگال اور سندھ کے مسلمانوں نے اس زبان کی بھرپور حمایت کی تھی اور ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں اردو ہی کو اپنی زبان کے طور پر چنا تھا حالانکہ برصغیر کے مسلم گھرانوں میں علاقائی زبانیں بھی بولی جاتی تھیں۔ اس لیے جب ۱۹۴۷ء میں مملکت پاکستان وجود میں آئی تو زبان کے بارے میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ حکومت پاکستان اس اجتماعی اور تاریخی حقیقت سے کسی طرح بے تعلق نہیں تھی۔ لیکن قیام وطن کے ایک ہی برس کے بعد زبان کے مسئلے نے غیر متوقع صورت اختیار کر لی اور مشرقی پاکستان میں بلاوجہ بنگالی زبان کی اہمیت کا سوال رونما ہوا۔ مشرقی پاکستان جو بنگالی مسلمانوں کے ووٹ اور مطالبے کے نتیجے میں آزاد پاکستان کی شکل میں رونما ہوا تھا کئی اعتبار سے ہندو بنگالیوں کے زیراثر تھا اور اس صوبے کے تعلیمی نظام پر تعلیم یافتہ ہندو قوم پرست افراد کی اجارہ داری تھی، جو بنگالی زبان کو اپنی تہذیبی زبان قرار دیتے تھے۔ تاریخی طور پر ناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی بنگالی زبان ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں پیدا ہوئی تھی۔ پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) کے کئی برس بعد تک بنگالی کا رسم الخط فارسی تھا، جو بنگال میں مسلم اقتدار کا مظہر تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے پہلے بیس برسوں کے دوران راجہ رام موہن رائے اور دوسرے بنگالیوں نے جو انگریزی تعلیم حاصل کر چکے تھے، اپنی زبان کے لیے ناگری رسم الخط ایجاد کیا اور اس طرح بنگالی زبان کو ہندو تشخص دینے کی کوشش کی۔ اس طرز عمل کے نتیجے میں بنگالی زبان نے جس ادب کو پیدا کیا اس میں ہندو تعلیم یافتہ قوم پرست افراد نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بنگالی ناول نے خاص طور پر مسلم اقتدار کو اپنی تضحیک و تنقید کا موضوع بنایا۔ بیسویں صدی میں ٹیگور بنگالی ادب کی علامت تھا۔ قاضی نذر الاسلام نے بھی بنگالی زبان کو اپنے تخلیقی اظہار کے لیے استعمال کیا اور اپنے لیے بنگالی ادب میں مقام پیدا کیا لیکن ایسی انفرادی شرکت کے باوجود بنگالی ادب اور زبان کا مزاج ہندو قوم

پرستی ہی سے برابر متاثر رہا۔ تحریک آزادی کے دوران جب ابھی بہار اور یوپی سے مسلمانوں نے مشرقی پاکستان کے علاقوں میں ہجرت نہیں کی تھی، مسلمان بنگالیوں نے اردو ہی کے حق میں اکثر و بیشتر اظہار کیا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد اور ایک ہی برس کے اندر مشرقی پاکستان کے لسانی رویے نے جو تشویش ناک صورت اختیار کی وہ خلاف توقع تھی۔ لسانی رویے کی اس تبدیلی کے مضمرات سیاسی تھے جو مائیکرو پالٹکس کی ذیل میں آتے ہیں۔ اقتدار کی کشمکش کو انسانی جبلتوں کی سطح پر رونما کرنا یقیناً قومی اخلاقیات کی نفی کے مترادف ہے لیکن بدقسمتی سے ایسی ہی کیفیت ظاہر ہوئی اور زبان کا مسئلہ تضادات اور تفریق کا نشانہ بنتا گیا۔ ایسی صورت حال کے نتیجے میں دو قومی زبانوں کا تصور رونما ہوا۔ رومن رسم الخط کے بارے میں سنجیدگی سے غور ہوا۔ بالاخر اسی صورت حال نے قومیت کی تشکیل کے تصور کو سقوط ڈھاکہ کے سانحے سے دو چار کیا۔ ----- قومیت کی تشکیل کے ضمن میں یہ اذیت ناک سانحہ ایسا ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

قیام پاکستان کے کچھ ماہ بعد کراچی میں (جو اس وقت پاکستان کا دارالحکومت تھا) ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو کل پاکستان تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی جو پہلی دسمبر تک جاری رہی۔ اس میں زبان (قومی زبان - اردو) کا مسئلہ سرفہرست تھا۔ اس کانفرنس کے صدر جناب فضل الرحمٰن تھے جو مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم تھے اور جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں وحدت قومی کے لیے اردو زبان کی اہمیت کا پر زور انداز میں ذکر کیا اور اردو کے بین الصوبائی کردار کو قومیت کی تشکیل کے لیے لازمی قرار دیا۔ پاکستان کی اس پہلی تعلیمی کانفرنس میں مختلف صوبوں اور مختلف علاقائی زبانوں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی اور سب کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ اردو کو ہر شعبۂ تعلیم میں لازمی زبان قرار دیا جائے اور تعلیمی ترقی کی رفتار کے ساتھ بتدریج اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ کانفرنس کے اختتام پر قرار داد منظور کی گئی کہ اردو کو قومی زبان کے طور پر تسلیم کیا جائے اور اسے قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔

اس تعلیمی کانفرنس کے انعقاد کے بعد لاہور میں ۲۸ مارچ ۱۹۴۸ء کو پاکستان کی پہلی اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس کے محرک ڈاکٹر عمر حیات ملک (وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) اور ڈاکٹر سید عبداللہ تھے۔ اس کانفرنس میں تعلیمی اداروں، علمی و ادبی حلقوں اور حکومت پاکستان کے نمائندوں اور وزیروں

نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں قراردادوں کے ذریعے طے پایا کہ،

۱۔ حسب امکان اردو زبان کو انگریزی زبان کی بجائے ذریعۂ تعلیم و امتحانات قرار دیا جائے۔

۲۔ زیادہ سے زیادہ چار سال کے عرصے میں اردو کو وہی مقام دیا جائے جو اس وقت انگریزی کو حاصل ہے اور

۳۔ عبوری دور میں دسویں جماعت تک اردو کو لازمی مضمون قرار دیا جائے اور ایف اے اور بی۔ اے میں اردو کو اختیاری مضامین میں فوراً شامل کیا جائے۔

۴۔ ایم ۔ اے کے امتحان کے لیے اردو کو ایک مضمون قرار دیا جائے اور ایم اے اردو کا پہلا امتحان ۱۹۵۰ء میں لیا جائے۔

۵۔ اردو رسم الخط اور ٹائپ کی اصلاح اور تکمیل کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ایک مکمل اور جامع سکیم پیش کرے۔

اس تعلیمی کانفرنس میں صوبائی حکومتوں اور وفاقی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ تمام دفتروں، عدالتوں اور حکومت کے دوسرے اداروں میں جملہ کارروائی کے لیے اردو کا استعمال کیا جائے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے کم از کم عارضی طور پر ایک محکمۂ اردو کا قیام عمل میں لایا جائے جو تمام محکموں میں ایسی تبدیلی کو جلد تر لانے کی تدابیر اختیار کرے۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کے لیے مقابلے کے امتحانات میں اردو کو انگریزی کی طرح لازمی مضمون قرار دیا جائے اور بیرونی ممالک خاص طور پر اسلامی ملکوں کی یونیورسٹیوں میں اردو کی تدریس کے انتظام کے لیے عملی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اسی کانفرنس میں اردو انسائیکلوپیڈیا کی تدوین کے لیے بھی قرار داد منظور کی گئی تاکہ اردو زبان کی معرفت معلومات علمی تک براہ راست رسائی ممکن ہوسکے۔

آزادی سے قبل پنجاب یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم اور امتحانات کے ضمن میں جو فضا موجود تھی وہ انگریزی کی جگہ اردو، ہندی اور گورمکھی کو ذریعۂ تعلیم و امتحانات بنانے کے حق میں تھی۔ ایسے رویے زبانوں کو کمیونل زاویے سے دیکھتے تھے۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان، ہندی کو ہندوؤں کی زبان اور گورمکھی (پنجابی) کو سکھوں کی زبان گردانا جاتا تھا۔ ۱۹۳۳ء کی اینڈرسن ایجوکیشن رپورٹ میں انگریزی کی بجائے ان زبانوں کے نفاذ کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ تاہم ۱۹۴۷ء سے قبل جتنے بھی امتحانات ہوئے تھے ان میں اردو زبان کو استعمال کرنے والے امیدواروں کی تعداد کثرت میں تھی۔ چوں کہ پنجاب یونیورسٹی میں پہلے ہی

سے ذریعۂ تعلیم و امتحانات کے بارے میں فضا موجود تھی اس لیے تعلیمی کانفرنس اور اردو کانفرنس کے بہت جلد بعد یونیورسٹی نے میٹرک کے امتحان میں انگریزی کے سوا باقی سب مضامین میں اردو کو ذریعۂ امتحان بنانے کا اختیار دے دیا اور ۱۹۵۲ء میں اردو کو میٹرک میں لازمی ذریعۂ امتحان بنا دیا گیا۔ البتہ یورپین سکولوں اور غیر ملکی طلبہ کو ۱۹۵۴ء تک انگریزی کے ذریعۂ امتحان کو استعمال کرنے کا اختیار دیا گیا۔ ان اقدامات کے نتیجے میں دسویں جماعت میں مقررہ مدت کے اندر اردو کو لازمی مضمون کا مقام حاصل ہوا۔ اور ایف اے اور بی اے میں بھی اردو آپشنل کی بجائے اختیاری مضمون قرار پائی۔ اردو ایم اے کی تدریس کے لیے کلاسوں کا آغاز اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ہوا اور پہلا امتحان ۱۹۵۰ء میں لیا گیا۔ حکومت پنجاب نے ۱۹۴۹ء کے دسمبر میں مجلس دفتری زبان کے قیام کے منظوری دی جس کے ذمے دفتری زبان کی تبدیلی کے لیے مناسب تدابیر اور ضروری تیاری کے مراحل قرار پائے۔ ۱۹۵۰ء میں انسائیکلوپیڈیا کی تدوین کے لیے دائرۂ معارف اسلامیہ کا شعبہ قائم کیا گیا جس نے گزشتہ برسوں کے دوران اس کام کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔

اس دوران جب کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کے انعقاد کے بعد پہلی اردو کانفرنس منعقد ہونے کو تھی، مشرقی پاکستان میں اختلافی رویے رونما ہوئے اور ایک ہیجانی کیفیت ظاہرہوئی جو بنگلہ زبان کے بارے میں تھی۔ یہ کیفیت ان سیاست دانوں کی پیدا کردہ بھی تھی جو ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کے مقابلے میں ہار چکے تھے۔ ان سیاست دانوں کے ساتھ ہندو بنگالیوں کا وہ گروہ بھی شامل تھا جو کانگرس کے ساتھ تھا اور مطالبۂ پاکستان کا مخالف تھا۔ ایسی صورت حال میں وہ ترقی پسند دانشور بھی شریک تھے جو تحریک پاکستان کو ضرر پہنچانے میں پیش پیش بھی تھے۔ زبان کے سوال پر ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہنگامہ آرائی ہوئی اور چند نوجوانوں نے (کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کی قرار دادوں کے برعکس) بنگلہ زبان کے حق میں جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے قائداعظم نے ڈھاکہ کا سفر کیا اور ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے جلسۂ عام میں تقریر کے دوران کہا۔ -----

"میں آپ کو صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ جہاں تک آپ کی بنگالی زبان کا تعلق ہے اس افواہ میں کوئی سچائی نہیں ہے کہ کسی طرح بنگالی زبان پر کوئی پریشان کن اثر پڑنے والا ہے۔ یہ صوبے کے لوگوں ہی کا حق ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ صوبے کی زبان کیا ہوگی؟ تاہم میں یہ واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو

ہوگی۔ جو کوئی آپ کو گمراہ کرنےکی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم متحد نہیں رہ سکتی اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ پس جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے وہ اردو ہی ہوگی۔ -----"

۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کی کانووکیشن میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا------

"اردو وہ زبان ہے جسے برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے پرورش کیا ہے۔ اسے پاکستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو دوسری صوبائی اور علاقائی زبانوں کے مقابلے میں اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات کے بہترین سرمائے پر مشتمل ہے اور دوسرے اسلامی ملکوں کی زبان سے قریب ترین ہے اور یہ بات بھی اردو کے حق میں جاتی ہے اور یہ بات بے حد اہم ہے کہ بھارت نے اردو کو اپنے ملک سے جلاوطن کر دیا ہے حتیٰ کہ اردو رسم الخط کو بھی ممنوع قرار دے دیا ہے۔ ------- اس لیے پاکستان کی سرکاری زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان رابطے اور افہام و تفہیم کا ذریعہ بن سکتی ہے صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اردو ہے اردو کے سوا اور کوئی زبان نہیں ہے۔ ----- اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہو کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہی ہوسکتی ہے اور وہ میری ذاتی رائے میں اردو اور صرف اردو ہے۔ -----"

ڈھاکہ یونیورسٹی کی اس تقریر میں قائداعظم کا اپنی ذاتی رائے کی جانب اشارہ کرنا غور طلب ہے۔ گزشتہ چالیس برسوں کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈھاکہ یونیورسٹی کی یہ تقریر کئی اعتبار سے معنی خیز ہے۔ اس تقریر کے مافی الضمیر میں زبان کے مسئلے کے پیچھے اس تاریخی شعور کی نشاندہی بھی ممکن ہے جو برصغیر کئے مسلمانوں کی تحریک آزادی کو توانائی اور قوت فراہم کرتا تھا۔ جس کے بغیر ہندو اکثریت کے برصغیر میں مسلمانوں کے حق خودارادیت کا تکمیل پانا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ تاہم حالات کی ستم ظریفی کا کیساعالم تھا کہ مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کے فوراً بعد ہی ایسا رویہ نمایاں ہوا جو مسلمانوں کے تاریخی شعور اوراجتماعی ملی وحدت کی ظالمانہ حدتک نفی کرتا تھا۔ برصغیر کے دستوری عمل کے ماہرین سے یہ امر بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ قائداعظم کی بصیرت اور رہنمائی کے بغیر مسلمانوں پر وہ وقت آسکتا تھا جس

میں وہ اپنے معدوم ہو جانے کے سانحے سے دو چار ہوسکتے تھے۔ تاریخ کے طالب علموں سے بھی یہ بات کسی طرح چھپی نہیں ہے کہ مملکت پاکستان کا قیام صرف ایک واحد فرد کا کرشمہ تھا۔ ایسے پس منظر میں جب قائداعظم نے اردو کو سرکاری اور قومی زبان بنائے جانے کی پوری طرح وضاحت کرنے کے بعد زبان کے مسئلے کو اپنی ذاتی رائے قرار دیا تو ایک طرف اس کا نفسیاتی جواز تھا کہ کس حد تک ایک آزاد مملکت کو حاصل کرنےکے بعد اس مملکت کے لوگ اس قائد کی رائے کا احترام کر سکتے ہیں جس نے کروڑوں انسانوں کو اور ان کی آنے والی نسلوں کو آزادی سے ہمکنار کیا تھا۔ بیسویں صدی کے دوران ڈی ولیرا سے کہیں زیادہ دشوار جدوجہد قائداعظم کی تھی۔ لیکن ڈی ولیرا کے آئرلینڈ نے جدو جہد آزادی کے مقاصد کو اس طرح نظر انداز نہیں کیا جس طرح ۱۹۴۸ء میں بنگلہ زبان کے مسلمان حامی نظر انداز کرنے کے مرتکب ہوئے تھے۔ تاہم قائداعظم کے اس جملے کا دوسرا پہلو دستوری اور آئینی بھی تھا کہ قومی زبان کا فیصلہ دستور ساز اسمبلی کرے اور اسمبلی کی وساطت سےمملکت پاکستان کے لوگ اس فیصلے میں شرکت اختیار کریں۔ زبان کا فیصلہ تاریخی اعتبار سے اردو کے حق میں فیصلہ تھا لیکن دستوری انداز میں اس فیصلے کی تصدیق کے لیے جمہوری طریق کار ضروری تھا۔ حکومت پاکستان اپنی تاریخی ذمہ داریوں کےپیش نظر اردو زبان ہی کے حق میں تھی اور اسے قومی زبان اور سرکاری زبان بنانے کی پوری طرح آرزو مند تھی۔ قیام پاکستان کے بعد لوگ، حکومت اور ادارے ...... سب اردو ہی کو یہ منصب دینے پر متفق تھے لیکن دشواری طریق کار اور لائحہ عمل سے متعلق تھی۔ اس اعتبار سے نفاذ اردو کی تحریک دراصل طریق کار اور لائحہ عمل کی تحریک تھی۔ اصولی طور پر اردو کے قومی اور سرکاری زبان کے منصب پر مکمل اتفاق رائے تھا۔

اردو کانفرنس (۱۹۴۸ء) کے بعد ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کمیشن کو سرعبدالرشید کی قیادت میں تشکیل دیا گیا جس میں ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کا مسئلہ خاص طور پر نمایاں تھا۔ رشید کمیشن نے مئی ۱۹۵۲ء میں اپنی رپورٹ حکومت پنجاب کو پیش کی۔ اس کا موقف تھا کہ انگریزی کی جگہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ اس کمیشن نے سفارش کی کہ اردو کو فوری طور پر میٹرک کے تمام مضامین میں ذریعۂ تعلیم بنا دیا جائے۔ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر آرٹس کے مضامین کے اساتذہ کو انگریزی یا اردو میں تدریس کا اور امیدواروں کو امتحانی جوابات اردو میں لکھنے کا اختیار دے دیا جائے اور پانچ سال بعد (مئی ۱۹۵۷ء) دوبارہ صورت حال کا جائزہ لیا جائے۔ کمیشن نے بی اے میں ایسی تبدیلی کو قبل از وقت تصور کیا تھا۔ کمیشن کی رائے تھی کہ نیچرل

سائنس کے مضامین کے لیے انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کی سطح پر مزید سات برسوں (مئی ۱۹۵۹ء) کے لیے انگریزی کے ذریعۂ تعلیم کو برابر بحال رکھا جائے اور پروفیشنل کالجوں میں بھی ذریعۂ تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے۔ سات سال بعد (۱۹۵۹ء) ذریعۂ تعلیم کے مسئلے پر دوبارہ غور کیا جائے کہ ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی سے کیا کامیابی ہوئی ہے؟ اور اس کے دائرے کو مزید کیسے وسیع کیا جا سکتا ہے؟ اس دوران حکومت کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ ایسی کمیٹیاں بنائے جو علمی اصطلاحات وضع کریں اور مختلف علوم پر کتابوں کی تصنیف و تالیف کا انتظام کریں۔ اسی دوران جب پنجاب میں رشید کمیشن کے قیام کی تیاریاں ہو رہی تھیں کراچی میں انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام ۱۹۵۱ءمیں اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حکومت کے نمائندوں اور علمی اداروں کے مندوبین نے شرکت کی۔ کراچی کی اردو کانفرنس (۱۹۵۱ء) میں اردو کے قومی اور سرکاری منصب کا ایک بار پھر ذکر ہوا اور حکومت نے بھی اس عہد کو دہرایا کہ پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اردو ہے اور اردو رہے گی۔ کانفرنس کے بعد انجمن ترقی اردو نے کراچی میں اردو کالج قائم کیا جس میں اردو ذریعۂ تعلیم تھی۔ اس کالج کے قیام سے یہ امر ثابت کرنا مقصود تھا کہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جا سکتا ہے اور یہ کہ اس زبان میں وہ ساری صلاحیتیں برابر موجود ہیں جو ذریعۂ تعلیم کے لیے لازمی ہوتی ہیں۔

اردو کے قومی اور سرکاری زبان بننے کے عملی مسائل طریق کار اور لائحہ عمل بھی اپنے ابتدائی مراحل ہی میں تھے کہ مملکت کی دستوری اور سیاسی زندگی میں پریشان کن حالات پیدا ہوئے اور سیاست کاری نے اقتدار پسندی کو مملکت کے معاملات میں شامل کرکے حالات اور واقعات کو مائیکرو پالٹیکس کا موضوع بنا دیا۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کو ختم کر دیا گیا۔ جو نئی دستور ساز اسمبلی وجود میں آئی اس نے ۱۹۵۶ء میں اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے آئین میں اردو اور بنگلہ زبان کو مملکت کی قومی زبانیں قرار دیا اور یہ طے کیا کہ آئین کے نفاذ (۱۹۵۶ء)کے بعد بیس سال کے عرصے تک (۱۹۷۶ءتک) انگریزی کو حسب سابق تمام سرکاری معاملات کے لیے برقرار رکھا جائے۔ اس آئین کو اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ختم کرکے مارشل لاء کا پہلا دور شروع ہوا۔ جس نے ۱۹۶۲ء میں ایک نیا آئین مرتب کیا جس میں ۱۹۵۶ء کے آئین کے اس فیصلے کو برقرار رکھا گیا جو قومی زبان اور انگریزی ذریعۂ تعلیم کے بارے میں کیا گیا تھا۔ اس دوران ۱۹۵۴ء میں سندھ، بلوچستان، پنجاب اور سرحد کو مغربی پاکستان کی انتظامی ذریعۂ تعلیم کے بارے میں ضم کر دیا گیا تھا۔ اس لیے ۱۹۵۶ء

کے آئین میں اور مارشل لاء کے دستور ۱۹٦٤ء میں جب دو زبانوں کا تصور دیا گیا تو اس سے یہی مراد تھا کہ مشرقی پاکستان کی قومی زبان بنگلہ ہے اور اردو صرف مغربی پاکستان کی قومی زبان ہے اور ان دونوں پر فوقیت حسب سابق انگریزی ہی کو حاصل ہے! تاہم ان زبانوں کی وسعت الفاظ کو ترقی دینے کے لیے جولائی ۱۹۵۸ء میں (مارشل لاء سے تین ماہ قبل) مرکزی وزارت تعلیم نے دو بورڈ قائم کیے۔ ایک کا نام ترقی اردو بورڈ تھا اور دوسرے کا کام بنگلہ زبان کو وسعت دینا تھا۔ ان دونوں بورڈوں کے ذمے اردو اور بنگلہ زبان کی لغات تیار کرنا قرار پایا۔

ان حالات میں قومی زبان (اردو) اور ذریعۂ تعلیم کے سلسلے میں قومی شعور کو بیدار کرنے کے لیے ذریعۂ تعلیم کانفرنس کے انعقاد پر غور ہوا جو بعض مخلص اہل علم کی کوششوں سے ۲۲ فروری ۱۹۵۹ء کو لاہور میں مغربی پاکستان اردو کانفرنس کے نام سے شروع ہوئی۔ یہ تیسری تعلیمی کانفرنس تھی جس میں اردو زبان کے مقام و منصب کے مسائل شامل تھے اور طریق کار اور لائحہ عمل کی دشواریوں کو حل کرنا مقصود تھا۔ اس کانفرنس میں علاقائی زبانوں اور بین الصوبائی زبان کی حدود کے تعین کا سوال بھی شامل تھا۔ یہ کانفرنس کچھ اس لیے بھی اہم تھی کہ ۱۹۵٦ء کے آئین نے جہاں بنگلہ زبان کو اردو زبان کے مقابلے میں دستوری تحفظ بہم پہنچا کر اس زبان کو تاریخی منطق کی نفی کرتے ہوئے قومی زبان کا درجہ دیا تھا وہیں مغربی پاکستان میں علاقائی زبانوں کے مسئلے کو نمایاں کر دیا تھا اور مختلف صوبوں کے رہنے والوں کے ذہن میں قومی زبان (اردو) اور علاقائی زبان کے بارے میں اندیشے پیدا کر دیے تھے۔

اس لیے ۱۹۵۹ء کی اردو کانفرنس میں علاقائی زبانوں کے نمائندوں کو بھی دعوت دی گئی اور انگریزی زبان کے اساتذہ کو بھی مدعو کیا گیا کہ سب مل کر لسانی مسئلے کا خاطر خواہ حل تلاش کر سکیں۔ اس کانفرنس میں مجلس زبان دفتری نے اپنی کارگزاری کی دس سالہ رپورٹ بھی پیش کی جسے سراہا گیا۔ ......
۱۹۵۸ء کے مارشل لاء نے کچھ ہی عرصے کے بعد قومی تعلیمی کمیشن قائم کیا جس کے ذمے قومی زبانوں اور ذریعۂ تعلیم کے بارے میں مسائل کا حل کرانا بھی تھا۔ اس کمیشن نے (۱۹٦۰ء) قومی زبانوں (اردو اور بنگلہ زبان) کی پرزور حمایت کی اور ان زبانوں کو انٹرمیڈیٹ تک پڑھانے کی سفارش کی۔ اردو ذریعۂ تعلیم کے بارے میں کمیشن کا رویہ ہمدردانہ تھا تاہم کمیشن نے اس امر کی وضاحت ضروری خیال کی کہ جب قومی زبانوں کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے تو یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ اس رویے سے انگریزی کی اہمیت کو نظر انداز کرنا مقصود ہے۔ تاہم کمیشن نے اس حقیقت کو ملحوظ رکھا کہ جہاں انگریزی زبان کو پوری اہمیت دی جائے وہیں

قومی زبانوں کو بتدریج انگریزی زبان کی جگہ ذریعہٴ تعلیم کا مقام دینا ضروری ہے۔ البتہ سائنس کے مضامین کے لیے انگریزی کو ثانوی زبان کے طور پر برقرار رکھنا نہ صرف مفید ہے بلکہ لازمی بھی ہے۔ قومی زبانوں کے بارےمیں کمیشن کی سفارشات یہ تھیں ۔[۱]

۱۔ اردو اور بنگلہ کو پاکستان کی سرکاری زبانیں بنانے کے لیے ترقی دی جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ان زبانوں کو ذریعہٴ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے۔
۲۔ اس مقصد کے مناسب طریق کار اختیار کیے جائیں۔
۳۔ اردو میں جذب اور استفادے کی بڑی قوت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسے کسی خاص معاشرتی طبقے کی زبان کی بجائے لوگوں کی زبان بنایا جائے تاکہ علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی اردو زبان کا جزو بن سکیں۔
۴۔ اردو اور علاقائی زبانوں کو قریب تر لانے کے لیے علاقائی زبانوں کے بورڈ تشکیل دیے جائیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔
۵۔ انگریزی زبان کو چھٹی جماعت سے بی اے تک لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے۔

اس تعلیمی کمیشن نے اپنی سفارشات میں ۱۹۵۹ء کی اردو کانفرنس کی قراردادوں کو شامل کرتے ہوئے اپنی سفارشات کے دائرے کو قومی اعتبار سے وسیع تر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ۔۔۔۔۔ ذریعہٴ تعلیم کے بارے میں اس کمیشن کی سفارشات حقیقت پسندانہ تھیں۔ کمیشن کی سفارشات تھیں کہ

۱۔ مغربی پاکستان میں پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک ذریعہٴ تعلیم اردو ہو۔ لیکن صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ میں اردو کا مضمون تیسری جماعت کے بعد لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے۔
۲۔ اردو چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک (سوائے صوبہ سندھ کے) مغربی پاکستان میں ہر جگہ لازمی ذریعہٴ تعلیم ہو۔
۳۔ صوبہ سندھ میں اردو زبان تیسری جماعت سے بارہویں جماعت تک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جائے۔
۴۔ انگریزی ذریعہٴ تعلیم کے سکولوں میں اردو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جائے۔
۵۔ گیارہویں اور بارہویں جماعتوں میں ذریعہٴ تعلیم (انگریزی/اردو) کے بارے میں انتخاب کا اختیار دیا جائے کہ طلبہ کس زبان میں تدریس چاہتے ہیں اور امتحان میں کس زبان میں جوابات تحریر کرنے کے

خواہاں ہیں۔
(ایم اے/ایم ایس سی)
۶. بی اے اور بی ایس سی اور اعلیٰ جماعتوں
میں بھی ذریعۂ تعلیم بدلا جائے لیکن اس کے لیے مناسب تیاری کی جائے
اور ایسے بورڈ بنائے جائیں جو پندرہ سال کے اندر اندر (۱۹۷۵ء تک)
زبان کی اصطلاحات، کتابیں، حوالہ جات اور نصابوں کی تیاری مکمل
کریں۔
۷. آرٹس کے مضامین میں پندرہ سال سے پہلے بھی (۱۹۷۵ء سے قبل) بی
اے اور ایم اے میں ذریعۂ تعلیم کا بدلنا ممکن ہے۔
۸. اس دوران میں اردو اور بنگلہ کو قریب تر لانے کے لیے کمیٹی قائم کی
جائے اور
۹. قومی زبانوں میں پڑھانے کے لیے اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا جائے۔

قومی تعلیمی کمیشن کی سفارشات ۲۶ اگست ۱۹۵۹ء کو صدر پاکستان (فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں) کو پیش کی گئیں جنہیں حکومت نے غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد ۶ اپریل ۱۹۶۰ء کو منظور کر لیا اور اسی سال ان پر عملدرآمد بھی شروع ہوا۔ ...... اس ضمن میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ ۱۹۶۲ء کے آئین میں انگریزی کے مسلسل استعمال کی مدت پندرہ سال کی گئی تاکہ اس عرصے کے دوران قومی زبانیں اس کی جگہ لینے کے لیے مناسب ترقی کرسکیں۔ یہ آئینی شق قومی تعلیمی کمیشن کی سفارشات (۱۹۶۰ء) کے تحت آئین ۱۹۶۲ء میں شامل کی گئی تھی۔ اس شق نے ۱۹۵۶ء کے آئین کی دی ہوئی مدت میں مزید ایک سال کا اضافہ کرکے انگریزی کے استعمال کی آخری حد ۱۹۷۷ء مقرر کر دی۔ حالانکہ کمیشن نے پندرہ برس کی مدت اپنے قیام کے حوالے سے مقرر کی تھی جس کے مطابق انگریزی کے استعمال کی آخری حد ۱۹۷۵ء بنتی تھی۔

۱۹۶۲ء کے آئین میں مملکت کی قومی زبانیں قرار دینے سے جو قومیت کی تشکیل کی نفی ہوتی تھی اس کے مضمرات ایسے نہ تھے جو کسی طرح سمجھے نہیں جا سکتے تھے۔ لیکن لسانی مسئلہ جو قومی زبان کے مقام اور منصب کے حوالے سے ظاہر ہوتا تھا سیاسی صورت اختیار کر چکا تھا جسے کسی طرح حل کرنا کہ ایک زبان (اردو) کو تسلیم کیا جائے آسان نہ تھا۔ دو زبانوں سے لسانی فاصلہ رونما ہوا تھا جو مغربی اور مشرقی پاکستان کے مکانی فاصلے کو اور زیادہ شدت سے نمایاں کرتا تھا۔ تاہم اس زمانے کی مارشل لاء حکومت ایسے فاصلے کو کم کرنے کی کوششوں میں مصروف رہی اور اردو اور بنگلہ کو قریب تر لانے کی تدابیر پر غوروخوض ہوا اور پاکستان کے دونوں حصوں میں دونوں زبانوں کی

ترویج کے لیے کوششیں کی گئیں۔ دونوں زبانیں رسم الخط کے اعتبار سے بھی دو وحدتوں کو آشکار کرتی تھیں۔ ناگری اور فارسی رسم الخط کو کسی ایک وحدت میں سمونا مشکل دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے ایک حل یہ تجویز کیا گیا کہ قومیت کی وحدت کے لیے رسم الخط کو بدل دیا جائے اور جمہوریۂ ترکیہ کے اقدام کی روشنی میں اردو اور بنگلہ کے لیے رومن رسم الخط کو اختیار کیا جائے۔ لیکن یہ تجویز مسترد کر دی گئی۔ اس کے بعد مغربی پاکستان میں بنگلہ زبان کو فارسی رسم الخط میں تحریر کرنے کا رویہ رواج پایا۔ مگر اس کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ قومی یک جہتی کونسل کی کوششوں کے باوجود اردو اور بنگلہ ایک دوسرے کے قریب نہ آسکیں اور فائدہ انگریزی زبان کو ہوتا رہا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اہل علم اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ انگریزی ہی میں رابطہ قائم کرتے رہے اور اس طرح ۱۹۶۲ء کے آئین کے زمانے میں انگریزی ہی سرکاری زبان کا قومی مفہوم میں کردار ادا کرتی رہی۔

اس اثناء میں مغربی پاکستان اردو کانفرنس کی مجلس قائمہ نے اردو کانفرنس کے انعقاد کے ایک برس بعد ۲ مارچ ۱۹۶۰ء کو قومی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کا جائزہ لیا اور ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کے لیے مدت کو کم کرنے کی تجویز پیش کی۔ رسم الخط کے سلسلے میں رومن رسم الخط کو مسترد کر دیا اور اردو اور علاقائی زبانوں کے باہمی روابط پر زور دیا۔

قومی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے تحت اردو زبان انٹرمیڈیٹ تک عام سکولوں اور کالجوں کے علاوہ کانونٹ سکولوں میں لازمی قرار دی گئی اور ہر طالب علم کے لیے خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی قومی زبانوں کا مطالعہ ضروری قرار پایا۔ غیر ملکی طلبہ کے لیے آسان متبادل اردو کے کورس تجویز ہوئے اور ان کے پڑھنے کے لیے الگ کتابیں مرتب ہو کر شائع ہوئیں۔ یہی سہولت انگلش میڈیم سکولوں کے طلبہ کو بھی دی گئی۔ اردو کو لازمی مضمون قرار دینے سے جو تدریسی مسائل پیدا ہوئے ان کے حل کے لیے ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۳ء میں لاہور اور کراچی میں اردو تدریسی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ڈھاکہ اور لاہور میں بنگلہ اور اردو کی ترقی کے لیے بورڈ قائم کیے گئے اور تالیف و ترجمے کے شعبے، اکادمیاں اور سوسائٹیاں قومی زبانوں کے فروغ کے لیے تندہی سے کام کرنے لگیں۔ ۱۹۶۳ء میں کراچی یونیورسٹی نے بی اے اور بی ایس سی میں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو ذریعۂ تعلیم و امتحان کی اجازت دے دی جسے ۱۹۶۴ء میں ایم اے اور ایم ایس سی تک بڑھا دیا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۶۴ء میں بی اے اور بی ایس سی اور ۱۹۶۶ء میں ایم اے اور ایم ایس سی کے لیے انگریزی اور اردو میں ذریعۂ تعلیم اور

امتحاں کا اختیار دے دیا اور بعد ازاں یہ کام سندھ اور پشاور کی یونیورسٹیوں نے بھی انجام دیا۔ سندھ اور کراچی کی یونیورسٹیوں میں انگریزی اور اردو کے علاوہ سندھی کو بھی اس اختیار میں شامل کر لیا گیا ۔ معاشرتی علوم کے طلبا نے ان سہولتوں سے فائدہ اٹھایا لیکن سائنس کے مضامین میں انگریزی کی جگہ کوئی اور ذریعۂ تعلیم و امتحان نہ لے سکا۔ ۱۹۶۹ء میں ذریعۂ تعلیم کمیٹیوں نے متفقہ سفارش کی کہ آرٹس کا ذریعۂ تعلیم بہرصورت اردو یا بنگلہ ہونا چاہیے لیکن سائنس کے مضامین میں ترجیح اردو یا بنگلہ کو دینا ضروری ہے لیکن انگریزی کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔ ۱۹۶۳ء میں مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں قومی زبان کے دفتری نفاذ کا بل پیش ہوا۔ لیکن اسے رائے عامہ کے استصواب کی خاطر مشتہر کیا گیا اور مختلف سرکاری اور نیم سرکاری اور خود مختار اداروں کے ذریعے دفتری زبان کی تبدیلی کے سلسلے میں رائے طلب کی گئی۔ اس ضمن میں اختلاف نمایاں نہ ہوا تاہم بعض اعلیٰ عہدہ داروں نے اس تبدیلی کو بتدریج بیس یا تیس برسوں کے عرصے پر پھیلا دینے کا مشورہ دیا۔ بعض عہدہ داروں نے ٹائپ رائٹروں، سٹینوگرافروں اور ٹائپ کرنے والے عملے کی کمیابی اور کمی کی طرف اشارا کیا۔ تاہم اکثر افسران ایسے تھے جو تبدیلی کے اس عمل کو قومی مفاد کے حق میں جلد از جلد بروئے کار لانے کی حمایت میں تھے اسی دوراں میونسپل کمیٹیوں اور کارپوریشنوں نے اردو کے استعمال میں دلچسپی لینی شروع کی اور آزاد جموں و کشمیر حکومت نے ۱۹٦۷ء میں اپنے دفاتر میں اردو زبان کو نافذ کردیا۔ قومی زبانوں کے بارے میں ایسی پیش رفت ۱۹٦۲ء کے آئین کے تحت ہوئی جب ایوب خاں صدرمملکت تھے۔

۱۹٦۹ء میں بحالیٔ جمہوریت کے لیے ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہوتے ہی قومی زبانوں کا معاملہ معرض التوا میں چلا گیا اور دوسرا مارشل لا، نافذ ہوا جس کے تحت یحییٰ خاں نے جو صدرمملکت کے عہدے پر بھی فائز تھے، مغربی پاکستان کی وحدت توڑ کر جہاں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیاں مساوات کے تصور کو ختم کیا وہیں مغربی پاکستان کے صوبوں کو ۱۹۵۴ء سے قبل کی صورت میں بحال کر دیا۔ یحییٰ خاں کے دور میں نورخاں کی سربراہی میں تعلیمی کمیشن قائم کیا گیا جس نے تعلیمی پالیسی کے بارے میں سفارشات پیش کیں جو منظر عام پر نہ آسکیں کیوں کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتیجے میں سیاسی بے چینی نے ایسی صورت اختیار کی کہ مشرقی پاکستان، بھارت کی جارحیت کے باعث بنگلہ دیش بن کر وفاق پاکستان سے ٹوٹ گیا۔ مملکت کی لسانی صورت حال بھی بنیادی طور پر بدل گئی اور دو قومی زبانوں کا مسئلہ ختم ہوگیا۔ سقوط ڈھاکہ (١٦ دسمبر

۱۹۷۱ء) کے بعد ۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پیپلزپارٹی نے پاکستان کی حکومت سنبھالی اور ذوالفقار علی بھٹو صدر مملکت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ---- صوبوں میں نئے گورنروں کا تقرر ہوا۔ پنجاب اور سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی جب کہ سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کی مخلوط حکومتیں قائم ہوئیں۔ ٦ مئی ۱۹۷۲ء کو بلوچستان کے گورنر غوث بخش بزنجو نے اعلان کیا کہ صوبے کی دفتری زبان اردو ہوگی۔ اس کے کچھ عرصے بعد سرحد کے گورنر ارباب سکندر خان خلیل نے بھی اپنے صوبے میں اردو کو دفتری زبان بنانے کا اعلان کیا۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ ملک معراج خالد نے اعلان کیا کہ پنجاب میں ایک سال کے اندر تمام دفاتر کی زبان اردو ہوجائے گی۔ صوبہ سندھ کی اسمبلی نے ۷ جولائی ۱۹۷۲ء کو زبان کے بارے میں بل منظور کیا کہ :

۱۔ صوبہ سندھ میں سندھی زبان صوبائی زبان کے طور پر استعمال ہوگی۔
۲۔ صوبہ سندھ کے سکولوں میں چوتھی جماعت سے بارہویں جماعت تک سندھی اور اردو لازمی مضمون ہوں گے۔
۳۔ اور اگر حکومت سندھ چاہے تو سندھی زبان کو سرکاری دفاتر اور عدالتوں اور اسمبلی میں زیادہ سے زیادہ استعمال کے انتظامات کر سکتی ہے۔

پاکستان کی نئی دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۷۳ء میں نیا آئین متفقہ طور پر بنایا جس کی صدرمملکت نے ۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو توثیق کی۔ آئین (۱۹۷۳ء) ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کو نافذ کیا گیا۔ اس آئین کی شق نمبر۲۵۱ قومی زبان کے بارے میں ہے۔ اس آئین کے مطابق قرار پایا کہ

۱۔ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور اس زبان کو سرکاری اور دیگر مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے آئین کے نفاذ سے پندرہ سال (۱۹۸۸ء) کے اندر انتظامات کیے جائیں گے۔
۲۔ پہلی شق کے تحت انگریزی کا سرکاری زبان کے طور پر استعمال اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک کہ اس زبان کی جگہ لینے کے لیے اردو زبان کے بارے میں انتظامات مکمل نہیں ہوتے۔
۳۔ قومی زبان کے مذکورہ مقام و منصب کو کسی قسم کا گزند پہنچائے بغیر صوبائی اسمبلی کو اختیار ہوگا کہ وہ قومی زبان کے علاوہ صوبائی زبان کی ترقی، استعمال اور تعلیم کے لیے بھی مناسب قوانین بنائے۔

اس آئین (۱۹۷۳ء) کی شقیں اس اعتبار سے بے حد واضح ہیں کہ اسے متفقہ

طور پر منظور کیا گیا تھا اور قومی زبان کے مقام کو بھی متفقہ طور پر تسلیم کیا گیا تھا اور یہ حتمی فیصلہ بھی کیا گیا تھاکہ پندرہ سال (۱۹۸۸ء) کے اندر اندر قومی زبان کو انگریزی زبان کے بدل کے طور پر تیار کیا جائے گا اور ۱۹۸۸ء تک انگریزی زبان دفاتر کا کام چلائے گی اور سرکاری زبان کا کام دے گی۔

نئے آئین (۱۹۷۳ء) کے تحت ۱۹۷۷ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے جن کے نتائج کو قومی اتحاد کی تحریک نے تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اس صورت حال میں ایک بار پھر سیاسی بے چینی پھیل گئی اور ملک میں حالات کی صورت دگرگوں ہوئی۔ جس کے نتیجےمیں تیسرا مارشل لا، ۷ جولائی ۱۹۷۷ء کو نافذ کیا گیا۔ مارشل لا نے آئین (۱۹۷۳ء) کو مسترد کرنے کی بجائے معطل کر دیا۔ اس طرح آئین کی شقیں برقرار رہیں۔ ان حالات میں ۳ نومبر ۱۹۷۷ء کو علامہ اقبال اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا جس کے افتتاحی اجلاس میں جسٹس ایس اے رحمان نے اردو کو سرکاری، عدالتی، تعلیمی، علمی اور کاروباری حلقوں میں رائج کرنے کا مطالبہ کیا۔ تاکہ علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات ولادت کے موقع پر ایسا اقدام یاد گار ثابت ہو۔ اس مطالبے کو قبول کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے (جو نئی فوجی حکومت کے سربراہ تھے) قومی زبان کے نفاذ کے لیے نیشنل لینگویج اتھارٹی (مقتدرہ قومی زبان) کے قیام کی اجازت دی تاکہ اس ادارے کے ذریعے قومی زبان کی تکمیل اور نفاذ کے مقاصد پورے ہوسکیں۔ مقتدرہ قومی زبان کا باقاعدہ قیام ۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو عمل میں آیا۔ اس ضمن میں صدرمملکت جنرل ضیاءالحق کا یہ بیان غور طلب ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان اور اردو کا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ اردو پاکستانی قوم کی آواز ہے۔ اردو کی شناخت پاکستان سے ہے اور پاکستان کی شناخت اردو سے ہے۔

نفاذ اردو کی جس تحریک کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اسے بے حد نامساعد حالات سے گزرنا پڑا تھا اور وہ تحریک اس وقت مقابلتاً کم دشواریوں سے گزر رہی ہے۔ تاہم گزشتہ چالیس برسوں کے دوران نفاذ اردو کی تحریک سے مثبت نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان کے اعلانات سے یہ امر بخوبی واضح ہوا ہے کہ اس وقت اردو زبان قومی زبان کے طور پر سرکاری، علمی اور کاروباری ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے ہر طرح اہل ہو چکی ہے۔ ٹائپ رائٹر کی اردو لوح مکمل ہوچکی ہے اور اردو ٹائپ رائٹر اس کلیدی لوح کے ساتھ باقاعدہ استعمال میں ہیں۔ اسی طرح اردو ٹیلی پرنٹر بھی تیار ہو کر زیر استعمال ہے۔ دفاتر کے کام کے لیے ٹائپ کرنے والوں اور شارٹ ہینڈ کے ماہروں کی خاصی تعداد بھی تربیت حاصل کر چکی ہے اور اس ضمن میں ٹریننگ کے انتظامات بھی

مکمل ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے عملی تعاون سے دفاتر کی ضرورتوں‌کو پورا کیا جا رہا ہے۔ صوبوں میں ضلعی سطح پر اردو میں دفاتر کا کام ہو رہا ہے۔ مرکزی حکومت میں اطلاعات و نشریات اور مذہبی امور کی وزارتوں نے اردو کو نافذ کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ تاہم باقاعدہ طور پر اردو کو سرکاری زبان کا جائز مقام دینے کی صورت سردست دکھائی نہیں دیتی۔ آئین (۱۹۷۳ء) کے مطابق اردو کو اس کا جائز مقام ۱۹۸۸ء کے فوراً بعد مل جانا ضروری ہے۔

نفاذ اردو کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان نے جو سفارشات کی ہیں ان کا جائزہ اس لیے بھی ضروری ہے۔ کہ اردو زبان کے بارے میں جو شکوک کسی زمانے میں موجود تھے وہ اب باقی نہیں رہے ہیں۔ مقتدرہ نے اردو زبان کی ترویج اور سرکاری و غیر سرکاری دفاتر میں اردو زبان کےمکمل استعمال کے لیے جو سفارشات کی ہیں ان کا تعلق تین اہم شعبوں سے ہے :

۱۔ اردو ذریعہ تعلیم

۲۔ اردو دفتری/ سرکاری اور کاروباری زبان

۳۔ اردو اعلیٰ ملازمتوں کے لیے مقابلے کے امتحانات کی زبان

(الف) اردو ذریعہ تعلیم کے ضمن میں مقتدرہ کی سفارش ہے کہ

۱۔ انٹرمیڈیٹ سائنس، آرٹس اور کامرس، ٹیکنیکل ڈپلومے، بی اے، بی کام، بی ایڈ اور قانون کے امتحان (ایل ایل بی) کے لیے ----- تمام مضامین میں ذریعہ تعلیم اردو ہو اور ان مضامین میں انگریزی ذریعہ تعلیم کی آخری مد ۱۹۸۴ء ہو۔

۲۔ بی ایس سی، ایم ایس سی، ایم کام، ایم ایڈ، بی بی ایم، ایل ایل بی ----
تمام مضامین میں ذریعہ تعلیم ۱۹۸۵ء سے اردو ہو -
انگریزی ذریعہ تعلیم‌کی آخری حد ۱۹۸۶ء ہو۔

۳۔ ایم ایس سی اور ایم بی اے کے لیے-----
ذریعہ تعلیم ۱۹۸۷ء سے اردو ہو۔
انگریزی ذریعہ تعلیم کی آخری حد ۱۹۸۸ء ہو۔

علاوہ ازیں مندرجہ ذیل اقدامات کیے جائیں۔ ------

۱۔ ہر ڈویژن میں ایک ماڈل اردو کالج قائم کیا جائے۔

۲۔ اردو کی تدریس کے لیے ورکشاپس کا انعقاد کیا جائے۔

۳۔ پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات کا اردو ترجمہ اور مقالے کا خلاصہ اردو میں پیش کرنا لازمی ہو۔

۴۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے سکولوں کی حوصلہ شکنی کی

جائے اورذریعہ تعلیم کی سکیم ۱۹۷۹ء پر سختی سے عمل کیا جائے۔

(ب) بطور کاروباری اور دفتری / سرکاری زبان ...... مقتدرہ کی سفارش ہے کہ

۱۔ صدرمملکت آرڈی نینس جاری کریں کہ ۱۹۸۱ء سے دفاتر میں اردو مرحلہ وار رائج کی جائے گی۔'

ـــــ پہلا مرحلہ (۱۹۸۱ء)

۱۔ نوٹنگ (کیفیت نگاری) ڈرافٹنگ (مسودہ نگاری) اور پریسی رائٹنگ (خلاصہ نگاری) اردو میں ہوگی۔

۲۔ اردو کی اصطلاحات بیرونی قوسیں درج ہوں گی۔ ...... کیفیت نگاری (نوٹنگ) مسودہ نگاری(ڈرافٹنگ) اور اصل انگریزی اصطلاح قوسین کے اندر لکھے جائیں گے۔

۳۔ تربیتی ادارے کا قیام، دوران ملازمت تربیت کا انتظام، حوصلہ افزائی کے لیے نقد انعام یا سالانہ اضافہ تنخواہ

۴۔ ہر ادارے میں صیغہ نگرانی و اصلاح کا قیام

ایف اے اور بی اے کے نصاب میں مسودہ نگاری کا ضروری شامل ہونا۔

ـــــ دوسرا مرحلہ (۱۹۸۲ء)

۱۔ تین چوتھائی امور ...... اردو میں طے پائیں

۲۔ سال میں کم از کم دو ہزار ٹائپ رائٹر تیار ہوں

۳۔ اداروں کے بجٹ میں ٹائپ رائٹر (اردو) کی خرید کے لیے رقم مخصوص کی جائے

ـــــ تیسرا مرحلہ (۱۹۸۳ء) تکمیلی سال

۱۔ کابینہ میں خلاصے اردو میں پیش ہوں

رو داد کابینہ اور ایجنڈا اردو میں لکھے جائیں

۲۔ صدرمملکت اور ان کا دفتر اردو کو استعمال کرنے کی مثال قائم کریں۔

۳۔ وفاقی سکرٹریٹ کا نظام دفاتر اردو میں ہو

(ج) بطور ذریعہ امتحانات .... اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانات

۱۔ اردو کو لازمی زبان قرار دیا جائے۔

۲۔ اردو کے لیے دوسری زبانوں کے برابر ۱۰۰ نمبر کا پرچہ ہو۔

۳۔ اردو ادب کے پرچے کے ۲۰۰ نمبر ہوں۔

۴۔ فنکشنل (افادی) اردو کا ایک لازمی پرچہ بھی شامل ہو جس کے نمبر ۵۰ ہوں۔

۵۔ انگریزی کے ساتھ اردو کو بھی فوری طور پر متبادل ذریعۂ امتحانات کی حیثیت دے کر رائج کیا جائے۔

۶۔ مقابلے کے امتحانات کے تمام پرچے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں چھاپے جائیں۔

نفاذ اردو کی تحریک میں اخبارات، رسائل وجرائد، فلم انڈسٹری، ٹیلی وژن اور ریڈیو کے ہمہ گیر تاثر اور ابلاغ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان ذرائع ابلاغ نے اردو زبان کو قومی زبان کے طور پر استعمال کرکے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ مملکت پاکستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو قومی زبان کو اپنی زبان نہ قرار دیتا ہو۔ یہ ذرائع ابلاغ کشمیری، پشتو، گوجری، بلتی، ہندکو، پوٹھوہاری، پنجابی، سرائیکی، سندھی، براہوی، اور بلوچی کے علاوہ کئی ایک بولیوں کے لسانی ماحول میں قومی زبان کی ہمہ گیری کو رونما کرتے ہیں۔ اس طرح یہ اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اردو زبان لوگوں کے فہم کے قریب ترین ہے اور پاکستان کے باشندوں نے اس زبان کے بارے میں کسی قسم کی کوئی دشواری محسوس نہیں کی ہے وگرنہ ان ذرائع ابلاغ میں سے بیشتر ذرائع کی کارکردگی پر برا اثر پڑتا۔ اس سلسلے میں ٹیلی وژن کی کارگزاری بھی توجہ طلب ہے کہ ٹیلی وژن نے اردو زبان کو مملکت پاکستان میں ایک نئی جہت فراہم کی ہے اور اسے ایک مؤثر زبان کے طور پر بروئے کار لایا ہے۔ علاوہ ازیں یہ خصوصیت بھی ظاہر کی ہے کہ اردو زبان کسی خاص لہجے، یا کسی خاص علاقے سے وابستہ نہیں ہے۔ ٹیلی وژن کے ڈراموں نے علاقائی اور قومی زبانوں کے امتزاج سے اردو زبان کی جس خوبی کو واضح کیا ہے اس نے اردو کے بارے میں غیریت کو دور کرکے اپنائیت کو مستحکم کیا ہے۔ اخبارات جو شرح خواندگی کے حوالے سے اپنا دائرہ اشاعت طے کرتے ہیں۔ شرح خواندگی کے باوجود عام ناخواندہ فرد تک بھی پہنچتے ہیں اور سماعت کے ذریعے اپنا ابلاغ کرتے رہے ہیں۔ ان کی کیفیت بھی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اردو زبان تک فہم کی رسائی قدرتی رویوں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ فلم انڈسٹری کے ذریعے اردو زبان کی وسعت کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہمہ گیر صورت اس امر کو نمایاں کرتی ہے کہ اردو نہ صرف قومی زبان کا منصب حاصل کر چکی ہے بلکہ اس کی ہمہ گیری نے لوگوں کے اس متفقہ رویے کو ظاہر کیا ہے کہ اردو اس مقام تک پہنچ چکی ہے جہاں اسے سرکاری زبان کا اور

غیر مشروط طور پر ذریعۂ تعلیم کا مقام ملنا ضروری ہو چکا ہے۔ کسی زبان کے بارے میں لوگوں کی ایسی ہمہ گیر حمایت کو نظر انداز کرنا ہر اعتبار سے غیر مناسب دکھائی دیتا ہے۔ ان حالات میں اردو زبان کو قومیت کی تشکیل میں پوری طرح شامل کرنے اور مملکت کے قومی شعور میں راسخ کرنے کے لیے آئین ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۲۵۱ کا بغیر کسی شرط کے اطلاق ضروری ہو چکا ہے۔ آئین کی پاسداری کے بغیر قومیت کی تشکیل ممکن نہیں ہوسکتی اور قومی زبان کے جائز حق کو بروئے کار لائے بغیر آئین (۱۹۷۳ء) کے مقاصد کی تکمیل بھی ممکن نہیں ہے۔

۱۸۔ نشأۃ ثانیہ اور قومیت کی تشکیل

برصغیر میں مسلم قومیت کی تشکیل اور اسلامیان برصغیر کے قومی تشخص کے لیے زبان (اردو) کی اہمیت اور تحریک آزادی کے دوران اردو زبان کا تہذیبی کردار ایسے نہایت اہم عمرانی، سیاسی اور تہذیبی امور تھے جن کی توانائی اور قوت کے نتیجے میں مملکت پاکستان کا وجود ممکن ہوا تھا۔ ایک اعتبار سے اردو زبان اس وسیع تر جدوجہد کی علامت تھی اور برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخی شناخت بن چکی تھی۔ اس عظیم منظر نامے کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاچکا ہے۔ اسی تسلسل میں آزادی کے بعد نفاذ اردو کی تحریک، لسانی، علمی اور بین الاقوامی روابط کے مسائل، علاقائی زبانوں کے ساتھ رشتہ اور ذریعۂ تعلیم کی افادیت کے بارے میں بھی قومی زبان کی صورت حال کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تاہم ایک متحرک قومی صورت حال میں ان سوالوں کا قطعی جواب سردست ممکن نہیں ہوا جو قومیت کی تشکیل کے ضمن میں زبان کو بدلے ہوئے تقاضوں میں غور و فکر کا سنجیدہ موضوع بناتے ہیں۔ مملکت پاکستان کی گزشتہ برسوں کی تاریخ میں حالات کی نامساعد صورت نے کئی نوع کی پریشان کرنے والی کیفیات کو رونما کیا تھا۔ زبان ہی کے سوال پر مشرقی پاکستان کا تکلیف دہ سانحہ واقع ہوا جس نے دوسرے متعدد امور کے ساتھ مل کر سقوط ڈھاکہ کو پیدا کیا تھا۔ اس وسیع تر منظر کو دیکھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ قومیت کی تشکیل میں زبان کا حصہ (اگر اس کے گرد غلط فیصلوں کا سلسلہ موجود ہو!) کس حد تک صبر آزما ثابت ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس امر کا احساس بھی ہوتا ہے کہ قومیت کی تشکیل صرف زبان ہی کے حوالے سے ممکن نہیں ہوسکتی اور یہ کہ قومیت کی تشکیل کے کئی دیگر امور بھی ہیں جن کا کارفرما ہونا بھی قومی زندگی کے لیے بے حد ضروری ہے۔

ماضی کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت جس دستور ساز اسمبلی کو اقتدار منتقل ہوا تھا وہی اسمبلی اصولی طور پر مسلم قومیت کے مقاصد کی امانت دار تھی اور برصغیر میں مسلم قومیت کے تسلسل کی علامت تھی۔ اس اسمبلی کے اراکین کم و بیش وہی عظیم افراد تھے جنھوں نے ۱۹۴۰ء میں قرار داد لاہور منظور کی تھی اور ۱۹۴۶ء کے کنونشن میں پاکستان کے مطالبے کی دستوری تقاضوں کے مطابق توثیق کی تھی۔ قومی زبان کے بارے میں فیصلہ اسی دستور ساز اسمبلی کی ذمہ داری تھا۔ اس

اسمبلی کو توڑ کر جو نئی اسمبلی معرض وجود میں آئی تھی اور جس نے ۱۹۵۶ء کا آئین منظور کیا تھا اس نے قومی مقاصد کے مقابلے میں مصلحتوں کو ترجیح دیتے ہوئے دو زبانوں کے جس تصور کی حمایت کی وہ تحریک آزادی کے مضمرات کی یکسر نفی کرتا تھا اور جسے محض عددی اکثریت کی بناء پر کہ مشرقی پاکستان کی آبادی زیادہ تھی کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ قومی زبان کے بارے میں ایسا فیصلہ جمہوری حق کے غلط استعمال کی نشاندہی کرتا ہے۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن کے وقت سلہٹ صوبہ بنگال کا حصہ نہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں سلہٹ نے ریفرنڈم کے ذریعے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا اور یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ (سلہٹ) مشرقی بنگال میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ اس لیے سلہٹ کی آبادی کو بنگلہ آبادی میں جمع کرکے عددی اکثریت کا جواز پیدا کرنا کسی طرح معقول نہیں تھا۔ سلہٹ کو مشرقی بنگال میں شامل کرکے محض ایک انتظامی یونٹ بنایا گیا تھا۔ اس لیے بنگالیوں کے غلط فیصلے میں سلہٹ کو شریک کرنا محض عددی اکثریت کے جبر ہی کی نشاندہی کرتا ہے۔سلہٹ بنیادی طور پر آسام کے مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ تھا اور کلکتے کے ہندو قوم پرستوں کے زیر اثر نہیں تھا۔ تاہم قومی زندگی کے بنیادی فیصلوں کے لیے ایسے طریق کار کو استعمال کرنا کسی طرح درست دکھائی نہیں دیتا۔ مشرقی پاکستان کی عددی اکثریت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب بنگلہ زبان کو قومی زبان کا مقام دیا گیا تو یہ امر فراموش کر دیا گیا تھا کہ ایسی عددی اکثریت سے کہیں زیادہ بھاری اکثریت نے تحریک آزادی کے دوران اردو زبان کو اپنی قومی اور تہذیبی زبان کا مقام دے رکھا تھا جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اردو زبان کا مقام برصغیر کے مسلمانوں کا تاریخی اور ملت اسلامیہ کا متفقہ فیصلہ تھا جسے جمہوری رائے شماری کے ذریعے کسی دوسری سورت حال میں رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مملکت پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کے تاریخی فیصلے سے معرض وجود میں آئی تھی اور تاریخی فیصلوں کو مستقبل کے کسی بھی اکثریتی طریقے سے یا کسی اور طریقے سے رد کرنا کسی کا حق نہیں تھا اور نہ ایسا حق کسی کو دیا جا سکتا ہے۔ [بد قسمتی] یہ ہے کہ مملکت پاکستان کی گزشتہ تاریخ میں تاریخی نوعیت کے فیصلوں اور دوسرے فیصلوں کے درمیاں کسی قسم کا فرق محسوس نہیں کیا گیا۔ سقوط ڈھاکہ بھی ایسے ہی انحراف کی ایک اذیت ناک مثال ہے۔ تاریخی فیصلوں کی روشنی میں اردو ہی مملکت کی واحد قومی زبان تھی اور برابر قومی زبان ہے۔ اسے کسی دوسری زبان کے ساتھ قومی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے شریک نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس امر کو دہرانا بھی مناسب دکھائی دیتا ہے کہ اردو زبان کو قومی

زبان قرار دیتے ہوئے اس زبان کو کسی خاص خطے اور اس خطے میں بسنے والے لوگوں کے ساتھ دائمی طور پر منسوب کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ آزادی سے قبل یہ زبان بلاشبہ اس خطے میں شرفا کی زبان تھی جو برصغیر میں مسلم اقتدار کے دارالحکومتوں کا خطہ تھا اور اس طرح اسلامیان برصغیر کے نزدیک اسلامی اقتدار کا مرکز اور مظہر بھی تھا۔ لیکن مسلم اقتدار کی علامت کے طور پر یہ زبان برصغیر میں مسلمانوں کی مشترکہ زبان کا مقام حاصل کر چکی تھی۔ اس لیے جب برصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار باقی نہ رہا۔ اسلامی ہندوستان کی شوکت اور سطوت باقی نہ رہی برصغیر کے مسلمانوں نے اردو کے ساتھ اپنی محبت اور وفاداری کو قائم رکھا کیوں کہ اس ایک علامت کے ذریعے ان کی اجتماعی یادداشت میں مسلم اقتدار کا رشتہ برابر مستحکم رہ سکتا تھا۔ ایسی ہمہ گیر کیفیت کی موجودگی میں مسلمانوں نے اس زبان کے تحفظ اور استحکام کو اپنی تحریک آزادی کا لازمی جزو قرار دیا تھا اور اسے قومی زبان کا مقام دیا تھا جو سارے برصغیر کے مسلمانوں کا تاریخی فیصلہ بھی تھا۔

تاہم بنگلہ زبان کے مسئلے نے اس تاریخی اقدام اور فیصلے کو نزاعی سوال بنا کر جہاں ایک غلط رویہ اپنایا کہ قومی زبان صرف وہی ہے جو اکثریت بولتی ہے اور اردو کو ایک خاص خطے اور خاص لوگوں کے ساتھ منسوب کیا وہیں یہ فراموش کر دیا کہ قومی زبان کا تعلق ساری قوم سے ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قومی زبان وہ ہوتی ہے جس میں کسی قوم کا اجتماعی شعور زمانے کے تسلسل کے ساتھ اپنا اظہار پاتا ہے جس کے ساتھ قوم کی تاریخی روداد اور قوم کی تحریک آزادی وابستہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جس میں اس قوم کے اعلیٰ ترین موضوعات کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ بنگلہ زبان ایسی شرائط کو اپنے ماضی کی تاریخ میں کسی طرح پورا نہیں کرتی تھی اس لیے اسے قومی زبان قرار دینا ہر اعتبار سے غلط تھا۔

ایسے پس منظر میں جب قومی زبان کا سوال قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں مدنظر تھا، یہ امر فراموش کر دیا گیا کہ قومی زبان کے حقوق پر کسی غیر ملکی زبانؔ کا تسلط کسی طرح جائز نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اردو زبان کو اپناتے (اور اپنے غلط نقطۂ نظر کے باوصف اسے قبول کرتے) انہوں نے مغربی پاکستان میں اپنے اظہار کے لیے انگریزی زبان کو برابر استعمال کرنے کی ناواجب اور نامناسب روش اختیار کی اور اس طرح دانستہ اپنی نفسیات کے مرضیاتی رویوں کو نمایاں کیا جو کسی طرح جائز نہ تھا۔ مشرقی بنگال کے لوگ اپنے طور پر کسی طرح آزادی سے ہمکنار نہیں ہوئے تھے۔ آزادی ان کی انفرادی جدوجہد کے

نتیجے میں ان کو حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ سارے برصغیر کے مسلمانوں کے ووٹوں سے انہیں میسر آئی تھی۔ ان مسلمانوں کے ووٹ بھی ان کی آزادی کا باعث بنے تھے جو اپنے ہی علاقوں میں حسب سابق رہ رہے تھے اور اپنے تہذیبی وجود کے لیے اردو ہی کا استعمال کرتے تھے۔ اس استدلال کی روشنی میں مملکت پاکستان کا کوئی بھی علاقہ اور صوبہ ایسا نہیں تھا جس نے انفرادی جدوجہد کرکے آزادی حاصل کی تھی۔ مملکت پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی متحدہ اور مشترکہ جدوجہد سے معرض وجود میں آئی تھی۔ وفاق پاکستان مشترکہ تاریخی جدوجہد اور مشترکہ مقاصد کے نتیجے میں ظاہر ہوا تھا۔ صوبوں نے امریکی ریاستوں کی طرح ریاستہائے متحدہ امریکہ کی وحدت میں شرکت نہیں کی تھی۔ اقتدار اعلیٰ صوبوں کے پاس نہیں تھا (جو امریکی ریاستوں کے پاس فی الواقع موجود تھا) اور نہ صوبوں ہی کو منتقل ہوا تھا۔ تاہم تحریک آزادی کے دوران صوبوں کے مسلمانوں نے اپنی انفرادیت کو آل انڈیا مسلم لیگ کی اجتماعی وحدت کا جزو بنا کر اپنے صوبائی مزاج کو اجتماعی مقاصد کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ لسانی اعتبار سے یہی کیفیت قومی زبان اور ثانوی (صوبائی) زبانوں کی تھی۔ اس لیے ان زبانوں کے باہمی رشتے کو آزادی کے بعد بنیادی زبان (قومی زبان) اور ثانوی زبان کے طور پر قبول کرنا ضروری تھا۔ بجائے اس کے کہ انگریزی کو ثانوی زبان (ESL) کا مقام دینے کی لاحاصل کوششیں کی جاتیں، پاکستان کی قومی زبان کو بنیادی زبان اور ثانوی زبان (علاقائی زبان) کے دائرے میں بروئے کار لانے کے لیے انتظام کرنا ضروری تھا۔

قومی زبان اور علاقائی زبانوں کے مابین جو رشتہ رونما ہوا تھا (بنگلہ زبان کی مثال غور طلب ہے) وہ رشتہ تحفظ کے منفی رجحان سے رونما ہوا تھا۔ علاقائی زبانوں کی روش گروپ سائیکالوجی سے تعلق رکھتی تھی جو ایسے رویے کو نمایاں کرتی تھی کہ غالباً قومی زبان کے آجانے سے علاقائی زبانیں ناپید ہو جائیں گی۔ اس لیے ان زبانوں کے تحفظ اور واضح مقام کی حمایت کو نفسیاتی طور پر ضروری گردانا گیا تھا۔ ایسے رویوں سے بجائے اس کے کہ علاقائی زبانوں کو مملکت کے وسیع تر تناظر میں دیکھا جاتا اور مملکت کے وسیع تر تناظر ہی میں ان کا مقام تلاش کیا جاتا ہر علاقائی زبان نے اپنے محدود جغرافیے ہی کے ماحول میں اپنے لیے تحفظ کا مطالبہ کیا۔ اس کے نتیجے میں صوبائی حکومتوں نے اور مرکزی حکومت نے علاقائی زبانوں کے بورڈ اور اکیڈمیاں قائم کیں۔ پنجابی ادبی بورڈ، بزم ثقافت ملتان، پشتو اکیڈمی اور سندھی ادبی بورڈ ایسے لسانی رویے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایسے اداروں نے علاقائی زبان کو اپنے مخصوص علاقے ہی کے حوالے سے تحفظ

فراہم کرنے کے انتظامات کیے۔ تاہم ان اداروں نے مثبت انداز میں علاقائی زبانوں کی وساطت سے علاقائی کلچر کو دریافت کرنے کی ابتدا بھی کی اور اس حقیقت کی نمایاں طور پر نشاندہی کی کہ علاقائی زبان کا ایک مشترکہ کلچر ہے جو مسلمانوں کے تمدن سے اپنی توانائی اخذ کرتا ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی واضح ہوا کہ علاقائی زبانوں کا ذخیرۂ الفاظ بھی بڑی حد تک مشترک ہے اور عہد حاضر سے قبل کا علمی اور فکری پس منظر ان زبانوں کے شعری ادب کو گہرائی، جذب و شوق، تاثیر اور وسعت فراہم کرتا ہے۔ تحفظ کے منفی اصول کے باوجود علاقائی زبانوں نے ماضی کے ورثے کی دریافت کو اپنا مقصد بنا کر قومیت کی تشکیل کی اور مملکت پاکستان کے باشندوں کی نظری وحدت کو آشکار کیا۔ تاہم گزشتہ برسوں کے دوران لسانی اعتبار سے جو کچھ عمل پذیر ہوا اس سے یہ امر یقیناً واضح ہوتا ہے کہ علاقائی زبانوں کے بارے میں خدشے بے بنیاد تھے اور قومی زبان کی موجودگی میں ان پر کسی منفی اثر کے وارد ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

علاقائی زبانوں کے بارے میں تحفظ کا رویہ دراصل ان زبانوں کی نشوونما سے بھی تعلق رکھتا تھا اور یہ خیال کیا گیا تھا کہ آزادی کے بعد یہ زبانیں بھی برابر نشوونما پائیں گی اور ان کا وجود قائم رہے گا۔ ایسا رویہ اور نقطۂ نظر واقعی قابل تعریف بھی تھا۔ ان زبانوں کی افزائش کے یقیناً مواقع بھی ظاہر ہوئے تھے اور برابر ظاہر ہو رہے ہیں۔ زبانیں یقیناً تمدن کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہیں۔لیکن ان زبانوں کا قومی زبان کے ساتھ رشتہ مملکت کے وسیع تر تناظر کے حوالے سے واضح ہونا بھی ضروری تھا اور اس امر کے عین مطابق ہونا لازمی تھا کہ کہاں علاقائی زبان کی حدود ختم ہوتی ہیں اور کہاں قومی زبان کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں کسی بھی علاقائی زبان کو قومی زبان کا حریف بنا کر پیش کرنا کسی طرح واجب اور جائز نہیں تھا۔

ذریعۂ تعلیم کے سلسلے میں علاقائی زبان کو مادری زبان قرار دے کر ابتدائی جماعتوں میں شامل کرنا قومیت کی تشکیل کے لیے مناسب انداز نظر دکھائی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے صوبہ سندھ میں ابتدائی جماعتوں کے لیے سندھی کو ذریعۂ تعلیم بنانا محل نظر ہے کہ ایسے طریق کار سے دو الگ الگ زبانوں کا تصور پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جو سندھی گھرانے اپنے بچوں کو انگلش میڈیم سکولوں میں بھیجتے ہیں کیا وہ اپنے آبائی کلچر سے دانستہ بُعد اور دوری کو پیدا نہیں کرتے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ مادری زبان کے غیر سائنسی تصور کے تحت ابتدائی جماعتوں میں سندھی کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے، ابتدائی جماعتوں میں ہر صوبے کے لیے ضروری ہے کہ ابتدائی جماعتوں کا ذریعۂ

تعلیم قومی زبان اور صرف قومی زبان ہی رہے۔ وگرنہ قومی زبان کے بارے میں ذہنی مسافت کے پائیدار ہونے کا خدشہ پیدا ہوسکتا ہے۔ اصولی طور پر قومی زبان کے دیے ہوئے ذہنی ماحول ہی میں علاقائی زبان کی شمولیت سےمثبت نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ امر اس لیے قابل توجہ ہے کہ مملکت پاکستان میں تاریخی طور پر قومی زبان بنیادی زبان ہے اور علاقائی زبان ثانوی زبان ہے۔ مادری زبان کا روائتی تصور عہد حاضر میں متروک ہو چکا ہے، کیوں کہ جس "مادری زبان" کو ابتدائی جماعتوں میں استعمال کیا جاتا ہے وہ کسی طرح "ماں کی بولی" نہیں ہوتی اور نہ کسی ایک گھرانے ہی کی زبان ہوتی ہے۔ یہ زبان بھی عموماً مشترکہ زبان ہوتی ہے اور اگر مشترکہ زبان ہی کو ذریعۂ تعلیم بنانا مقصود ہے تو کیا اس مشترکہ زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا زیادہ مستحسن نہیں ہے جو محدود ماحول اور جغرافیے کو وسیع تر ماحول اور جغرافیے سے منسلک کرتی ہے اور ابتدا ہی میں بچے کے ذہن کو قومی وحدت میں شریک کرنے کی ضمانت دیتی ہے۔ قومیت کی تشکیل کے لیے ہر صوبے میں ابتدائی جماعتوں کے لیے ذریعۂ تعلیم کا یکساں ہونا بے حد ضروری ہے۔

مادری زبان کے جس روایتی تصور کو متروک کہا گیا ہے وہ ایک محدود علمی ضرورت کی نشاندہی کرتا تھا جس کے مطابق معلومات کو قبول کرنےکے لیے ذہن کو تیار کیا جاتا تھا اور ذہن کی کیفیت کو استعداد کے اعتبار سے بے حد معمولی خیال کیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عمر کے جس حصے میں (تین سے پانچ سال) مادری زبان کے ذریعے معلومات کے قبول کرنےکا عمل شامل کیا گیا ہے، عمر کا وہ مرحلہ معلومات کو کسی طرح قبول نہیں کرتا او رنہ اس مرحلے کے بعد (نو اور دس برس کی عمر میں) مادری زبان کا روایتی تصور ہی اسے معلومات بہم پہنچا سکتا ہے۔ انسانی ذہن کی عمر کا ایسا ابتدائی مرحلہ صرف حروف اور الفاظ ہی کی پہچان کرتا ہے اور الفاظ کے ذریعے اپنے وجود کو معاشرے کے ساتھ منسلک کرتا ہے۔ ایسا عمل تو گھرانوں میں بھی باقاعدہ طور پر بروئے کار ہوتے دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے ایسے عمل کو مدرسے کی ابتدائی جماعتوں میں دہرانے سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ غالباً برآمد نہیں ہوسکتا۔ عہد حاضر میں ہر متمدن ملک میں قومی زبان ہی ابتدائی تعلیم کے لیے ذریعۂ تدریس کے طور پر مستعمل ہے۔ کیوں کہ یہی وہ زبان ہے جو بچے کو اپنے تمدن، اپنی قومیت اور اپنے عہد کے وسیع تر موضوعات سے وابستہ کرنے کی ضمانت دے سکتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب مادری زبانوں کے تدریسی عمل کا ذکر کیا تھا تو اس کی ایک وجہ یہی تھی کہ انگریزی زبان ہر صورت میں برصغیر کے لوگوں کے لسانی ماحول سے غیر متعلق

تھی۔ یہ کیفیت قومی زبان (اردو) اور علاقائی زبانوں کے بارے میں کسی طرح درست نہیں ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر علاقائی زبانوں کی نشوونما کا ایک نیا لسانی منظر رونما ہوا ہے۔ جسے ابتدائی جماعتوں میں "ذریعہ تعلیم" سے الگ کرکے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ لسانی منظر علاقائی زبانوں کی ادبیات کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے۔ جسے تعلیم و تدریس کے نظام میں ایک خاص مقام پر نصاب میں شامل کرکے واضح کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح علاقائی زبانیں اپنے مافیہ کو قومی ادب میں اور قومی شعور میں بخوبی شریک کر سکتی ہیں اور چونکہ علاقائی زبانوں کی ادبیات کے لیے ان زبانوں کی علمی تدریس ضروری بھی ہے۔ اس لیے علاقائی زبانیں کسی طور اپنے وجود سے محروم نہیں ہوسکتیں اور ادبیات کے حوالے سے ان کی نشوونما بھی اپنا عمل برابر جاری رکھ سکتی ہے۔ .... علاقائی زبانیں مدرسے سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ گھرانوں میں بولی جاتی ہیں اور گھرانوں ہی میں ان کا زندہ وجود ہوتا ہے۔ اس لیے جس نئے لسانی منظر کا ذکر کیا گیا ہے اس میں گھرانہ ایک معاشرتی ادارے کے طور پر شامل ہے اور علاقائی زبانوں کے تسلسل کی ضمانت دیتا ہے۔ علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر علاقائی زبان کی نشوونما ممکن نہیں ہوسکتی کیوں کہ ذریعہ تعلیم زبان کی نشوونما سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ جس نئے لسانی منظر کی طرف اشارا کیا گیا ہے اس میں گھرانہ، مدرسے اور قومیت کے باہمی رشتے کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ گھرانہ (علاقائی زبان) مدرسہ (قومی زبان) اور قومیت (تمدن، تاریخ، اور علوم) کے باہمی رشتے سے گھرانے کی فضا میں (قومی زبان کے حوالے سے) قومیت بتدریج شریک ہو کر گھرانے کی فضا میں متوقع ذہنی نتائج پیدا کر سکتی ہے اور گھرانہ ذہنی سطح پر بھی ترقی کی منازل طے کرسکتا ہے۔ گھرانے کو علاقائی زبان کا مسکن بنا کر گھرانے کی ترقی رک سکتی ہے اور گھرانہ معاشرتی اور قومی عمل کے اثرات سے محروم رہ سکتا ہے۔

مملکت پاکستان کے لسانی ماحول میں تحفظ کے رویوں نے علاقائی زبانوں کے بارے میں جو انتظامات کیے تھے وہ ان زبانوں کو علاقے ہی میں محدود کرتے تھے اور زبانوں کو صوبائی باشندوں کے ساتھ منسلک کرتے تھے۔ سندھی صرف سندھیوں کے لیے، پنجابی پنجابیوں کے لیے اور اسی طرح پشتو اہل سرحد کے لیے اور بلوچی اہل بلوچستان کے ساتھ منسوب ہوتی تھی۔ اس لسانی جغرافیے کے باہر ان زبانوں کا رشتہ کسی طرح قائم نہیں ہوتا تھا۔ ایسا طریق کار زبانوں کے ذریعے کثرتوں کو نمایاں کرتا تھا اور قومیت کی تشکیل کے مقاصد کو نظر انداز کرتا تھا

اسی طرح علاقائی زبانوں کے بورڈ اور اکیڈمیاں بھی مقامی طور پر کام کرتی تھیں اور اپنے طور پر اور اپنی جغرافیائی اساس کی بناء پر محدود کارگزاری ہی کو نمایاں کرتی تھیں۔ ان بورڈوں اور اکیڈمیوں کو کسی ایک کونسل میں شامل کرکے مربوط نہیں کیا گیا تھا جسے علاقائی زبانوں کی کونسل یا کسی ایسے ہی نام سے پکارا جا سکتا جو ان اداروں کو وحدت فکر فراہم کرسکتی، علاقائی زبانوں کے مابین لسانی رابطوں کو مستحکم کر سکتی، اپنی زبان کو چھوڑ کر دوسری علاقائی زبانوں کی اپنی زبان میں لغات تیار کرتیں اور اس طرح اپنے لسانی ماحول میں دیگر علاقائی زبانوں کی تدریس کے امکانات پیدا کرتیں۔ یوں پشتو، سندھی اور بلوچی کی تدریس کا انتظام صوبہ پنجاب میں ممکن ہوتا، پنجابی، پشتو اور بلوچی کی تدریس صوبہ سندھ میں ممکن ہوتی، صوبہ سرحد میں پنجابی، سندھی اور بلوچی پڑھائی جاتی اور بلوچستان میں پنجابی، پشتو اور سندھی کی تدریس کا انتظام ہوتا۔ قومیت کی تشکیل کے ضمن میں ایسا انتظام بے حد ضروری دکھائی دیتا ہے۔

قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں نظام تعلیم اور صوبائی رابطوں کے معاملات کی جانب اشارا کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ امر اپنی جگہ درست ہے کہ قومی زبان قومیت کی تشکیل میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن ایک ایسے معاشرے میں جہاں صوبوں کے مابین آمد و رفت کی کسی طرح حوصلہ افزائی موجود نہ ہو وہاں قومیت کی تشکیل اپنے مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ نظام تعلیم کا کسی قیمت پر صوبائی جغرافیے میں محدود ہونا درست نہیں ہے۔ ہر صوبے کے رہنے والوں کے لیے کسی بھی دوسرے صوبے میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ ان کے لیے ہر تعلیمی ادارے میں مخصوص نشستوں کا انتظام بھی از حد لازمی ہے۔ صوبوں کو الگ تھلگ کرنے کی کوئی بھی پالیسی قومی مقاصد کا اثبات نہیں کرتی۔ چونکہ مملکت پاکستان ایک وحدت ہے اور قومیت کے تصور کی نشاندہی کرتی ہے اس لیے ملازمت اور تعلیم کے مواقع کا صوبے ہی کے ساتھ وابستہ ہونا کسی طرح مناسب اور جائز دکھائی نہیں دیتا۔ جب تک ایسی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ قومیت کی تشکیل کی جانب ہر اقدام متوقع فوائد کو نمایاں نہیں کر سکتا۔ صوبوں کے درمیان آمدورفت، ملازمت اور تعلیم کے غیر مشروط مواقع اور تعلیمی اداروں کا علمی معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھنا ایسے امور ہیں جن کے بغیر قومیت کی تشکیل ممکن نہیں ہو سکتی اور نہ قومیت کی تشکیل کے اعلیٰ تر مقاصد ہی پورے ہو سکتے ہیں۔

اپنی تاریخ کے گزشتہ برسوں کے دوران مملکت پاکستان جن تجربات سے

گزرتی رہی ہے، گو ان کا سیاسی تجزیہ لسانی صورت حال کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتا تاہم ان حالات سے لسانی صورت حال متاثر ہوتی رہی ہے اور انسانی نفسیات کے مختلف رویوں نے قومی زبان کے مسئلے کو دشواریوں سے دوچار کیا ہے۔ وفاق اور صوبوں کے مابین حقوق اور اختیارات کی کوئی بھی صورت کیوں نہ ہو یہ امر اپنے طور پر باقاعدہ تسلیم شدہ ہے کہ مملکت پاکستان ایک وحدت ہے اور صوبے اس وحدت کے ناقابل تقسیم اجزاء ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی نے معروضی طور پر مملکت پاکستان میں اپنا وجود پایا ہے۔ اس لیے مملکت کو تحریک آزادی کے مقاصد سے کسی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس پس منظر میں مملکت کو تحریک آزادی کے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے ہی اس آزادی کا ادراک ممکن ہے جو مملکت کے ذریعے اس خطے کے باشندوں کو حاصل ہوئی ہے لیکن آزادی تاریخی شعور کے بغیر اپنا صحیح کردار ادا نہیں کرسکتی۔ یہ شعور اس تسلسل کے ذریعے قائم ہوتا ہے جو مملکت کے باشندوں کو ماضی کے ساتھ مربوط کرتے ہوئے عہد حاضر میں ان کے چناؤ اور فیصلوں کو نمایاں کرتا ہے اور ایسے چناؤ اور فیصلوں کے ساتھ انہیں آنے والے زمانے (مستقبل) کے ساتھ منسلک کرتا ہے۔ شعور کا ایسا تسلسل اس لیے بھی اہم ہے کہ گو مملکت کی صورت جغرافیائی اور مسائل کی صورت حقوق، اختیارات اور ذمہ داریوں سے پیدا ہوتی ہے، مملکت کا وجود تاریخ ہی میں اپنا وقوع پاتا ہے۔ اس لیے مملکت تاریخ میں بستی ہے، تاریخ ہی میں اپنا وجود پاتی ہے اور تاریخ ہی پر اپنے ارادوں، مقاصد اور کارکردگی کے نشانات ثبت کرتی ہے۔ قوموں اور ملکوں کا چھوٹا یا بڑا ہونا ایسے ہی ادراک اور فہم کی بناء پر ممکن ہوتا ہے۔

اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ میں وہی قومیں باوقار ہوئی ہیں جن کے افراد کی نظریں بڑے بڑے مسائل پر رہی ہیں اور جنہوں نے اپنے ہر مسئلے کو تاریخی شعور کے ساتھ حل کیا ہے۔ اس لیے بڑے اور چھوٹے مسائل کی تمیز کرنا قومی زندگی کے لیے ہمیشہ اہم رہا ہے۔ قومی زندگی کی قوت اور توانائی بھی، انفرادی زندگی کی قوت اور توانائی کے مانند ضائع ہوسکتی ہے اگر اسے ان مسائل کے ساتھ مربوط نہ کیا جائے جن سے قومی زندگی متحرک ہوتی ہے اور مملکت کا مقام بلندی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تاہم ایسا عمل جمہوری طریق حکومت اور تاریخی شعور کی حامل قیادت کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا۔ ان دو ضروری عناصر کے بغیر آزادی باثمر نہیں ہوتی اور قومیں باوقار نہیں ہوسکتیں۔ مملکت پاکستان کا وجود بھی انہی دو عناصر کا رہین منت تھا اور یہی دو عناصر اس کی باوقار حیثیت کی ضمانت دے سکتے ہیں۔---------

قومی زبان کا مسئلہ ایسے ہی بڑے سوالوں میں سے ایک اہم سوال ہے۔
مملکت پاکستان کی گزشتہ تاریخ کے دوران اس اہم سوال کو ایسے سوالوں کے ساتھ خلط ملط کیا گیا تھا اور خلط ملط کرنے کی روش کو اپنایا گیا تھا جو کسی طور پر مملکت کے وجود کے حوالے سے بنیادی سوال نہیں تھے۔ اس لیے قومی زندگی کی توانائی معمولی سوالوں، طریق کار اور لائحہ عمل کی بحثوں میں صرف ہوتی رہی اور قومی زندگی کے مستحکم اور کی توانائی بارآور ہونے کی صورت پیدا نہیں ہوسکی۔ اس ضمن میں اس سچائی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی قوم کسی غیر زبان کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ اپنی علاقائی زبانوں کو ناپید کرنے کا ارادہ کر سکتی ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ علاقائی زبانیں جس جغرافیائی ماحول میں پیدا ہوئی تھیں وہ ماحول عہد حاضر میں تیزی سے بدل رہا ہے اور علاقائی زبانوں کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا ہے۔ انگریزی زبان بھی لندن کی بولی سے پیدا ہوئی تھی اور اس وقت بھی انگلستان میں مقامی لہجے کی بولیاں موجود ہیں اور انگلستان میں بسنے والے سارے لوگ نسلی اعتبار سے اینگلو سیکسن بھی نہیں ہیں۔ انگلستان کی بڑائی اس کی قومی زبان ہی سے پیدا ہوئی ہے۔ اس امر کے پیش نظر قومی زبان کے مقام و منصب کو وضاحت کے ساتھ قبول کرنا ضروری ہے تاکہ مملکت کا شعور اپنے اظہار کے لیے الجھنوں کا شکار نہ رہے اور قومیت کی تشکیل کا عمل دشواریوں کی آماجگاہ بننے سے محفوظ رہے۔

جن صداقتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کو محض جذبات پرستی کے نام سے محمول کرنا قومی حقیقتوں کو نظرانداز کرنے کے برابر ہے۔ لسانی صورت حال کے جس پیچیدہ مرحلے سے مملکت پاکستان کی تاریخ عہد حاضر میں دو چار ہے وہ مملکت اور قومیت کی تشکیل کے مقاصد کی راہ میں دشواریاں پیدا کر رہا ہے اور تعلیمی اعتبار سے طبقاتی تفاوتوں کا سبب بن رہا ہے اور اس امر کے آشکار ہونے میں حائل ہے کہ مملکت پاکستان اور آزادی دونوں تاریخی اعتبار سے بامقصد صداقتیں ہیں۔ آزادی کا کوئی بھی سفر مقصد کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ ہر مملکت اپنے تاریخی وجود کے اندر مضمر مقصد کو ظاہر کرتی ہے۔ مملکت پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ سے اپنا مفہوم اخذ کرتی ہے اور عہد حاضر میں نشاۃ ثانیہ مملکت کا تاریخی استعارہ بن گئی ہے۔ اس لیے اس تاریخی استعارے کو معروضی صورت میں حاصل کرنےکے لیے جہاں دیگر مسائل کا فوری حل لازمی ہے وہیں قومی زبان کو قومیت کی تشکیل کے لیے بروئے کار لانا بھی ضروری ہے۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ لسانی اعتبار سے ایک نہایت غور طلب منظر کی

نشاندہی کرتی ہے کیوں کہ نشاۃ ثانیہ ہی سے جدید یورپ اور مغربی تہذیب اور عہد حاضر کی سائنس اور ٹیکنالوجی ظاہر ہوئے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ جس کے لیے عموماً پندرہویں اور سولہویں صدی کو نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے بنیادی طور پر فکری اور علمی تحریک تھی۔ لیکن اس علمی فکر کے لیے علوم، یورپ کی دریافت نہیں تھے۔ جن علوم سے یورپ کے ذہنی اور علمی سرچشمے جاری ہوئے تھے وہ علوم لاطینی، عبرانی اور عربی زبان کا سرمایہ تھے اور ان تک رسائی عموماً لاطینی زبان ہی سے ممکن ہوتی تھی۔ لیکن جس زمانے میں نشاۃ ثانیہ ظاہر ہوئی اسی زمانے میں مغربی یورپ کی قومی زبانیں بھی ظاہر ہوئی تھیں۔ علوم سے استفادے کے لیے یورپ کے پاس صرف لاطینی زبان کا ذریعہ تھا۔ یہی زبان یورپی درس گاہوں کی زبان تھی، ذریعۂ تعلیم تھی اور علمی مباحث کی زبان بھی تھی۔ یورپ کی مذہبی زبان بھی یہی تھی اور کاروبار سلطنت اور بین الاقوامی رابطے بھی اسی زبان میں قائم ہوتے تھے۔ علمی زبان کے طور پر اس کا بے حد احترام بھی تھا۔ اس زبان کے مقابلے میں مغربی یورپ کی قومی زبانوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن جو امر حیران کن ہے وہ یہ تھا کہ مغربی یورپ کے اہل علم، اہل دانش اور سربراہان مملکت نے لاطینی کے مقابلے میں قومی زبان کو ترجیحاً استعمال کیا اور اس زبان ہی میں نشاۃ ثانیہ کا علمی منظر ظاہر ہوا۔ سائنس نے بھی قومی زبانوں ہی کو اختیار کیا۔ علمی مباحث نے بھی انہی زبانوں کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ فلسفۂ ریاضیات، علم طب، فزکس اور کیمسٹری اور میکنکس کے بنیادی اصول، جغرافیہ اور سائنسی ایجادات اور دریافتوں ------- ان سب کے لیے قومی زبانوں ہی کو وسیلۂ اظہار بنایا گیا۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف قوموں نے ایسا کیوں کیا؟ لاطینی ایک علمی زبان کے طور پر ان کے پاس برابر موجود تھی اور لاطینی کی اصطلاحیں بھی برابر مستعمل تھیں جبکہ قومی زبانوں کے بارے میں بے حد شکوک موجود تھے۔ ان کی صلاحیت اظہار محدود تھی۔ ان زبانوں کو استعمال کرنے سے قومیں بین الاقوامی طور پر ایک بڑے تہذیبی پس منظر سے کٹ سکتی تھیں۔ فرانسس بیکن نے اپنی سائنسی غور وفکر کے لیے لاطینی زبان کا استعمال بھی کیا اور اس کے ساتھ قومی زبان میں اپنے خیالات اور شواہد کا اظہار بھی کیا۔ ایسے رویے کی کیا توجیہہ کی جا سکتی ہے؟ ایک وضاحت تو یہی ممکن ہے کہ قومی زبان قومی شعور کا حصہ تھی اور غالباً اسی لیے انگلستان میں اور مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں میں قومی زبان کو اظہار کا وسیلہ بنایا گیا تھا۔ تاہم اس ضمن میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قومی زبان نے لاطینی سے اخذ شدہ علوم کو انسانی ذہن کی دسترس میں لانےکی کوششوں میں آسانی پیدا کی تھی اور علوم

اور انسانی ذہن کے مابین حائل ہوتا ہوا لاطینی زبان کا پردہ اٹھا دینے سے ذہن علوم سے براہ راست فیض یاب ہوا تھا۔ ایسی توجیہہ اس صداقت کو نمایاں کرتی ہے کہ علوم اور ذہن کے براہ راست رشتے ہی سے کسی تمدن کی صلاحیتیں پھیلتی، پھلتی اور پھولتی ہیں۔ جب تک علوم کی صورت لاطینی تھی یورپ نشاۃ ثانیہ سے محروم تھا اور ان امکانات سے بھی تہی دامن تھاجو نشاۃ ثانیہ کے بعد ظاہر ہوئے تھے۔ ایسی صورت حال اس امر کی جانب بخوبی اشارا کرتی ہے کہ کسی غیر قومی زبان کے ذریعے ذہنی استعداد رونما نہیں ہوسکتی اور نہ انسانی صلاحیتیں ہی نمایاں ہو سکتی ہیں۔ انگریزی زبان کا غالباً وہی مقام ہمارے کلچر میں ہے جو کسی زمانے میں اہل یورپ کے لیے لاطینی زبان کا تھا۔ میکالے کا بھی یہی خیال تھا۔

زبانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ایک اور امر بھی آشکار ہوتا ہے۔ زاروں کے زمانے میں روس کے حکمران طبقے اور امراء عموماً فرانسیسی زبان کو اپنے مہذب ہونے کی بنیادی خصوصیت قرار دیتے تھے۔ فرانس ان کے نزدیک یورپی کلچر کا مرکز تھا اور وہ فرانسیسیوں کی طرح اپنی گفتگو میں فرانس کی زبان کا استعمال کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔ اعلیٰ گھرانوں کے بیٹے فرانس میں تربیت پاتے تھے اور فرانسیسی کلچر کے مطابق معاشرتی آداب کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کی ساری صلاحیت اہل فرانس کے لہجے کو مستعار لینے میں صرف ہوتی تھی۔ لیکن ایسے دور میں روس کا نہ تو کوئی علمی مقام تھا اور نہ علوم کی دنیا میں اس کی کوئی شے باعث تکریم تھی۔ ماسکو کا شہر درآمدی کلچر کا شہر دکھائی دیتا تھا۔ لیکن وہ روس جو انقلاب کے بعد رونما ہوا اور جس نے ایک نئی زندگی کو ظاہر کیا وہ صرف روسی زبان کا وسیع تر خطہ تھا جس نے اپنی قومی زبان کے ذریعے اپنی بڑائی اور بین الاقوامی تکریم کے اسباب پیدا کیے تھے۔ غالباً انگلش میڈیم سکول اسی طرز کی زندگی کی نشاندہی کرتے ہیں جو کسی زمانے میں روس میں ہوا کرتی تھی اور جب روس کا یورپی دنیا میں کوئی مقام بھی نہیں تھا۔

اسی ضمن میں جاپان کی مثال کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ٹیکنالوجی اور سائنس میں جاپان کی حیرت انگیز ترقی کسی طرح انگریزی یا کسی دیگر یورپی زبان کے تدریسی استعمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ جاپان نے اپنی قومی زبان کے ذریعے اہل مغرب کے علوم تک رسائی حاصل کی اور اپنی زبان ہی میں مغربی علوم کے اسرار کو محفوظ کیا ہے۔ ایسی ہی صورت چین میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس ملک پر ایک لمبے عرصے تک انگریزوں کی بالادستی رہی۔ گو چین نے انگریزی زبان کو قبول نہیں کیا تھا لیکن اس زبان کی معلومات کو اپنی قومی زبان کے

وسیلے سے اپنی صلاحیتوں کا جزو بنایا۔ چین کی ترقی واضح طور پر جدید علوم کو قومی زبان کی مدد سے حاصل کرنے کی جدوجہد اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جاپان اور چین دونوں ممالک میں انگریزی کا مقام غیر ملکی زبان (EFL) کا ہے۔

ایسی کیفیت کے پیش نظر قومیت کی تشکیل اور نشاۃ ثانیہ کے مابین نئے رشتے رونما ہوتے ہیں۔ قومیت کی تشکیل کی ایک اہم صورت قومی زبان کے مقام و منصب سے تعلق رکھتی ہے اور انگریزی زبان کو غیر ملکی زبان کے طور پر استعمال کرنے کی جانب اشارا کرتی ہے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی بے حد اہم ہے کہ انگریزی صرف جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے ضروری ہے تاکہ عہد حاضر میں قومیت کے مقاصد کو پورا کیا جا سکے۔ بین الاقوامی روابط کے لیے بھی اس زبان کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ سارے تقاضے انگریزی زبان غیر ملکی زبان (EFL) کی حیثیت میں بھی بخوبی پورا کرسکتی ہےاور اسے ثانوی زبان (ESL) کا درجہ دینا قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں مناسب اور جائز دکھائی نہیں دیتا۔ تاہم اس ضمن میں یہ بھی ممکن ہے کہ انگریزی کی موجودہ درسی اور نصابی حیثیت کو غیر ملکی زبان (EFL) کا مقام دیتے ہوئے اسی حیثیت کو برقرار رکھا جائے کیونکہ سرکاری زبان کے بدلنے سے انگریزی زبان ثانوی زبان (ESL) کا کردار ادا نہیں کرسکتی۔ قومیت کی تشکیل کا دوسرا پہلو قومی زبان اور علاقائی زبانوں کے باہمی رشتے اور علاقائی زبانوں کے باہمی رشتوں سے نمایاں ہوتا ہے۔ عہد حاضر میں معاشرہ ایک وسیع تر پھیلتے ہوئے عمل کی نشاندہی کرتا ہے اور محدود ماحول کی نفی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ علاقائی زبانیں عمرانی اعتبار سے اور اپنی لفظیات کے ذریعے ایک جامد انسانی معاشرے کی نشاندہی کرتی ہیں اور انسان کے وسیع تر ہوتے ہوئے ذہن کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ ان کے ذریعے معاشرے کی حصار بند صورت ہی برآمد ہوتی ہے گو تصوف کا عمل عروجی اور آزاد ہوتے ہوئے بھی دکھائی دیتا ہے۔ تاہم ان زبانوں کی شعریت انسان کو اپنے فوری ماحول میں تصوف کے ایسے عمل کو شریک نہیں کرتی۔ یوں علاقائی زبانوں کا قومی زبان کے ساتھ رشتہ اس لیے بھی لازمی ہے کہ قومی زبان تحریک آزادی کے مزاج کی نمائندگی کرتی ہے اور قومیت کی تشکیل کے انسانی مقاصد کو عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ ایسے تہذیبی تناظر میں علاقائی زبانوں کا آپس میں باہمی رشتہ بھی اہم ہےتاکہ زبانیں اپنے الگ تھلگ رہنے کے رویوں کو بدلنے میں کامیاب ہوسکیں اور جغرافیے کے فاصلے ذہن کے درمیان فاصلوں کو کم سے کم کر سکیں۔

لیکن یہ سارے امور قومیت کی تشکیل کے خارجی رشتوں کی جانب اشارا

کرتے ہیں اور معروضی لسانی مراسم کی نشاندہی کرتے ہیں۔ قومیت کی تشکیل کا قومی شعور کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے جہاں قومی شعور علوم کی رہنمائی میں وسعت اختیار کرتا ہے اور افراد میں صلاحیتوں اور استعداد کے بار آور ہونےکے امکانات کو نمایاں کرتا ہے۔ فکر اقبال میں ایسے دو مقامات کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں اقبال نے استحکام خودی اور کشود خودی کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔ قومیت کی تشکیل کے خارجی رشتے استحکام خودی کے مقام کی نشاندہی کرتے ہیں اور علمی رشتے جو صلاحیتوں، استعداد، ذہن اور عقل و خرد اور تخیل کی قوتوں کو توانائی دیتے ہیں، کشود خودی کے مقام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قومیت کی تشکیل میں نشاۃ ثانیہ کا تاریخی استعارہ کشود خودی کے مقامات کی طرف اشارا کرتا ہے تاکہ عہد حاضر میں اسلام کی عظمت کے لیے مملکت پاکستان کا قومی شعور فہم و خرد کی بلندیوں کو حاصل کر سکے۔ یہ مقصد قومی زبان ہی کے ذریعے پورا ہوسکتا ہے اور ایک ایسے بلند تر نقطۂ نظر کی موجودگی میں بروئے کار لایا جا سکتا ہے جہاں لسانی صورت حال کو نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے دیکھنے کی شدید آرزو ہو اور مستقبل کی خاطر اور قومی وجود کے وقار کے لیے فوری مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کی قوت موجود ہو ---- برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی ایک عظیم تر مستقبل کی تعمیر کے ساتھ وابستہ تھی اور اس مستقبل کی تعمیر عہد حاضر میں جن نسلوں کے سپرد ہے ان کی ذمہ داری بن چکی ہے۔ ------

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

کتابیات

ENGLISH

1.History of Muslim Separatism — Dr. Abdul Hamid

2.A History of India — Gulshan Rai

3.British Rule in India. — D. Mahajan

4.History of the Freedom Movement in India Vol.I — Tara Chand

——— do ——— Vol.II

——— do ——— Vol.III

——— do ——— Vol.IV

5.Modern Islam in India — C.V. Smith

6.Intellectual History of Islam in India — Aziz Ahmed

7.The Muslim League and Pakistan Movement — M.S. Toosy

8.The Muslim League: its History, Activities and Achievements — Lal Bahadar

9.Ideological Foundations of Pakistan — Dr.Waheed Qureshi

10.Encounter, London (Echoes of Empire) — February 1986

11.The Life of John Nicholson. — Lionel Trotter 1897

12.Nationalism — Hans Kohn

13.The Idea of Nationalism — Hans Kohn

اردو

۱۴۔ پنجاب میں اردو — حافظ محمود شیرانی

۱۵۔ موج کوثر — محمد اکرام

۱۶۔ کاروان شوق — آفتاب قرشی

۱۷۔ خطبات سرسید (جلد اول) — محمد اسماعیل پانی پتی